

فزیادی

شیم زوید

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.

پاکستانی پوائنٹ

www.PakistaniPoint.Com

پھر جب کمرے میں رہنا میرے لئے ناممکن ہو گیا تو مجھے مجبوراً ہاتھ روم کا رخ کرنا پڑا۔ ہاتھ روم میں بہت بلندی پر ایک روشن دان تھا مگر وہ بند تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کا دروازہ کھولا کمرے کا دھواں اس میں بھی بھر گیا۔ مجھے کچھ اور نہ سوچھا تو میں نے ناقابل برداشت تپش سے بچنے کی خاطر شادور کھول دیا اور کپڑوں سمیت اس کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ روم کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ دروازہ بند کرنے کی صورت میں اندر موجود دھوئیں سے سانس لینا دو بھر ہو جاتا۔

بڑھتے بڑھتے آگ ہاتھ روم کے دروازے تک پہنچ گئی اور پھر دروازہ بھی جلنے لگا۔ ہاتھ روم میں اب اتنا دھواں بھر چکا تھا کہ مجھے اپنا دم گھٹا محسوس ہو رہا تھا اسی وقت مجھے کہیں دور سے جیسے کسی نے پکارا۔ ”عذرا خان! عذرا خان!“

مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ جواب دے سکتی گھٹن کے سبب مرا سانس رکا جا رہا تھا اور سر چکرانے لگا تھا۔

کسی کے پکارنے کی آواز گویا میرے لئے ”ڈوبتے کو تنکے کا سہارا“ کے مانند تھی۔ حواس کھونے سے پہلے مجھے یہ اطمینان تو تھا شاید اب مجھے بچا لیا جائے گا مگر یہ ملال بھی تھا کہ میری جدوجہد لا حاصل رہی تھی۔ میں فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

ہوش آنے پر میں نے جولین کو اپنے قریب دیکھا۔ اس کے چہرے پر مجھے فکر مندی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے مجھ پر سوالات کی گویا یلغار کر دی۔ میں نے اسے صرف ایک ہی جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کمرے میں کیسے آگ لگ گئی!

جولین کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے میرا جواب مطمئن نہیں کر سکتا۔ موشر ووف ابھی تک نہیں لوٹا تھا ورنہ وہ بھی اس وقت میرے پاس ہوتا۔ یہ صورت حال میرے حق میں تھی۔ میں ابھی سوچ رہی تھی کہ مجھے اس موقع سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہئے کہ جولین بول اٹھی۔ ”آپ کے کپڑے بھیکے ہوئے ہیں۔ ہاتھ روم میں جا کر کپڑے بدل لیں۔ میں نے اپنی ایک پینٹ اور جیکٹ وہاں کھوئی پر ٹانگ دی ہے۔“

”شکریہ جولین!“ میں یہ کہہ کر اس کے بستر سے اٹھ گئی۔

میں اس وقت موشر ووف اور جولین ہی کے کمرے میں تھی۔ میں ابھی جولین سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی تھی کہ اس نے کس طرح مجھے میرے کمرے سے نکالا تھا اور آگ پر کیسے قابو پایا گیا تھا!

ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اب اس لڑکی پر ذرا بھی ترس نہیں کھاؤں گی اور اس موقع سے پورا فائدہ اٹھا کر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گی اگر موثر و فوٹ لٹ آیا تو شاید پھر مجھے یہ موقع نہ مل سکے۔ ہاتھ روم کھس کر میں سب سے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ پھر جب میں لباس تبدیل کر رہی تھی تو اچانک میری نگاہ ہاتھ روم کی کھڑکی پر پڑی۔ میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔

کھڑکی کھلتے ہی تازہ ہوائے کے جھونکے نے مجھے خوش آمدید کہا۔ وہ کھڑکی مجھے اپنی خوش نصیبی کا دروازہ نظر آئی کیونکہ اس کے راستے میں بہ آسانی لان میں کود سکتی تھی۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر مجھے کوٹھی کا پھاٹک نظر آ رہا تھا جس کے برابر غالباً چوکیدار کا چھوٹا سا کمرانا ہوا تھا۔ کوٹھی کی چار دیواری خاصی بلند تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ درخت لگے ہوئے تھے۔ کسی بھی درخت پر چڑھ کر چار دیواری کے اوپر پہنچنا محال نہیں تھا۔ اس کے بعد دوسری جانب کو جانا بھی یقیناً مشکل نہ ہوتا۔

فرار کی راہ سامنے تھی۔ اس سلسلے میں اب جولین سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ممکن ہے اس وقت میں بجلت میں کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھتی جو میرے لئے آئندہ مشکلات پیدا کر دیتا مگر مجھے فوراً ہی صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ یوں خالی ہاتھ بے سہارا یا بالی کی حالت میں یہاں سے فرار ہو جانا میرے لئے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ نہ میرے پاس رقم تھی نہ ضروری کاغذات نہ پاسپورٹ نہ کچھ اور! اسی صورت حال میں اس کوٹھی سے نکل جانے کے باوجود میں قلمی مجبور رہا۔ اُس ہوتی۔ ان حالات میں قومی امکان یہی تھا کہ میں دوبارہ گویا شکار کر لی جاتی، میرے لئے قاہرہ سے اٹھنا دوبارہ ہو جاتا۔ پھر کیا کیا جائے؟ اس سوال نے میری رہنمائی کی۔ میرے ذہن میں یہاں وہ والے اسی سوال کے نتیجے میں ایک امکانی راہ نظر آنے لگی۔ اس امکانی راہ کے سبب میں نے آہستگی سے لڑائی بند کر دیا۔ اور پھر ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی۔

میں نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا جولین میری طرف پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ”آپ اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں عذرا خان!“

”شکر ہے جولین!“ میں یہ کہتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ میرے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا مسکراہٹ آ گئی تھی۔ میں مزید بولی۔ ”تمہارے اور میرے جسم میں زیادہ فرق نہیں۔“ میں اب اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔

جولین کو گمان بھی نہ ہوا کہ دوسرے ہی لمحے اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے! اس کی لپٹی پر جب میرے ہاتھ کی بھرپور ضرب پڑی تھی تو وہ مجھے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر اس کا جسم لہرا کر فرش پر گرنے لگا تھا۔ میں نے اس کے گرتے ہوئے جسم کو سنبھال لیا تھا۔ میرے ہاتھ کی پٹی تلی ایک ہی ضرب میں وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔

میں نے اسے فرش پر لٹا دیا اور پھر تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ میں نے جو کچھ سوجھا تھا اس پر جلد از جلد عمل کرنا چاہتی تھی کیونکہ موثر و فوٹ کسی بھی لمحے واپس آ سکتا تھا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے کمرے میں موجودہ الماری نظر آ گئی جس کا ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گئی اور

پھر اس کی تلاشی لینے لگی۔ اوپری خانے میں ایک لیڈر پرس نظر آیا جو یقیناً جولین ہی کا ہو سکتا تھا۔ الماری میں موجود کپڑوں اور دیگر سامان سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ الماری جولین ہی کے استعمال میں تھی۔ میں نے پرس اٹھالیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ پرس میں میک اپ کے سامان کے علاوہ ایک چھوٹا سا خوبصورت ریوالتور بھی تھا۔ چابیوں کا ایک گچھا اور کچھ رقم بھی مجھے پرس میں ملی۔ رقم چھ سات سو گنی سے زیادہ نہ تھی۔ یہ رقم میرے نزدیک بہت تھوڑی تھی۔ اگر پرس میں زیادہ رقم ہوتی تو یقیناً میں الماری کے سیف کو کھولنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ پرس سے چابیوں کا گچھا نکال کر میں نے سیف کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک چابی لگ گئی اور میں نے سیف کھول لیا۔ سیف کے ایک خانے میں مجھے پچاس اور پچیس گنی کے نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں۔ مصری کرنسی کے علاوہ دیگر کرنسی اور ممالک کی کرنسی بھی تھی میں نے صرف مصری کرنسی کو ہاتھ لگایا۔ میں نے پچاس گنی کے نوٹوں کی ایک گڈی کھینچ لی۔ پانچ ہزار گنی کی یہ رقم قاہرہ سے فرار کے لئے کافی تھی۔ میں غالباً پہلے بھی یہ لکھ چکی ہوں کہ ایک گنی اس وقت چودہ پاکستانی روپوں کے مساوی ہوتی تھی۔ یوں گویا پانچ ہزار گنی کی رقم ستر ہزار پاکستانی روپوں کے برابر تھی۔

پچاس گنی کے نوٹوں کی وہ گڈی میں نے پرس میں رکھ لی اور پھر سیف بند کر کے چابیوں کا گچھا وہیں اوپری خانے میں رکھ دیا۔ پرس میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ رقم کے علاوہ اس سیف میں کچھ کاغذات بھی تھے مگر یہ وقت ان کے مطالعے کا نہیں تھا۔ ممکن ہے وہ کاغذات اہم ہوں لیکن ان کے چکر میں پڑ کر میں مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ رقم مل جانے کے بعد اب میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

پرس ہاتھ میں تھا۔ الماری بند کر کے میں پٹلی اور جولین پر نگاہ ڈالی۔ وہ ابھی تک فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزرتی ہوئی ہاتھ روم کی طرف بڑھی۔ بظاہر اس کوٹھی سے فرار ہونا بہت آسان نظر آتا تھا مگر اس کے باوجود جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ ہاتھ روم میں داخل ہو کر احتیاطاً میں دروازہ اندر سے بند کر لیا اور آگے بڑھ کر وہ کھڑکی کھول دی جو گویا راہ فرار تھی۔ میں پہلے ایک نظر باہر کا دوبارہ جائزہ لینا چاہتی تھی۔

میں ابھی کھڑکی کھولے باہر کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ دور سے کار کے بارن کی آواز سن کر چونک اٹھی۔ پھر میں نے پھاٹک کے قریب بنے ہوئے کمرے سے ایک مسلح شخص کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس شخص نے پہلے پھاٹک کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر بھاگا پھر پھاٹک کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک سیاہ کار اندر داخل ہو گئی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بھیڑ دی مگر تھوڑی سی جبری رہنے دی تاکہ آنے والے کو دیکھ سکوں۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر میں فکر مند ہو گئی وہ موثر و فوٹ تھا۔ عین فرار کے وقت اس کی آمد نے مجھے شدید تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

کار اندر آ گئی تو چوکیدار نے پھاٹک بند کر دیا۔ احاطے میں کار کو ایک جانب کھڑا کر کے موثر و فوٹ نیچے اتر آیا۔ میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ اب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دوبارہ کھڑکی کھول

دی۔ اب ہر لمحہ بہت قیمتی تھا۔ میں اسی لئے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ہاتھ روم کی کھڑکی پر چڑھ کر لان میں کود گئی۔

لان میں کود کر میں نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ وہاں بہ ظاہر کوئی نہیں تھا۔ چند لمبے رک کر میں تیزی کے ساتھ کوشی کی چار دیواری کی طرف بڑھی۔

میں نے ابھی بمشکل لان کا نصف حصہ عبور کیا تھا کہ اچانک عقب سے ایک تیز اور بھاری آواز سنائی دی۔ ”رک جاؤ عذرا خان!“

بے اختیار میرے قدم رک گئے اور میں نے مڑ کر کوشی کی طرف دیکھا۔ کوشی کی پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں مجھے ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ریوالور تھا اور ریوالور کی نال کا رخ میری ہی طرف تھا۔ گویا میرا اضطراب قلب بے سبب نہیں تھا۔ میں نے جس راہ فرار کو سہل جانا تھا وہ سہل نہیں تھی۔ موشوروف نے کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ کوئی بھی اس کوشی میں اس کے آدمیوں کی نظر میں آئے بغیر نہ داخل ہو سکتا تھا نہ باہر جا سکتا تھا۔

صرف چند لمحے انتہائی تذبذب میں گزرے اور پھر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے سوچا یہ محض دھمکی ہے یہ شخص مجھے ہرگز گولی نہیں مار سکتا! اس کا مقصد منہض مجھے روکنا ہے! امریکہ کی طرح روسی ابھی میری طرف سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک میں اتنی بے قیمت نہیں تھی کہ مجھے قتل کر دیں۔ اس خیال نے جیسے میرے جسم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میں نے مزید کچھ سوچے بغیر دوسرے ہی لمحے چار دیواری کی طرف جست بھرنا شروع کر دی۔

شاید اس شخص کو توقع نہ ہوگی کہ میں یوں موت سے کھیلنے پر آمادہ ہو جاؤں گی اس لئے فوری طور پر اس کی طرف سے کوئی رد عمل نہ ہو سکا۔ میں نے لمحوں میں لان کا بقیہ نصف حصہ عبور کر لیا تھا اور چار دیواری کے قریب ایک پیڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اسی وقت مجھے دوبارہ اس شخص کی تیز آواز سنائی دی تھی۔ وہ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”لوٹ آؤ عذرا خان ورنہ میں گولی چلا دوں گا!“

مجھ پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اگر اسے گولی چلانا ہوتی تو اب تک ایسا کر چکا ہوتا۔ اس کی بات پر دھیان دینے بغیر میں تیزی کے ساتھ پیڑ پر چڑھنے لگی۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ شخص مجھے خوف زدہ کر کے روکنے کی خاطر ہوائی فائر بھی کر سکتا ہے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ اب مجھے نہیں روکا جا سکتا یا پھر دن کے وقت مصیلتاں اسے فائرنگ سے گریز کیا تھا۔ فائر کی آواز آس پاس رہنے والوں کو اس طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ بہر حال فائر نہ کرنے کی وجہ کچھ بھی ہو میں نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور پیڑ پر چڑھنے کے بعد چار دیواری تک پہنچنے میں دیر نہیں کی۔

مجھے بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا اس لئے میں لاعلم تھی کہ قاہرہ کا یہ کون سا علاقہ ہے! البتہ چار دیواری پر چڑھ کر دوسری جانب دیکھتے ہوئے میں نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ علاقہ قدرے پرسکون اور قاہرہ کی ہنگامہ خیز زندگی سے ذرا الگ تھا۔ چار دیواری سے نیچے لگی میں کودتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ اریب قریب کوئی نہیں ہے۔

وہ علاقہ قدیم طرز پر بنی ہوئی بڑی بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ میں جلد از جلد وہاں سے دور

نکل جانا چاہتی تھی۔ گلیوں گلیوں تقریباً دوڑتی ہوئی میں کافی دور ایک سڑک پر نکل آئی۔ اب وہ کوشی خاصی پیچھے رہ گئی تھی جہاں سے میں فرار ہوئی تھی۔ موشوروف اور اس کے آدمیوں نے یقیناً مجھے تلاش کیا ہو گا مگر میں ان کے ہاتھ نہیں آ سکتی تھی۔ اس کا سبب وہ پیچ در پیچ متعدد گلیاں تھیں جو ارد گرد پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ بھلا مجھے کہاں کہاں اور کسی کس گلی میں تلاش کرتے پھرتے!

گلیوں میں اتنی دیر بھٹکنے اور پھر ایک بار واپس سڑک تک پہنچنے کے بعد میں جان چکی تھی کہ بہرہ کے کون سے حصے میں ہوں! جیسا کہ غالباً میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ قاہرہ تین بڑے حصوں میں تقسیم ہے: جدیدی قاہرہ، پرانا قاہرہ اور حیزا! یہ حیزا تھا اور میں اس کی ایک قدیم آبادی زمالک میں تھی۔ یہاں میں پہلے بھی آ چکی تھی۔ یہ قاہرہ کے قدیم امرا کا علاقہ تھا۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہی ہوں اس وقت ایسا ہی تھا۔ ہاں اب اس علاقے میں دوسرے طبقوں کے افراد بھی آباد ہو چکے ہیں اس لئے اس کا شمار اعلیٰ درجے کی آبادیوں میں نہیں ہوتا۔ پہلے یہیں بڑے بڑے ممالک کے سفارت خانے بھی تھے جو اب نہیں ہیں۔ اسی علاقے پر کیا مختصر آبادیاں بنتی بگڑتی ہی رہتی ہیں! تعمیر ہی تو زندگی کی دلیل ہے اور زندگی کی ہی دلیل مجھے دیس دیس، ٹرگر ٹرگر بھٹکانے پھر رہی تھی۔ مجھے پاکستان سے مصر آئے کافی دن ہو گئے تھا مگر اب تک یہاں سے واپس جانے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ امریکیوں کے چنگل سے نکل کر میں، وہی ایجنٹوں کی قید میں چلی گئی تھی لیکن وہاں سے آزادی نصیب ہونے کے باوجود ابھی حالات پوری طرح میرے قابو میں نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ مجھے با آسانی قاہرہ سے نہ نکلنے دیتے۔ میں اس وقت اپنے ذہن میں یہی لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی کہ فوری طور پر کس طرح ان سے محفوظ رہ سکتی ہوں! جب تک مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی میں فیصلہ کر چکی تھی کہ میرا پہلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

زمالک سے میں نے جدیدی قاہرہ کے علاقے تحریر اسکوار کا قصد کیا۔ وہاں سے تحریر اسکوار تک چار گنی کرایہ زیادہ تھا مگر میں نے ٹیکسی والے سے بحث نہ کی اور نہ کسی دوسری ٹیکسی کا انتظار کرنا مناسب خیال کیا۔ ظاہر ہے کہ ٹیکسی والا مجھے اس شہر میں اجنبی ہی سمجھ رہا تھا۔ مجھے تو جلد از جلد اس علاقے سے نکلنے کی فکر تھی! اگر وہ اس سے زیادہ کرایہ بھی اس وقت طلب کرتا تو میں انکار نہ کرتی۔ ٹیکسی وہاں سے روانہ ہوئی تو مجھے قدرے سکون محسوس ہوا۔

تحریر اسکوار پہنچنے تک میرا ذہن آئندہ اقدامات کے متعلق غور و خوض کرنے میں منہمک رہا۔ ایک بڑے سے جنرل اسٹور کے سامنے میں نے ٹیکسی روکادی تھی اور کرایہ ادا کر کے اتر گئی تھی۔

اس جنرل اسٹور سے میں نے صرف میک اپ کا ضروری سامان خریدا اور پھر وہاں سے نکل کر ایک قریبی ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہو گئی۔ سب سے پہلے میں نے ایک چھوٹا سا خوبصورت سوٹ کیس خریدا! اسی کے ساتھ ایک لیڈ پرز بھی! پھر میں دوسری ضروری اشیاء کی خریداری میں مصروف ہو گئی جن میں ریڈی میڈ لباس سرفہرست تھا۔ اس وقت مغربی لباس میری مجبوری بھی اور ضرورت بھی! میں جو لین کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھی جسے تبدیل کرنا بے حد ضروری تھا۔ مجھے تلاش کرنے والوں کے لئے یہ لباس واضح شناخت ثابت ہو سکتا تھا۔ سامان کی خریداری میں بھی میں نے بہت غفلت سے کام لیا تھا۔ میرا اس طرح آزادانہ گھومنا پھرنا کسی بھی لمحے مجھے شدید خطرے سے دوچار کر سکتا تھا۔ میں ڈاکٹر رپ، ابھی

نہیں بھولی تھی جو گویا اپنے زخموں کو چاٹتا رہ گیا تھا۔ موشرورف نے بھی بتایا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ کے گر گئے بھی میری تلاش میں پاگل کتوں کی طرح سارے شہر کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ اب ان لوگوں کے نزدیک میری تلاش کا مقصد کچھ اور ہی تھا جس کا تصور بھی میرے لئے سوہان روح تھا۔ وہ مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دینے کے بعد اپنے ایک سازشی منصوبے کی تکمیل چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ موشرورف بھی خاموش بیٹھے والوں میں نہیں تھا۔ یوں گویا میں اس وقت دہرے خطرے سے دوچار تھی۔ اسی دہرے خطرے سے بچنے کی خاطر میں اس وقت ضروری اقدامات کر رہی تھی۔ ان ضروری اقدامات کا پہلا مرحلہ یعنی سامان کی خریداری بہ حسن دخوبی طے ہو چکا تھا اور اب میں تیزی کے ساتھ اس ڈپارٹمنٹل اسٹور سے باہر نکل رہی تھی۔ سامان کی قیمت میں نے کاؤنٹر پر ادا کر دی تھی۔

ابھی میں نے سٹور سے باہر قدم رکھا تھا کہ اچانک میرے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور میں چونک اٹھی۔ میرے قدم رک گئے۔ میرے ذہن میں ایک مانوس سی سنسنیٹ ہونے لگی تھی۔ چند لمحوں بعد میرے ذہن میں ایک آشنا آواز گونجی۔ تم کہاں ہو عذرا خان؟ میں اس آواز کو پہچان گئی۔ یہ موشرورف کی آواز تھی۔ مجھے علم تھا کہ موشرورف ایک ٹیلی پیٹھ ہے۔ وہ میرے ذہن سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں فوری طور پر میرے ذہن میں ”تحریر اسکوائر“ کا نام آیا۔ اچھا تم اس وقت تحریر اسکوائر پر ہو موشرورف کی آواز پھر سنائی دی۔ تمہارا ارادہ یقیناً کسی ہوٹل میں قیام کا ہوگا؟

نہیں! میرے ذہن نے جواب دیا۔ یہاں سے میں واپس جیڑا جاؤں گی اپنی بہن ذکیہ کے گھر جودتی کے علاقے میں ہے۔

تمہیں اپنی بہن کے گھر کا پتا تو معلوم ہو گا نا! ذرا بتاؤ!

میرے ذہن میں ذکیہ کی کوٹھی کا پتا گھوم گیا۔

شکر یہ عذرا خان! ان الفاظ کے ساتھ ہی موشرورف کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میرے ذہن میں پھر ہلکی سنسنیٹ ہوئی اور پھر ذہنی کیفیت معمول پر آ گئی۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور پھر میرے ہونٹوں پر خود بہ خود مسکراہٹ آ گئی۔ میں نے موشرورف کی چال خود اسی پر الٹ دی تھی۔ غیر معمولی حالات میں اگر ہوش و حواس قابو میں رکھے جائیں تو اپنے ذہن سے ذہین حریف کو شکست دینا مشکل نہیں ہوتا۔ موشرورف نے اپنے ذہن کی ایک حیرت انگیز قوت سے کام لے کر اپنی دانست میں گویا میرا سراغ لگالیا تھا اور یہ میرے ذہن کا کمال تھا کہ میں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ فوری طور پر اس کے سوالوں کا جواب دے کر میں نے اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ میرے ذہن کو مزید کریدنے کی کوشش کرتا۔ موشرورف کا یہ اندازہ درست ہی تھا کہ میں کسی ہوٹل میں قیام کروں گی مگر میرا ارادہ تحریک اسکوائر کے کسی بڑے ہوٹل میں قیام کا نہیں تھا۔ میں کسی اوسط درجے یا کسی تیسرے درجے کے غیر معروف ہوٹل میں وقتی طور پر قیام کرنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر اس سے پہلے ایک اور اہم مرحلہ درپیش تھا! اپنی شخصیت کی تبدیلی کا مرحلہ!

قلو پٹھرہ ہوٹل کا شمار اوسط درجے کے ہوٹلوں ہی میں تھا۔ وہ بارہ منزل ہوٹل بلٹن ہوٹل کے مقابل تھا۔ میں اس وقت جہاں کھڑی تھی وہاں سے قلو پٹھرہ ہوٹل کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لئے پیدل ہی تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ میں اسی ہوٹل میں اپنی شخصیت کی تبدیلی کے مرحلے سے گزرنا چاہتی تھی۔ پھر ظاہر ہے کہ مجھے فوری طور پر وہ ہوٹل چھوڑ دینا پڑتا۔

اس طرح کے مراحل میرے لئے نئے نہیں تھے۔ میں پہلے بھی ایسے مرحلوں سے گزر چکی تھی۔ قلو پٹھرہ ہوٹل کی طرف بڑھتے ہوئے میں اپنے ارد گرد سے پوری طرح چونکا اور ہوشیار تھی۔ میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے۔ اسی سبب سوٹ کیس اٹھائے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے اس کار کو اپنے قریب رکھتے ہوئے فوراً دیکھ لیا جس کا عقبی دروازہ کھول کر تیزی کے ساتھ دو مقامی افراد باہر نکلے تھے۔

خطرہ! خطرہ! میرے ذہن میں تیزی سے یہ الفاظ گونجنے اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے سوٹ کیس فٹ پاتھ پر رکھ دیا اور پرس بھی ہاتھ سے جھٹک کر نیچے گرا دیا۔

ان دونوں میں سے ایک کسی عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا اور میری کلائی پر ہاتھ ڈال کر مجھے کار کی طرف گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسرے نے میری کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ گویا وہ دونوں مجھے ایک بھرے پرے بازار سے دن دہاڑے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے مگر انہیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ ان کے مقابل کوئی عام لڑکی نہیں عذرا خان ہے! مجھے یہ سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی تھی کہ وہ ڈاکٹر رچرڈ ہی کے گر گئے ہو سکتے تھے ورنہ کسی اور کو کیا پڑی تھی جو مجھ پر ہاتھ ڈالتا۔

پھر چند ہی لمحوں بعد اس بھرے بازار میں ارد گرد جمع ہو جانے والوں نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔ بظاہر ایک بے بس اور کمزوری عورت نے ان ”بہادر مردوں“ کو چیخنے چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس شخص نے میری کلائی پر ہاتھ ڈالا تھا اپنے پیٹ پر میرے گھسنے کی ضرب کھا کر دور جا کر تھا۔ وہ جو میری کمر تھانے کی کوشش میں مصروف تھا اس کی پسیلوں پر میرے بائیں ہاتھ کی کہنی اتنی زور سے پڑی تھی کہ چیخ کر دور ہٹ گیا تھا۔ کار میں ان دونوں کے علاوہ دو افراد اور تھے جن میں سے ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر! ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص تو مصلحتاً کار سے نہیں اترا مگر دوسرا شخص کار کا اگلا دروازہ کھول کر تیزی سے میری طرف لپکا۔ اسی دوران میں اس کا ایک ہاتھ میں نے کوٹ کی جیب میں رینگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خود قریب پہنچتا میں اپنی جگہ سے اچھلی اور پھر میری فلائنگ کلک نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی جیب سے غالباً ریوالور نکالنا چاہتا تھا مگر اس کی یہ حسرت دل کی دلی میں رہ گئی تھی۔ تیسرے ساٹھی کی مداخلت نے ان دو کی ہمت بڑھا دی تھی جو پہلے میرے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ اسی دوران میں وہ دونوں میرے قریب آ گئے مگر ان کے چہروں سے واضح طور پر خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ اب مجھ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کچھ جھجک رہے تھے۔

”قریب آؤ نا اور قریب! میں نے انہیں گویا غیرت دلائی۔ ”مرد بنو!“ یہ کہتے ہی میں نے پیٹریا بدلا اور پھر ان دونوں پر نوٹ پڑی۔

میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پیر تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور ان دونوں کے منہ سے

وقت کے اندر اندر کسی مخصوص محلے کی عورت کا کسی ہوٹل میں قیام با آسانی اس کی نشان دہی کر سکتا تھا کہ مطلوبہ عورت نے کہاں پناہ لی ہے!

میں پولیس کی دسترس میں آنے سے بال بال بچ گئی تھی ورنہ میرے لئے بہت سی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ قاہرہ کی انٹیلی جنس بھی میری تلاش میں ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر رچرڈ نے کیا چکر چلایا تھا کہ انٹیلی جنس والے میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ قاہرہ ایئر پورٹ سے مجھے انٹیلی جنس والوں ہی نے گرفتار کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ گرفتاری بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ پوچھ گچھ کے لئے مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر لایا جا رہا تھا کہ راستے میں ڈاکٹر رچرڈ نے گویا اپنا ”شکار“ انٹیلی جنس والوں سے چھین لیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈھس کے معاملے میں بھی اسکندریہ سے میرا فرار غیر قانونی ہی تھا۔ پولیس نے مجھے اور ذکیہ کو ہدایت دی تھی کہ ہم اس وقت تک پولیس کو مطلع کئے بغیر اسکندریہ سے کہیں نہ جائیں جب تک کیسی عدالت میں پیش نہ کر دیا جائے۔ اسکندریہ کی پولیس بھی اس سلسلے میں قاہرہ پولیس سے رابطہ قائم کر سکتی تھی۔ یہ بعید نہیں تھا کہ اسکندریہ کی پولیس نے قاہرہ پولیس کو میرا اور ذکیہ کا حلیہ فراہم کر دیا ہو۔ ان حالات میں قاہرہ کی پولیس اور انٹیلی جنس سے میرا دور ہی دور رہنا انتہائی ضروری تھا۔ اس وقت پولیس والوں کو لفٹ سے باہر آتے دیکھ کر اسی لئے ایک دم میرے دل میں دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

پولیس والے ابھی میرے کمرے کے دروازے تک پہنچے تھے کہ اوپر آنے والی لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ لفٹ خاصی بھری ہوئی تھی مگر اس فلور پر کئی افراد اتر گئے۔ میں لیو نہ سب سے آگے کھڑی تھی اس لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر لفٹ میں سوار ہو گئی۔ میرے پیچھے دو افراد لفٹ میں مزید سوار ہوئے اور پھر لفٹ مین نے دروازہ بند کر دیا۔

گراؤنڈ فلور پر پہنچتے ہی میں نے ہوٹل کے بیرونی دروازے کا رخ کیا پھر ہوٹل سے نکلنے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اعصاب سے ایک بوجھ ہٹ گیا ہو میں اب اپنی شخصیت کی تبدیلی اور اس ہوٹل سے نکل آنے کے بعد نہ صرف قاہرہ کی پولیس اور انٹیلی جنس سے محفوظ ہو گئی تھی بلکہ اب مجھے ڈاکٹر رچرڈ کے گریگوں کا خوف بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں اب اس علاقے میں مزید وقت گزارنا نہیں چاہتی تھی۔

مخالف سمت بلٹن ہوٹل کے سامنے مجھے کئی خالی ٹیکسیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ سڑک عبور کر کے میں ایک خالی ٹیکسی تک پہنچ گئی۔

”رم سیس اسکوائر“ میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر راپا بتایا اور میں ٹیکسی کا چھپا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

رم سیس اسکوائر کا قصد میں نے بے سبب نہیں کیا تھا۔ قاہرہ سے فرار ہونے کے لئے میں نے ذہن میں جولانح عمل ترتیب دیا تھا اس کا دار و مدار ایک ایسے شخص پر تھا جو اسی علاقے میں رہتا تھا۔ قاہرہ سے پہلی بار فرار میں بھی وہی شخص میرے لئے اہم ثابت ہوا تھا۔ یہ اس وقت کا ذکر تھا جب پہلے تجربے کے بعد میں ڈاکٹر رچرڈ کی قید سے فرار ہوئی تھی۔

میں سفر کے دوران میں اسی شخص کے بارے میں سوچتی رہی جو جعلی کاغذات اور جعلی پاسپورٹ

فراہم کرتا تھا۔ وہ عیسائی تھا اور اس کا نام جیمس تھامس چوک کی ایک بلڈنگ میں تیسری منزل پر اس کا فلیٹ تھا۔ تمام تفصیلات اب تک میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔

رم سیس اسکوائر پہنچ کر قاہرہ ریلوے اسٹیشن سے کچھ آگے میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ وہاں ٹیکسی چھوڑ دینے کا سبب ایک فوٹو شاپ تھی میں نے وہاں اپنے موجود میک اپ میں پاسپورٹ سائز تصویر کھینچوائی اور پھر فوٹو گرافر سے پوچھا کہ جلد از جلد کب تک اس تصویر کی کاپیاں مل سکتی ہیں؟

”اگر بہت جلدی ہے تو آپ کل صبح دس بجے تک اس کے پرنٹ لے سکتی ہیں مگر اگر جٹ.....“

”میں سمجھتی ہوں تم رسید کاٹو!“ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

پھر وہ رسید کاٹنے لگا۔ میں نے رسید پر لکھی ہوئی رقم دیکھتے ہوئے پرس کھول کر دس گنی کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے رسید مجھے تھما کر بقیہ رقم میرے حوالے کر دی اور خوش اخلاقی سے بولا ”تھینک یو!“

رسید اپنے پرس میں رکھ کر میں اس کی دکان سے باہر آ گئی۔ نا وقت مجھے اپنے ذہن میں مخصوص قسم کس سنسناہٹ محسوس ہوئی اور میں چوکنا ہو گئی۔ موٹوروف کو میرے ذہن سے رابطہ قائم کئے خاصا وقت گزرم چکا تھا۔ اس دوران میں یقیناً وہ معلوم کر چکا تھا کہ میں نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ دوبارہ میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے والا ظاہر ہے کہ وہی ہو سکتا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ اس بار بھی میں اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتی اس لئے مجھے دوسری راہ اختیار کرنا پڑی میں نے اپنے ذہن سے ہر خیال کو جھٹک دیا۔ یہ ترکیب آزمودہ تھی اس طرح وہ میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کے باوجود بھی کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ذہنی رابطہ ہی قائم نہ ہوتا۔

عذرا خان!..... عذرا خان؟ میرے ذہن میں اس کی آواز گونجتی رہی وہ مجھے پکارتا رہا اور پھر اس کی آواز معدوم ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔

میں اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی معلوم کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ ابھی میں قاہرہ ہی میں ہوں اور میرے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ موٹوروف ایک بار ناکامی کے بعد خاموش ہو کر نہیں بیٹھے گا اور پھر یہی ہوا جب تک میں رم سیس چوک پہنچی اس نے دوسرے بار بھی کوشش کی مگر میں پہلے ہی سے چوکنا اور ہوشیار تھی اس لئے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ موٹوروف اور اس کے ساتھی مجھے سارے شہر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے وہ شخص بھلا چین سے کیسے بیٹھ جاتا جو میری تلاش میں پہلے پاکستان پہنچا تھا اور پھر میرے پیچھے پیچھے ہی مصرا گیا تھا! یقیناً وہ اپنی اس کھلی ٹھکست پر سخت جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو گا۔

موٹوروف ہی کے بارے میں سوچتی ہوئی میں رم سیس چوک کی اس بلڈنگ کے گیٹ میں داخل ہو گئی جس کی تیسری منزل پر جیمس کا فلیٹ تھا۔ لفٹ کے ذریعے میں تیسری منزل پر پہنچی اور پھر مطلوبہ فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ ذرا توقف کے بعد میں نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

کچھ دیر بعد جس شخص نے دروازہ کھولا وہ جیمس ہی تھا میں اسے پہچان گئی۔

اندازہ بھی ہو گا کہ جو لوگ جعلی پاسپورٹ حاصل کرتے ہیں ان کا تعلق بھی تمہاری ہی طرح کی کسی نہ کسی باعزت پیشے سے ہوتا ہے! تم چاہو تو میرے ان الفاظ کو دھمکی بھی تصور کر سکتے ہو!“

میرے آخری الفاظ سن کر وہ چونک اٹھا اور جھل جھل سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے سسر گرانٹ میں..... میں آپ کے لئے کسی بھی طرح ایک پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات کا بندوبست کر دوں گا حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اب واقعی میں.....“

”جھوٹ نہیں جیس!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم اس طرح نہ صرف میرا بلکہ اپنا وقت بھی ضائع کر رہے ہو!“

”جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ بندوبست ہو جائے گا پھر آپ کیوں مجھے شرمندہ کئے جا رہی ہیں۔“ اس نے گویا ہتھیار ڈال ہی دیئے۔ ”دراصل اب میں براہ راست یہ کام نہیں کرتا اس میں خطرہ ہی خطرہ ہے اسی لئے.....“

”تم رقم بتاؤ!“ میں بول اٹھی۔ ”نصف رقم میں تمہیں اسی وقت ادا کر دیں گی اور بقیہ نصف کل صبح ساڑھے دس بجے اس وقت جب میں تم سے پاسپورٹ اور کاغذات لینے آؤں گی۔“

”کیوں اسی وقت کیوں نہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”اس وقت جلدی میں میں اپنی پاسپورٹ سائز تصویریں لانا بھول گئی ہوں۔“

میری بات سن کر اس نے طویل سانس لیا پھر بولا ”تو آپ کو کبھی معلوم ہے سسر گرانٹ!“

”ہاں“ میں نے ہنس کر کہا ”اور میں تمہاری فنکاری کی معترف ہوں تمہیں ابھی شاید میں نے بتایا تو تھا کہ اب سے پانچ سال قبل بھی مجھے ایسی ہی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس وقت تم اور حسان ایک ساتھ تھے۔ تمہاری مزید تسلی کے لئے یہ بھی بتا دوں کہ اب تمہارا پارٹنرمیوں کا کاروبار کرتا ہے! اب تمہیں یقین آیا میری بات پر؟“

”سسر گرانٹ! آپ واقعی بہت باخبر اور ہوشیار عورت ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بھنے میں غلطی کی۔“ وہ بولا۔

”اچھا تو پھر اسی اعتراف کے طور پر تم اپنا محتنانہ کچھ کم کر کے بتا دو!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بس آپ خود ہی سمجھ لیں کہ پانچ سال پہلے کے اور اب کے ریٹ میں خاصا فرق آچکا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت ہم لوگ غالباً پانچ سو یا چھ سو گنی لیا کرتے.....“

”غلط!“ میں نے اسے ٹوک دیا ”میری اطلاع کے مطابق یہ تم اس وقت کا ریٹ بتا رہے ہو!“

جیس سے کچھ دیر بارگینگ کے بعد چھ سو گنی پر معاملہ طے ہو گیا۔ میں نے تین سو گنی اسے پیشگی دے دیئے تو وہ اٹھ کر اندرونی کمرے میں چلا گیا۔ پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات کا انتخاب وہ اسی وقت کر لینا چاہتا تھا۔ جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا بریف کیس تھا جو میں پہلے بھی اس کے پاس دیکھ چکی تھی۔

”کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ وہ روکھے سے لہجے میں بولا۔

”آپ ہی سے!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”مجھ سے.....؟ مگر میں..... میں تو آپ کو نہیں جانتا!“ وہ حیرت زدہ اور کچھ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔ ہم دونوں کے درمیان رابطے کی زبان ظاہر ہے انگریزی ہی تھی۔

”سسر جیس؟ شاید آپ بھول چکے ہیں کہ اس سے پہلے بھی ہماری ملاقات ہو چکی ہے۔“ میں نے یوں ہی اندھیرے میں تیر چلا دیا۔

”کب.....؟ کہاں۔“

”یہ اب سے تقریباً پانچ سال پہلے کی بات ہے جب آپ سسر حسان کے پارٹنر تھے۔“ یہ حوالہ میں نے جان بوجھ کر دیا تھا۔ پچھلی بار حسان ہی کے ذریعے میں اس تک پہنچی تھی۔ حسان ہی سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ایک زمانے میں وہ اور جیس پارٹنر تھے۔

”اچھا..... اچھا..... ہاں شاید..... شاید مل چکا ہوں میں آپ سے!“ وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔

حسان کا حوالہ کارگر ثابت ہوا اور جیس نے مجھے اندر بلانے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ میں کسی جھک کے بغیر اندر داخل ہو گئی اور وہ مجھے اپنے ساتھ نشست گاہ میں لے آیا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ جیس ایسے لوگ بہت محتاط ہوتے ہیں اور جلدی نہیں کھلتے جب تک درمیان میں کوئی معتبر حوالہ نہ ہو۔

”مجھے سسر گرانٹ کہتے ہیں۔“ میں ایک صوفے پر بیٹھنے ہوئے بولی۔ ”شاید آپ کے ذہن سے میرا نام بھی محو ہو.....“

”سوری!“ وہ بول اٹھا ”مجھے واقعی آپ..... یاد نہیں رہا تھا“ خیر بتائیں کہ آپ نے کیسے زحمت کی؟“

”مجھے پاسپورٹ چاہئے۔“ کسی بھی ملک کا انٹرنیشنل پاسپورٹ اور اس سے متعلق ضروری شناختی کاغذات!“ میں نے اپنا مدعا بیان کرنے میں دیر نہیں کی۔“

جواباً جیس آہستہ سے ہنسا پھر بولا۔ ”سوری سسر گرانٹ! اس سلسلے میں اب آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ اب تو ایک مدت ہو گئی میں نے یہ سب دھندے چھوڑ دیئے اور باعزت زندگی گزار رہا ہوں۔ دراصل حسان ہی نے مجھے اس غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ اس سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد ہی میں نے یہ ناجائز اور خطرناک پیشہ ترک کر دیا تھا اس بات کو کبھی برسوں بیت گئے۔“

میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا جس پر جھوٹ لکھا تھا یا تو اس نے ابھی حسان کے حوالے کے باوجود مجھ پر اعتماد نہیں کیا تھا یا پھر وہ ایسی باتیں کر کے اپنا بھاء بڑھانا چاہتا تھا۔ پہلی بار جب میں نے اس سے جعلی پاسپورٹ کا سودا کیا تھا اس واقعے کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔

”سسر جیس! یا تو تم مجھ سے بے سبب خوف کھا رہے ہو کہ کہیں میرا تعلق یہاں کی پولیس سے نہ ہو یا پھر کوئی اور بات ہے!“ یہ کہتے ہوئے میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”تم جھوٹ بول کر مجھے نہیں ٹال سکتے! میرے علم و اطلاع کے مطابق تم اب بھی وہی باعزت پیشہ اپنائے ہوئے ہو جس کی تردید کر رہے ہو!“ میں نے ”باعزت“ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر مزید بولی۔ ”تمہیں شاید یہ

بلڈنگ کی ساتویں اور آٹھویں منزل اس ہوٹل والوں کے تصرف میں تھی۔ ہوٹل کے کمرے کا کرایہ صرف پانچ گنی یومیہ تھا۔ رم سیس چوک سے ٹیکسی کے ذریعے میں سیدھی وہیں پہنچی اور مجھے ہوٹل کی آٹھویں منزل پر ایک کمرہ حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہ ہوئی۔

قاہرہ میں گرمی بس برائے نام پڑتی ہے۔ عموماً موسم معتدل رہتا ہے اسی لئے اوسط درجے یا تیسرے درجے کے ہوٹلوں میں بچھے نہیں ہوتے ان دنوں بھی موسم معتدل ہی تھا اسی لئے کمرے میں پنکھا نہ ہونے کے باوجود مجھے کسی کمی کا احساس نہ ہوا۔ ہاں یہاں سردی بہت شدید ہوتی ہے مگر یہ سردیوں کا موسم نہیں تھا۔ مجھے جو کمرہ ملا تھا وہ سڑک کے رخ پر تھا اور کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس سے تازہ ہوا کمرے میں آرہی تھی۔ کمرے میں ایک بیڈ کے علاوہ ایک کرسی اور چھوٹی سی میز بھی ایک جانب پڑی ہوئی تھی۔ میں نے وہ میز اور کرسی اٹھا کر کھڑکی کے قریب رکھ دی۔ اپنا سوٹ کیس اور ایئر بیگ بھی میں نے وہیں دیوار سے لگا کر رکھ دیا تھا۔ نیچے کاؤنٹر پر میں کھانے کا آرڈر بھی دے کر آئی تھی اور اب مجھے اسی کا انتظار تھا۔ میں صبح کا ناشتا کئے ہوئے تھی۔ دوپہر کا کھانا گول ہو گیا تھا۔ مجھے اسی لئے اس وقت خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں ویٹر کھانا لے آیا۔ پھر جب کھانا کھا کر میں نے چائے پی لی اور ویٹر خالی برتن لے گیا تو کمرے کا دروازہ بند کر کے میں کھڑکی میں آنکھڑی ہوئی۔ بظاہر میری نگاہیں سڑک سے گزرتے ہوئے ٹریفک پر تھیں مگر میرا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ مجھے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں مجھے چند دن کے لئے بھی سکون کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ کیا میں اس دنیا کی بھیڑ میں کچھ عرصے کے لئے کہیں گم نہیں ہو سکتی؟ صرف چند روز کے لئے۔ لایا یہ امکان نہیں کہ میں اپنے ہر دم کشیدہ اعصاب کو سکون پہنچا سکوں؟ میرے یہ احساسات و جذبات ذہنی ہی تھے۔ انسانی فطرت بہر حال تغیر چاہتی ہے۔ پہلی بار مجھے یہ خیال اس وقت آیا تھا جب میں جنیس سے گفتگو کر رہی تھی اور اس نے سارہ نکلسن کا پاسپورٹ میرے حوالے کیا تھا۔ اس پاسپورٹ پر عراق کا ویزا لگا دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے پاکستان جانے کی بجائے کیوں نہ کچھ دن عراق میں گزارے جائیں! اس خیال کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میرے دشمن قاہرہ میں میری تلاش میں ناکام ہو کر پاکستان ہی کا رخ کرتے۔ میری ہنگامہ پسند فطرت کے پیش نظر وہ ہرگز یہ نہ سوچتے کہ میں نے کچھ دن کسی اور ملک میں سکون سے گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔

عراق بھی میرے لئے نیا نہیں تھا۔ میں وہاں پہلے بھی ایک بار جا چکی تھی۔ خصوصاً عراق کے شہر بغداد سے تو مجھے ایک جذباتی لگاؤ سامحوس ہوتا تھا۔ قاہرہ کی طرح بغداد کا بھی ایک وسیع تاریخی پس منظر تھا۔ اس شہر نے بڑے عروج و زوال دیکھے تھے۔ اس کی تاریخی حیثیت ہی میرے جذباتی لگاؤ کا سبب تھی۔ وہاں میرے کئی شناسا بھی تھے۔ ان سے میں رابطہ قائم کرتی یا نہ کرتی یہ بعد کی بات تھی مگر یہ طے تھا کہ وہاں مجھے اس شہر کی طرح بے سکونی کا شکار نہ ہونا پڑتا۔

قاہرہ میں وہ میری آخری شب خلاف توقع کسی ہنگامے کے بغیر گزر گئی۔ موشرودف مجھ سے کئی بار ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد غالباً میری طرف سے مایوس ہو چکا تھا یا پھر وہ

کچھ دیر تلاش و جستجو کے بعد اس نے ایک پاسپورٹ اس بریف کیس میں سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ”آپ کی عمر کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پاسپورٹ پر جو کوائف درج ہیں میرے خیال میں مناسب ہیں۔“

میں نے وہ پاسپورٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پھر اسے کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ برطانوی پاسپورٹ تھا اور ابھی اس کی معیادوبھی نہیں نکلی تھی۔ وہ پاسپورٹ کسی بیوہ سارہ نکلسن کے نام جاری کیا گیا تھا۔ میں نے اس پاسپورٹ کے علاوہ اس عورت سے متعلق دیگر شناختی کاغذات کا مطالعہ بھی بغور کیا۔ پاسپورٹ اور ان کاغذات پر اندراجات کے مطابق وہ عورت ایک ماہ قبل ہی قاہرہ آئی تھی۔ اس کے پاسپورٹ پر عراق کا ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ قاہرہ سے عراق جانے کا قصد رکھتی تھی اور اسی دوران میں گویا اس کا پاسپورٹ اور کاغذات غائب کر دیئے گئے تھے۔

سارہ نکلسن ابھی قاہرہ ہی میں مقیم تھی یا اپنی انیمیکسی کے ذریعے دوسرا پاسپورٹ بنا کر عراق یا کہیں اور جا چکی تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جنیس کا ”ماہرانہ“ مشورہ مجھے مناسب ہی معلوم ہوا اور میں نے اسی پاسپورٹ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس پاسپورٹ پر پاکستانی سفارت خانے سے بھی ویزا حاصل کیا جا سکتا تھا مگر اب میرا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

”اچھا جنیس اب کل صبح ٹھیک ساڑھے دس بجے تم سے ملاقات ہوگی۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

جنیس سے رخصت ہو کر جب میں رم سیس چوک میں آئی تو شام ہو رہی تھی۔ خطرات کے باوجود ابھی مجھے قاہرہ میں کچھ وقت اور گزارنا تھا۔ جب تک پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات مجھے نہ مل جاتے۔ یہاں سے میرا نکلنا امر محال تھا مگر اب تقریباً تمام ہی مراحل طے ہو چکے تھے۔ میں ذہنی طور پر بڑی حد تک مطمئن تھی۔

مجھے اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ تھوڑے بہت سامان کے بغیر کسی بھی ہوٹل میں میرا قیام کرنا مشتبہ صورت حال پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے جو ضروری سامان تحریر اسکوائر سے خریدا تھا وہ قلو پٹھرہ ہوٹل ہی میں چھوٹا پڑا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے رم سیس چوک سے دوبارہ شاپنگ کی پھر جب میں خریداری سے فارغ ہوئی تو ایک ایئر بیگ میرے شانے سے لٹکا ہوا تھا اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس میرے بائیں ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھ کر اب یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ میں کوئی غیر ملکی ٹورسٹ ہوں۔

رم سیس چوک سے میں نے شارع شریف کے لئے ٹیکسی لی جو وہاں سے تقریباً دو میل کی مسافت پر تھا۔ میں پہلے ہی طے کر چکی تھی کہ مجھے اب کہاں اور کس ہوٹل میں قیام کرنا ہے! پولیس اور جرائم پیشہ افراد کی توجہ کا مرکز بھی عموماً بڑے ہوٹل ہی ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہ جس طبقے سے میرا تعلق تھا وہ طبقہ بھی آرام و آسائش کی خاطر عموماً بڑے ہوٹلوں ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ اوسط درجے یا تیسرے درجے کے ہوٹلوں کی طرف رخ نہیں کرتا۔ اسی سبب میں نے قاہرہ میں گویا آخری شب گزارنے کے لئے ایک ایسے ہی ہوٹل کا انتخاب کیا تھا جس کی طرف میرے دشمن متوجہ نہ ہو سکیں۔ شارع شریف پر واقع ایک نو منزلہ

اس پر اسرارِ ذہنی کیفیت نے میرے ذہن کو کچھ دیر کے لئے الجھا دیا۔ یقیناً کچھ باتیں ایسی تھیں جنہیں میں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اب حالات کا دوبارہ جائزہ لینا ضروری ہو گیا تھا۔ چند لمحات کے لئے میں نے اپنے ذہن کو قطعی خالی چھوڑ دیا تاکہ ہر سکون ہو سکوں۔ چند لمحوں کا یہ ذہنی سکون سودمند ثابت ہوا اور پھر گویا میں عقل کی روشنی میں حالات کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوئی۔ میرے ذہن میں بے درپے سوالات پیدا ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنے آئندہ اقدامات کے بارے میں جو فیصلہ کیا تھا ان کے متعلق سوچنے لگی۔

قاہرہ سے میں بہ حیثیتِ عذرا خان نہیں بلکہ ایک اور ہی شخصیت اپنا کر عراق جا رہی تھی۔ ایسی صورت میں وہاں میرا کسی آشنا شخص سے ملنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ بالفاظِ دیگر میں گویا قید تہائی کو سکون و اطمینان کا نام دے رہی تھی۔ کیا میں وہاں اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے بچھڑ کر خوش رہ سکتی تھی؟ میری چھوٹی بہن ذکیہ نے مجھے جن حالات میں قاہرہ ایئر پورٹ پر چھوڑا تھا کیا وہ حالات ایسے تھے کہ اسے میری طرف سے کوئی تشویش نہ ہوتی؟ کیا میں ایک اجنبی ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہو کر اور ایک فرضی شخصیت اپنائے ہوئے اطمینان قلب حاصل کر سکتی تھی؟ حالات سے فرار کی اس خواہش کو کیا مثبت طرز فکر کہا جا سکتا ہے؟ ان سوالات کے ساتھ ہی مجھے اور بہت سی باتیں یاد آتی چلی گئیں۔ جس وقت حالات سے مجبور ہو کر میں پاکستان سے قاہرہ روانہ ہوئی تھی وہاں غیر ملکی ایجنٹ سرگرم عمل تھے۔ ڈاکٹر رچرڈ کے نائب سولومن کے ایک خطرناک سازشی منصوبے کو میں نے ناکام بنا دیا تھا مگر سولومن اور اس کے کچھ ساتھی مجھ سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میری غیر موجودگی میں ان لوگوں نے کیا فتنہ انگیزی کی ہوگی میں اس سے لاعلم تھی۔

میں کافی دیر تک غور و فکر میں ڈوبی رہی اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچی کہ واقعی میرا فیصلہ غلط ہی تھا۔ میرے ذہن نے بروقت میری صحیح رہنمائی کی تھی۔ مجھے عراق نہیں پاکستان ہی جانا چاہئے۔ حالات کا از سر نو تجزیہ کرتے ہوئے مجھے وقت گزرنے کا احساس نہیں رہا تھا۔ میں چونکی اس وقت جب ویکرو اپنی میز کی طرف آتے دیکھا وہ غالباً یہی سمجھا ہو گا کہ اب تک میں کافی پی چکی ہوں گی حالانکہ میں نے صرف اس کا ایک ہی گھونٹ لیا تھا۔ کافی یونہی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کافی کنگ پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے ویکرو کو کچھ جھجکتے محسوس کیا۔

”لے جاؤ!“ میں نے کافی کنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور جلدی سے بل لے آؤ!“

”لیں۔“ وہ شائستگی سے بولا اور خالی ٹرے میں کافی کا بھرا گ کر لے گیا۔ پھر جلد ہی وہ بل لے کر آ گیا اور میں بل کی ادائیگی کے ساتھ ہی اسے ٹپ دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے اس کیفے میں بیٹھے ہوئے تقریباً آدھے پون گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا۔

کیفے سے نکل کر میں تیز تیز قدم اٹھائی ہوئی اس بلڈنگ کی طرف چل دی جس میں جیمس کی سکونت تھی۔ اس سے ملنے میں یقیناً کچھ تاخیر ہو گئی تھی لیکن یہ تاخیر میرے ہی حق میں بہتر ثابت ہوئی تھی۔ اس کے فلیٹ تک پہنچتے ہوئے میں یہ سوچ چکی تھی کہ کئی صورت حال کے پیش نظر مجھے اب اس سے کیا گفتگو کرنا ہے!

کسی اور چکر میں تھا۔ صبح جلد ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں ناشتا کرنے کے بعد اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق رم سیس اسکوائر روانہ ہو گئی۔ فوٹو گرافر نے مجھے دس بجے کا وقت دیا تھا مگر میں خاصا پہلے وہاں پہنچ گئی۔ پاسپورٹ سائز تصاویر تیار تھیں۔ میں نے ان پر ایک نظر ڈالی اور انہیں اپنے پرس میں رکھ لیا۔ تیس سے ملاقات کا وقت ساڑھے دس بجے تھا اس لئے میں اطمینان سے چہل قدمی کرتی ہوئی رم سیس چوک پہنچی۔ میں کیوں کہ گزشتہ رات ہی عراق جانے کا فیصلہ کر چکی تھی اس لئے کرنسی کے تبادلے کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ احتیاط کے پیش نظر میں قاہرہ ایئر پورٹ پر کرنسی کا تبادلہ نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ہر بڑے شہر کی طرح قاہرہ میں بھی کچھ ایسے ٹھکانے ضرور ہوں گے جہاں بڑے پیمانے پر غیر ملکی کرنسی کا لین دین کیا جاتا ہو گا مگر میں ان ٹھکانوں سے واقف نہیں تھی۔ اس مسئلے کا حل میں نے یہی سوچا تھا کہ جیس سے میں کسی ایسے ٹھکانے کا پتا معلوم کر لوں گی۔ وہ یقیناً واقف ہو گا۔ میری یہ احتیاط پسندی بے وجہ نہیں تھی کم از کم مشوروف کو یہ ضرور معلوم تھا کہ میرے پاس صرف مصری کرنسی ہے۔ مشوروف ایسا ذہین اور چالاک شخص اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ قاہرہ سے فرار ہونے کے لئے مجھے بہر حال کرنسی کا تبادلہ کرنا پڑے گا۔

کبھی تو وقت یوں دبے پاؤں گزر جاتا ہے کہ اس کی آہٹ تک محسوس نہیں ہوتی اور کبھی گزارے نہیں گزرتا۔ اس کا انحصار یقیناً آدمی کی اپنی اندرونی کیفیت اور احساس پر ہوتا ہے ورنہ وقت کی رفتار سدا ایک ہی سی رہتی ہے۔ مجھے کیوں کہ غلت تھی اس لئے وقت رینکتا محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی صرف دس بج کر چند منٹ ہوئے تھے۔ وقت گزاری کے لئے میں نے رم سیس چوک ہی کے ایک کیفے کا رخ کیا۔

کیفے میں داخل ہو کر میں ایک الگ تھلگ پرسکون سے گوشے میں بیٹھ گئی۔ یوں بھی اس وقت وہاں زیادہ تر میزیں خالی ہی تھیں۔ ویکرو بھی مصروف نہیں تھے اس لئے جلد ہی میرا آرڈر سروس کر دیا گیا۔ میں نے صرف کافی کا آرڈر دیا تھا حالانکہ اس کی بھی کوئی خاص خواہش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اپنے ہوٹل سے ناشتا کر کے ہی چلی تھی۔ میرا مقصد کیوں کہ محض وقت گزاری تھا اس لئے کافی کا صرف ایک گھونٹ لے کر میں اپنے آئندہ لائحہ عمل پر غور کرنے لگی۔

چند ہی لمحوں گزرے ہوں گے کہ اچانک خاصے عرصے بعد میرے ذہن پر ایک آشنا لذت انگیز سی کیفیت طاری ہونے لگی اور اسی کے زیر اثر میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ میرے ذہن کی یہ وہی پر اسرار کیفیت تھی جب مجھ پر ماضی یا مستقبل کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات ہوتے تھے یا پھر میرا غیر معمولی ذہن کسی مرحلے پر میری رہنمائی کرتا تھا۔ کیف و سرشاری اور خواب و بیداری کے درمیان مجھے خود اپنی ہی آواز اپنے ذہن میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں واضح الفاظ میں خود اپنی ہی آواز سن رہی تھی۔ عذرا خان! تمہارا فیصلہ غلط ہے! تمہیں عراق کی بجائے پاکستان جانا چاہیے۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔ تم جذبات سے قطع نظر خود بھی موجودہ حالات کا از سر نو جائزہ لو گئی تو اسی نتیجے پر پہنچو گی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی آواز معدوم ہو گئی۔ پھر رفتہ رفتہ میری حالت معمول پر آ گئی اور میں یوں چونک اٹھی جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے میری آنکھ کھل گئی ہو۔

آج بھی فلیٹ کا دروازہ خود اسی نے کھولا تھا۔ شاید وہ اسی فلیٹ میں اب تنہا ہی رہتا تھا۔
”خوش آمدید مسز گرانٹ!“ اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ ”میں آپ ہی کا منتظر تھا“ آئیے

تشریف لائیے!“

”سوری جیس۔“ میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ دیر ہوگئی حالانکہ میں نے تم سے ٹھیک ساڑھے دس بجے پہنچنے کے لئے کہا تھا۔“

”نیور مائنڈ!“ یہ کہتے ہوئے اس نے مڑ کر فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لئے اسی کمرے میں آ گیا جہاں گزشتہ روز اس سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ ”بیٹھے۔“ آپ غالباً تصویریں لے آئی ہوں گی؟“ اس نے مجھے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں“ میں نے جواب دیا پھر طویل سانس لیتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”تصویریں تو میں لے آئی ہوں مگر شاید اب ان کی ضرورت پیش نہ آئے!“

”کیوں؟“ وہ چونک کر بولا۔ ”کیا آپ کا پروگرام بدل گیا ہے؟“ ایسی صورت میں آپ نے مجھے جو پیشگی رقم دی تھی وہ.....“

”اس کی پروا نہ کرو!“ میں درمیان میں بول اٹھی۔ ”میں اتنی ہی رقم تمہیں اور بھی دے سکتی ہوں رقم کا کوئی مسئلہ نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے! میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”مجھ جاؤ گے کوئی ایسی خاص بات نہیں۔“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم اس فلیٹ میں اکیلے ہی رہتے ہو.....؟ میری مراد یہ کہ کوئی ملازم وغیرہ تو نہیں؟“ میں نے اس کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار دیکھ کر رکے بغیر مزید کہا۔ ”گھبرانے یا تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ دراصل میں تم سے ایک معاملے میں کچھ تعاون چاہتی ہوں۔“

”سوری مسز گرانٹ! میں اپنی حدود سے بھی تجاوز نہیں کرتا“ وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا۔ نہ معلوم اس کے ذہن میں کیا بات آئی تھی! ”صرف پاسپورٹ کی حد تک.....“

”تم شاید کچھ غلط سمجھ رہے ہو جیس! مسئلہ پاسپورٹ ہی کا ہے کچھ اور نہیں۔ پہلے میری پوری بات سن لو اس کے بعد تم اپنی مرضی کے مختار ہو گے کہ میرے ساتھ تعاون کرو یا صاف انکار کرو!“

”ٹھیک ہے آپ بتائیں کیا چاہتی ہیں؟“ وہ نیم راضی سا ہو کر بولا۔

”میں دراصل پکا کام چاہتی ہوں۔“

”یعنی؟“ اس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”یعنی یہ کہ پاسپورٹ پر تصویر نہ بدلی جائے بلکہ میں پاسپورٹ پر چسپاں تصویر کے مطابق اپنے چہرے پر وہی میک اپ کر لوں۔“

”آپ اگر یہی چاہتی ہیں تو ظاہر ہے مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے.....! اس میں بھلا تعاون کرنے کی کیا بات ہے!“ اس کے لہجے کی پیشگی لوٹ آئی۔

”تم سے محض میں اتنا تعاون چاہتی تھی کہ یہیں تمہارے فلیٹ میں میک اپ کر سکوں۔ میں

نے اسی سبب تم سے یہ سوال بھی کیا تھا کہ اکیلے رہتے ہو یا یہاں تمہارا کوئی ملازم بھی رہتا ہے.....؟ میرے اس سوال سے غالباً تم کچھ اور ہی سوچنے لگے!“ اس وقت میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

چند لمحے وہ کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا ہے۔ بالآخر اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”میری صاف گوئی کو معاف کیجئے گا مسز گرانٹ! اگر یہ کوئی لمبا چکر ہے تو میں اس میں پڑنا نہیں چاہتا..... اگر آپ کہیں گی تو میں..... میں آپ کی پیشگی رقم بھی لوٹا سکتا ہوں۔“

میری ریڈنگ کے مطابق وہ ایک جرائم پیشہ اور لالچی آدمی تھا۔ گزشتہ روز میں نے اسے جو دھمکی دی تھی شاید اس کے ذہن پر اب تک اسی کا اثر باقی تھا۔ میں نے اسے راہ راست پر لانے کے لئے باتوں باتوں میں یہ باور کرایا تھا کہ میرا تعلق بھی جرائم پیشہ طبقے سے ہے۔ یقیناً اسی لئے وہ مجھ سے کسی بھی طرح کا تعاون کرتے ہوئے خوف کھا رہا تھا۔ ورنہ پیشگی رقم لوٹانے کی بات ہرگز نہ کرتا۔ معاملہ خواہ مخواہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔ میرا مقصد محض یہ تھا کہ ایک لمبے چکر سے بچ جاؤں اور جیس اسی کو کوئی ”لمبا چکر“ سمجھ رہا تھا۔ ایک بار پھر کوئی نئی شخصیت اپنانے کی صورت میں مجھے ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل کا رخ کرنا پڑتا۔ اس میں وقت بھی برباد ہوتا اور خطرات بھی مول لینا پڑتے۔ بہر حال میں نے یوں بات بننے نہ دیکھ کر با مجبوری دوسرا رخ اختیار کیا اور جیس سے کہا۔ ”تم اگر اسے کسی سبب کوئی لمبا چکر سمجھ رہے ہو تو میں تمہیں اس پر مجبور نہیں کروں گی۔“ میرے لہجے میں بے اعتنائی تھی۔ پھر میں نے پرسکون کر تین سو گئی کے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ”یہ لو بقیہ رقم.....! مگر مجھے وہ پاسپورٹ نہیں چاہئے جو تم نے کل میرے لئے منتخب کیا تھا۔“

”پھر؟“ وہ یہ کہتے ہوئے تھوڑا سا آگے جھکا اور نوٹ میرے ہاتھ سے لے لئے۔ اپنی لالچی فطرت کے عین مطابق اس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

”مجھے کسی بھی ملک کا کوئی ایسا پاسپورٹ درکار ہے جس پر پاکستان کا ویزا حاصل کیا جا چکا ہو۔ اس کے لئے میں تمہیں مزید تین سو گئی دے سکتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں روکھاپن تھا۔ میں اس طرح اسے یہ احساس دلانا چاہتی تھی کہ اس نے میرے ساتھ تعاون نہ کر کے گویا اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ پھر ذرا توقف سے میں نے مزید کہا۔ ”تم مجھے محض پاسپورٹ اور اس سے متعلق کاغذات دے دو تمہارا کام ختم! تمہیں اس پاسپورٹ پر اپنی مہارت دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی سمجھ!“ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں طنز بھی تھا۔

”آپ شاید مجھ سے کچھ خفا ہوگئی ہیں مسز گرانٹ! میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ آپ پر کوئی الزام تراشی..... میں..... میں اپنے الفاظ واپس.....“

”وہ بات ختم ہو چکی ہے جیس.....! میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے اگر ایسا ممکن ہے تو ٹھیک ہے ورنہ..... میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے یہ تاثر دیا کہ جیسے اٹھنے والی ہوں۔

”کیوں نہیں مسز گرانٹ! میرے ذہن خیر ہے میں یقیناً کوئی نہ کوئی ایسا پاسپورٹ مل جائے

گا۔ کل رات ایک نئی کھپ آئی ہے جسے میں اب تک نہیں دیکھ پایا۔ آپ بیٹھیں میں ابھی حاضر ہوں۔“ مزید تین سو گنی ملنے کے لالچ نے اسے دوبارہ ”خوش اخلاق“ بنا دیا تھا۔
نوسو گنی کا مطلب بارہ ہزار چھ سو پاکستانی روپے تھے اور یہ رقم ایک پاسپورٹ کے عوض جیسے ایسے لالچی آدمی کے لئے خاصی بڑی رقم تھی۔ وہ مجھے اس کمرے میں تنہا چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ پھر جب وہ کافی دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک پاسپورٹ اور کچھ کاغذات تھے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اپنے اس ”کارنامے“ پر مجھ سے داد طلب ہو۔

”یہ لیجئے، مسز گرانٹ!..... آپ کا کام بن ہی گیا!“ وہ چکا اور پھر میرے قریب آ کر وہ پاسپورٹ اور کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔ اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں؟“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ سامنے والے صوبے پر بیٹھ گیا۔

میں اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر خاموشی کیے ساتھ اس امریکی پاسپورٹ کو کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر میں نے کاغذات پر بھی نظر ڈالی۔

”تھینک یو مسز جیس!“ میرے لہجے کی بے رخی برقرار رہی جو بے سبب نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے مزید تین سو گنی کے نوٹ گن کر اسے دے دیئے۔

”میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتائیں!“ جیس نوٹوں کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے خوش اخلاقی بے بولا۔

”خدمت؟ میں استہزاء ایہ انداز میں ہنس دی۔“ رہنے دیں مسز جیس اگر میں نے مزید کچھ کہہ دیا تو آپ اسے بھی کوئی لبا چکر سمجھیں گے۔“

”میں اپنے الفاظ ایک بار پھر واپس لیتا ہوں مسز گرانٹ!..... میں تو آپ ہی کی سہولت کے لئے کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ آپ پاکستان جا رہی ہیں تو یقیناً..... کرنسی..... آپ کو وہاں کی کرنسی بھی مطلوب ہوگی۔ میرا ایک دوست یہ کام کرتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔ یہیں نیچے چوک میں اس کی دکان ہے۔ بینک ریٹ اور.....“

”اس تعاون کا بھی شکریہ مسز جیس!..... آپ میرے لئے زیادہ فکر مند نہ ہوں پاکستانی کرنسی کا بندوبست بھی کر لوں گی!“ لفظ ”تعاون“ میں نے دانستہ استعمال کیا تھا۔

”اچھا اب میں سمجھ گیا کہ آپ کو بات ناگوار ہوئی ہے!“ وہ جان کر انجان بننے ہوئے بولا۔
مجھے بڑی ”آسانی“ سمجھ کر وہ غالباً زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اسی لئے اب خود ہی ہر طرح سے تعاون کی پیشکش کر رہا تھا۔ میرا اتنی دیر کی محنت رائیگاں نہیں گئی تھی۔ میں اس سے جو تعاون چاہتی تھی مجھے حاصل ہو گیا تھا۔

”تم اب خود ہی مجھے مجبور کر رہے ہو تو ٹھیک ہے۔ میں کچھ ضروری انتظامات کے بعد آ جاؤں گی یہاں!..... مگر.....“

”ہاں ہاں کہیں!“

”مگر یہ کہ تم کب تک میری واپسی کا انتظار کرو گے؟“

”جب تک کہیں آپ!..... اندازاً بتا دیں۔“ وہ بولا۔ ”یوں بھی آج مجھے کوئی خاص کام نہیں۔“

”تمہارے ملاقاتی عموماً کس وقت آتے ہیں؟“ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”کوئی بھی رات کو دس بجے سے پہلے نہیں آتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو پھر ٹھیک ہے رات نہیں ہوگی میں اس سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔“

”یعنی شام تک؟“

”ممکن ہے کہ شام سے پہلے ہی آ جاؤں“ یہ کہہ کر میں کھڑی ہو گئی۔ پاسپورٹ اور کاغذات میں نے پہلے ہی اپنے پرس میں رکھ لئے تھے۔

”مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ مسز گرانٹ کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا۔“ جیس میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

فلٹ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے جیس کو ”خدا حافظ“ کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے لئے دروازہ کھول دیا تھا۔

”میں آپ کا انتظار کروں گا مسز گرانٹ!“ اس نے بدستور خوش مزاجی اور ”کاروباری اخلاق“ کا مظاہرہ کیا۔

”مسز گرانٹ نہیں مسز ماریا لسن!“ میں مسکرا کر آہستگی سے بولی۔ اس نے جو پاسپورٹ میرے حوالے کیا تھا اس پر بھی نام لکھا تھا۔

وہ چونکا، پھر مسکرایا اور بولا ”بالکل!..... آپ!..... آپ اب ماریا لسن ہیں!“ اسے بھی یقیناً پاسپورٹ پر لکھا ہوا نام یاد آ گیا تھا۔

پھر میں مزید رکے بغیر اس کے فلٹ سے باہر نکل آئی۔

نیچے رم سس چوک میں آ کر میں نے ایک ٹیکسی ہائیر کی اور قاہرہ ایئر پورٹ پر روانہ ہو گئی۔ میں نے اپنے ذہن میں جو پروگرام ترتیب دیا تھا اب اس پر عمل کرنے میں کسی قسم کی تاخیر نہیں چاہتی تھی۔ ایئر پورٹ پہنچ کر ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد میں کسی بھی پہلی فلائٹ کی بکنگ کرالینا چاہتی تھی۔

جیس سے حاصل ہونے والا پاسپورٹ ایک امریکی خاتون کا تھا۔ پاسپورٹ پر اندراج کے مطابق اس کی عمر چالیس سال تھی۔ چہرے کی نقوش بس غنیمت ہی تھے مگر ایسے نہیں کہ انہیں پرکشش کہا جا سکے۔ اپنی تصویر سے وہ کوئی ایسی عورت معلوم نہیں ہوتی تھی کہ بطور خاص لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ بات میرے حق میں تھی۔ پاسپورٹ پر ویزا حاصل کرنے کی تاریخ اب سے ڈیڑھ ماہ قبل کی تھی۔ اسی عرصے میں یقیناً اس نے نیا پاسپورٹ بنوا لیا ہوگا اور قاہرہ سے جا چکی ہوگی۔ میں اس یقین کے باوجود پوری طرح محتاط تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے چہرے پر اس کا میک اپ کرنے اور اس کی شخصیت اپنانے سے پہلے میں نے ٹکٹ لینا ضروری سمجھا تھا۔

ایئر پورٹ پہنچنے تک میں انہی تمام باتوں پر غور کرتی رہی۔ کرایہ ادا کر کے ٹیکسی سے اترتے

میں اندر چلا جاتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کمرے کا دروازہ بھی اندر سے بند کر لیں۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”ہاں ضرور!“ میں بلا تکلف بولی۔ ”دروازہ تو بند کرنا ہی پڑے گا! جب تک میں خود دروازہ کھول کر تمہیں آواز نہ دوں مجھے ڈسٹرب نہ کرنا! ویسے مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ میں اس کی لالچی طبیعت سے پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ وہ مجھے عیسائی کی بجائے فطرتاً ہی یہودی معلوم ہو رہا تھا۔

پھر وہ سعادت مندی سے اقرار میں سر ہلا کر ”ٹل“ ہی گیا اور میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اسے وہاں سے ٹالنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ میرا اصل چہرہ نہ دیکھ سکے جو میک اپ کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اپنے چہرے پر ماریا لسن کا میک اپ کرنے کے لئے مجھے بہر حال پہلا میک اپ ختم کرنا پڑتا۔ میک اپ کا جدید ترین ساز و سامان میرے سوٹ کیس میں موجود تھا۔ اس میں وکیں بھی تھیں، کانٹریکٹ لینس بھی اور مختلف ماسک بھی! ان اشیاء کے علاوہ میں نے مختلف قسم کے لوشن اور بہت کچھ بازار سے خریدا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر مجھے کسی شے کی کمی محسوس نہ ہو۔

میک اپ کرنے سے پہلے میں نے کمرے کی کھڑکیاں بھی چیک کر لیں جو بند تھیں پھر جب میں پوری طرح مطمئن ہو گئی تو اپنے چہرے سے ”مسز گرانٹ“ کا میک اپ ختم کر دیا اور مسز ماریا لسن کی شخصیت اپنانے کیلئے نیا میک اپ کرنے لگی۔ ماریا کی پاسپورٹ پر چسپاں تصویر میرے سامنے چلی رکھی تھی۔ میک اپ کرنے میں میں نے خاص توجہ اور اپنی ممکنہ صلاحیت و مہارت صرف کی۔ میں کسی معمولی سی ڈیل کو بھی نظر انداز نہیں کر رہی تھی۔

بطور شناخت! پورٹ میں اس کی پتلیوں کا رنگ نیلا لکھا گیا تھا۔ اس کے لئے میں نے کانٹریکٹ لینس کا سہارا لیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے کو گویا ”نقل مطابق اصل“ بنانے میں تقریباً ایک گھنٹا صرف کیا اس عرصے میں وعدے کے مطابق ٹیس نے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔ پھر میں نے میک اپ کا تمام سامان سمیٹ کر دوبارہ اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا رخ اب دروازے کی طرف تھا۔ اب تک سب کچھ میری ہی مرضی و فضا کے مطابق ہو رہا تھا اسی لئے میرا موڈ خوشگوار تھا۔ میں دانستہ جیس کی حیرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنی آواز بدل کر بولی تھی۔

ذرا دیر بعد ہی جیس کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت میں صوفے پر آ کے بیٹھ چکی تھی۔ میری توقع کے مطابق وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”مسٹر جیس مجھے مسز ماریا لسن کہتے ہیں۔“ میں نے بدلی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا اور مسکرانے لگی۔

”ونڈرفل!“ بالآخر وہ بول اٹھا۔ ”آپ تو آواز بدل کر بھی بول سکتی ہیں! اگر میں خود آپ کو اس کمرے میں چھوڑ کر نہ گیا ہوتا تو بھی یقین نہ کرتا کہ آپ مسز گرانٹ ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ آیا۔

”تھینک یو جیس!“ میں بولی اور پھر جب وہ قریب آ گیا تو پرس سے ماریا کا پاسپورٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ ”اس پر لگی ہوئی تصویر دیکھو اور بلا تکلف بتاؤ میرے چہرے اور اس تصویر میں تمہیں کوئی

ہوئے میں پوری طرح چوکنا ہو گئی تھی۔ وہاں دشمنوں سے مدبھیڑ ہونے کا امکان بھی تھا اور میرے لئے دوسرے خطرات بھی تھے۔ میں اپنے ارد گرد سے قطعی غافل نہیں تھی۔ وہاں ملکی اور غیر ملکی سبھی ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ میں نے بھی خود کو گویا ان کی بھیڑ میں گم کر دیا۔

پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے انکوائری سے ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ میں ایک غیر ملکی فضائی کمپنی کی ایک فلائٹ سے آج ہی رات پاکستان کے لئے روانہ ہو سکتی تھی۔ کسی تاخیر کے بغیر میں نے اسی فضائی کمپنی کی فلائٹ کے لئے بکنگ کرائی اور ٹکٹ لے کر دوبارہ ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آ گئی۔ اب میری منزل شارع شریف پر واقع وہ ہوٹل تھا جہاں میں گزشتہ روز ٹھہری ہوئی تھی۔ وہاں تک میں نے ایک سرکاری ٹیکسی میں سفر کیا۔ یہ ٹیکسیاں لیوزین کہلاتی ہیں اور ان کے کرائے مقرر ہیں۔ اس بار شاید میری قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ اب میں حریفوں کے پھیلانے ہوئے تمام جال توڑ کر اپنے وطن پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔

اپنے ہوٹل پہنچ کر میں نے کاؤنٹر پر دوپہر کے کھانے کا آرڈر دیا اور پھر اوپری منزل پر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ایئر پورٹ آنے جانے کے سبب کھانے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ مجھے اسی لئے اس بے مزہ کھانے پر اکتفا کرنا پڑا جو ہوٹل والوں نے فراہم کیا تھا۔ کھانے سے فراغت پا کر میں نے کافی پی اور پھر ہوٹل کے واجبات ادا کر دیئے۔ اب مجھے وہاں مزید قیام کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہاں سے اپنا سامان لے کر میں نے ایک بار پھر رم سیس اسکوئر کا رخ کیا۔

جیس حسب وعدہ مجھے اپنے فلیٹ پر ہی ملا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

”آپ نہ جانے کب آ جائیں یہی سوچ کر میں نیچے چوک تک بھی نہیں گیا۔“ اس نے کہا۔

جواباً میں نے اس کا شکریہ ادا کیا پھر بولی۔

”جیس! تم اسی کمرے میں یا پھر اپنے فلیٹ کے کسی اور کمرے میں کچھ دیر کو مجھے تنہا چھوڑ دو! تم یقیناً اپنے فن میں مہارت رکھتے ہو مگر آج تم میری فنکاری بھی دیکھ لو گے“ میرا لہجہ بے تکلفانہ تھا۔

”یقیناً! یقیناً! آپ کی مراد میک اپ سے ہے نا!“

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر کہا۔ ”ویسے تم مجھے یقین دلا چکے ہو کہ تمہارا کوئی ملاقاتی رات دس بجے سے پہلے نہیں آئے گا“ پھر بھی اتنا ضرور خیال رکھنا کہ خلاف توقع کوئی آ جائے تو اندر نہ آئے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ تمہارے کسی ملاقاتی کو یہاں میری موجودگی کا اس وقت تک علم نہیں ہونا چاہئے جب تک میں ایک سوئی کے ساتھ میک اپ نہ کر سلاؤں۔“

”اول تو اس کا امکان قطعی نہیں ہے اس کے باوجود اگر ایسا ہوا تو میں آپ کی ہدایات پر پورا عمل کروں گا۔ آپ قطعی فکر نہ کریں۔“ وہ بالکل فرما نبردار بنا ہوا تھا۔ ”ہاں ایک بات تو میں بھول ہی گیا۔ وہ آپ نے کرنی کا بندوبست کر لیا؟“ فوراً ہی وہ اپنے مطلب کی بات پر آ گیا۔

”وہ بات بھی ہو جائے گی پہلے تم مجھے میک اپ سے فارغ ہو لینے دو۔“ میں نے جواب دیا۔

”بالکل ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی سے سر ہلایا پھر بولا۔ ”آپ اطمینان سے میک اپ کریں

معمولی سا فرق بھی نظر آتا ہے۔ میں اپنی تعریف نہیں تصدیق چاہتی ہوں کہ میری کوشش کامیاب رہی یا نہیں؟“

جیمس نے ماریا کی تصویر اور میرے چہرے کا بغور جائزہ لیا اور بولا۔ ”کوئی فرق نہیں“ یہ کہہ کر اس نے پاسپورٹ مجھے واپس کر دیا۔

”بیٹھو!“ میں نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نے میرے ساتھ جو تعاون کیا ہے میں اس سے واقعی بہت خوش ہوں‘ ممنون ہوں تمہاری.....! سنو.....! پہلے میری بات سن لو بعد میں بولنا.....! جو لوگ میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں میں ان کے تعاون کو نظر انداز نہیں کرتی میں تمہیں ایک دوست کی حیثیت سے کچھ تحفے دینا چاہتی ہوں۔ ان تحفوں کو تم اس ملاقات کی یادگار سمجھ سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے سوٹ کیس سے میک اپ باکس نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ”یہ میک اپ کا بہت قیمتی سامان ہے۔ ممکن ہے کبھی تمہیں اس کی ضرورت پیش آئے رکھ لو؟“

جیمس نے تکلف سے کام نہیں لیا اور وہ باکس لے لیا۔ باحیثیت ماریا ولسن میں جو سامان اپنے ساتھ نہیں لے جاتا چاہتی تھی اس میں جولین آندرے کا ریوالور بھی تھا۔ میں نے پرس کھول کر اس میں سے ریوالور نکالا اور پھر ایک نظر جیمس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا تھا۔

”غلط نہ سمجھو!“ میں نے کہا۔ ”یہ ریوالور میں نے اس لئے نکالا ہے کہ اسے بھی بطور تحفہ تمہیں نذر کرنا چاہتی ہوں۔“

ریوالور خالی نہیں تھا اس لئے میں نے احتیاطاً اس میں سے گولیاں نکال کر درمیان میز پر رکھ دیں۔ وہ ریوالور بھی جیمس نے شکریہ ادا کر کے لے لیا۔ ”ہاں اب کہو تم کرنسی کے تبادلے کی کیا بات کرنا چاہتے تھے؟“ میں نے کہا۔

جواباً جیمس نے وہی بات دہرا دی جو پہلے کہہ چکا تھا۔ کرنسی کے تبادلے میں اس کی دلچسپی کے سبب سے بھی میں خوب واقف تھی۔ ظاہر ہے کہ کرنسی کے تبادلے میں بھی وہ کچھ رقم کمانا چاہتا تھا۔ ٹکٹ خریدنے اور اب تک ہونے والے اخراجات کے بعد میرے پاس کوئی بڑی رقم نہیں بچی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے پاکستانی کرنسی کی بھی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے جیمس کا دل نہیں توڑا کچھ رقم میں نے اسے تبادلے کے لئے دے دی میں نے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا تھا کہ ابھی مجھے کسی ہوٹل میں بھی قیام کرنا پڑے گا۔ میری فلائٹ نصف شب کے قریب روانہ ہونا تھی۔ یہ وقت مجھے بہر حال کہیں نہ کہیں گزارنا تھا۔ میں اب جیمس کے فلیٹ میں مزید قیام نہیں چاہتی تھی۔

جیمس کرنسی کے تبادلے کی خاطر مجھے اپنے فلیٹ میں تنہا چھوڑ گیا تھا‘ جلد ہی وہ لوٹ آیا۔ پھر اس نے مصری کرنسی کے عوض جو پاکستانی روپے دیئے انہیں میں نے گئے بغیر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں رکی۔ رخصت ہوتے وقت مجھے جیمس کا چہرہ باغ و بہار نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں مجھے گویا جی بھر کے لونا تھا۔

ماریا ولسن کی شخصیت اپنانے کے بعد بھی میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا‘ رم سیس چوک سے لوٹ کر بھی نصف شب تک قیام کے لئے میں نے ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ہی قیام کیا

تھا۔ پھر میں اپنی فلائٹ کے وقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایئر پورٹ پہنچ گئی تھی۔ اس کے بعد جب تک میری فلائٹ قاہرہ ایئر پورٹ سے پرواز نہ کر گئی میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکتا ہی رہا کیوں کہ کسی بھی لمحے کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آ سکتا تھا۔

قاہرہ میں مجھے بے درپے جو واقعات پیش آئے تھے ان کی روشنی میں کچھ یقین سائیں آ رہا تھا کہ میں اپنے حریفوں کے چنگل سے نکل آئی ہوں۔

جہاز کو قاہرہ ایئر پورٹ سے پرواز کئے ابھی چند منٹ گزرے تھے کہ لاؤڈ سپیکر پر جہاز کے کیپٹن کی آواز گونجی۔ پھر اس نے جو اعلان کیا اسے سن کر میرے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ جہاز ایک بار پھر قاہرہ ایئر پورٹ کی طرف واپس جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

حالات میں کوئی بھی تقدیر پر شاکر رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سبب میں نے خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اپنی توجہ خطرے کی طرف سے ہٹانے کے باوجود گزرتا ہوا ہر لمحہ میرے اعصاب کو کشیدہ کر رہا تھا۔ غیر ملکی نوجوانوں سے گفتگو کرتے ہوئے بھی بار بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ جہاز کو اصل خطرہ کیا درپیش ہے؟ اسی دوران میں اچانک مجھے اپنی ذہنی کیفیت بدلتی محسوس ہوئی۔ یقیناً میرے ذہن کی براسرار حیرت انگیز قوتیں بیدار ہو رہی تھیں۔ مجھے غالباً میرے سوال کا جواب ملنے والا تھا۔ آشنا لذت انگیزی کیفیت کے زیر اثر میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں، رگ و پے میں ایک نشہ سادوڑنے لگا۔ میں بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گئی۔

”کیا ہوا میڈم؟ غیر ملکی نوجوان کی گھبرائی ہوئی سی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔
”تھٹک!“ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ”پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می!“ میں نے اسے ٹال دیا کہ کچھ نہیں براہ مہربانی مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔

”آر یو سلیپنگ؟“ اس نے سوال کیا کہ کیا میں سو رہی ہوں؟

”ہیں!“ میں نے بمشکل اس کے سوال کا جواب دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

خواب اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں اب مجھے اپنی ہی آواز نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ مجھے میرا حیرت انگیز ذہن اس سوال کا جواب دے رہا تھا کہ میں جس جہاز میں سفر کر رہی ہوں اسے کسی خطرے کا سامنا ہے اور اس کی وجہ کیا ہے! خود میری ہی آواز مجھ سے مخاطب تھی۔ عذرا خان! اس جہاز میں ایک طاقتور ٹائم بم رکھ دیا گیا ہے۔ بم رکھنے والا ایک اسرائیلی ایجنٹ تھا جو بیٹھرا ویز پورٹ اندن سے اس جہاز میں تہران کے لیے سوار ہوا تھا، مگر قاہرہ ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ انٹرپول (بین الاقوامی پولیس) کے کچھ افراد اس اسرائیلی ایجنٹ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انٹرپول والوں کو شبہ تھا کہ وہ کوئی گڑبڑ سرور کرے گا کیونکہ اسی جہاز سے فلسطین محاذ آزادی کی ایک اہم شخصیت بھی سفر کر رہی تھی۔ یہ شبہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب اسرائیلی ایجنٹ تہران جانے کی بجائے قاہرہ ایئر پورٹ پر اتر گیا۔ انٹرپول والوں نے فوری طور پر قاہرہ ایئر پورٹ سکیورٹی کے ذمے دار افراد سے رابطہ قائم کیا اور اس اسرائیلی ایجنٹ کو حراست میں لے لیا گیا۔ اسی گفتیش کے دوران میں یہ جہاز پرواز کر گیا۔ اس وقت تک ایسے شواہد نہیں ملے تھے کہ پرواز کو روکا جا سکتا۔ جب یہ شبہ محسوس کیا گیا کہ کہیں فلسطینی سیاسی شخصیت کو ختم کرنے کے لیے جہاز میں بم نہ رکھ دیا گیا ہو تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ جہاز کو دوبارہ قاہرہ ایئر پورٹ پر اتار لیا جائے۔ جہاز کے کیپٹن کو بھی اس ممکنہ خطرے سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ قاہرہ سے پرواز کرنے کے بعد یہ ٹائم بم کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، مجھے اس لمحے یوں محسوس ہوا جیسے دنیا پر آخری نگاہ ڈال رہی ہوں۔ وہ لمحات کسی بھی فرد کی زندگی میں انتہائی ہیجان خیز ہوتے ہیں جب اسے یقینی موت کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے اور یہاں تو اس سے بھی زیادہ ہولناک صورتحال تھی، یقین اور بے یقینی کی صورت! کیا جبر یہ جہاز اٹکے ہی لمحے ٹکڑے ہو کر پھیل گئی۔

کیپٹن کے اعلان کے مطابق جہاز کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی۔ اس خرابی کا علم اس وقت ہوا جب جہاز قاہرہ ایئر پورٹ سے پرواز کر چکا تھا۔ کیپٹن نے بتایا تھا کہ یہ خرابی معمولی نوعیت کی ہے اور اس پر جلد ہی قابو پا لیا جائے گا۔ جہاز کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم آسانی قاہرہ ایئر پورٹ پر اترنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر کیپٹن نے مسافروں سے نظم و ضبط برقرار رکھنے کی اپیل کی تھی۔ جہاز کے کیپٹن کا یہ اعلان بظاہر ایسا نہیں تھا کہ میرے اعصاب جھنجھٹا اٹھتے یا میں کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو جاتی۔ میری فکر و تشویش کا سبب کیپٹن کا لہجہ اس کی آواز کا زریعہ اور اس آواز میں چھپا ہوا نامحسوس سا خوف تھا۔ مسافروں میں سے کسی نے ایسا محسوس کیا ہو نہ کیا ہو مگر میں بہر حال چونکا ہوا گئی۔ مسافروں کو جو کچھ بتایا گیا تھا، میرے خیال میں درست نہیں تھا۔ جہاز یقیناً کسی بڑے خطرے سے دوچار تھا۔ غالباً یہ سوچ کر مسافر بے حواس نہ ہو جائیں انہیں اصل خطرے سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ یہ کوئی غیر اخلاقی یا غیر قانونی بات نہیں تھی، ایسے حالات میں عموماً ذمے دار افراد کا یہی رویہ ہوتا ہے۔ ان پر بہر حال بہت سی قیمتی جانوں کی ذمے داری ہوتی ہے۔

اس اعلان کا مجھ پر جو رد عمل ہوا سو ہوا جہاز کے دوسرے مسافروں میں بھی کھلبلی سی مچ گئی۔ میری بائیں جانب والی سیٹ پر ایک غیر ملکی نوجوان بیٹھا تھا۔ اعلان سن کر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ”کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”ڈونٹ وری بیک بوائے!“ میں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔ ”فیک اٹ ایزی!“ میرے اندازے کے مطابق وہ اسکیڈزی نیوین کنٹریز میں سے کسی ایک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انگریزوں میں اس نوجوان سے فکر نہ کرنے اور پرسکون رہنے کے لیے کہا تھا۔

”اوہ یس..... یس میڈم!“ وہ چونک کر بولا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر بھی پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

کچھ تو مجھے اس نوجوان کی حالت پر رحم آ رہا تھا اور کچھ یہ کہ میں خود بھی شدید خطرے کے احساس کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتی تھی۔ میں اسی لیے اس نوجوان سے گفتگو کرتی رہی۔ چند منٹ کی بات تھی! جو کچھ ہوتا تھا انہی چند منٹ میں ہو جانا تھا۔ آدمی کبھی خود کو بہت با اختیار سمجھ لیتا۔ لیکن زندگی میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب اسے بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ قطعی اختیار ہے۔ حقیقتاً کچھ بھی اس کے بس میں نہیں۔ اس وقت بھی کچھ یہی صورت تھی۔ میں ہی کیا،

نہیں ہوتے۔ بظاہر آدی نظر آنے والے یہ افراد یقیناً آدی نہیں، درندے ہوتے ہیں۔ خطرناک درندے۔ اور درندوں کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ کوئی قومیت نہ کوئی قدر درندے بس درندے ہوتے ہیں۔ آدی کے دشمن انسانیت کے دشمن ہر فرد کے دشمن۔ صفحہ زمین پر یہ درندے ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ عرصہ دراز سے کچھ ایسے ہی درندے میری توجہ کا مرکز تھے ان سے میری جنگ جاری تھی میرے خدا نے مجھے اتنی ہمت دی تھی اتنا حوصلہ بخشا تھا ایسی قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی تھیں کہ میں انکے ناپاک عزائم کو خاک میں ملائی رہوں۔

وہ اذیت ناک لمحات کب اپنے آخری مراحل میں داخل ہوئے مجھے احساس نہ ہوسکا میں تو اس وقت چونکی جب ایک بار پھر جہاز کے کیپٹن کی آواز لاؤڈ سپیکر پر سنائی دی۔ مسافروں کو وہ یہ مژدہ سنا رہا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد جہاز بخیریت تمام قاہرہ ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے۔ جہاز کے دیگر مسافروں کے لیے ممکن ہے یہ اطلاع خوش کن رہی ہو مگر میری حد تک ایسا نہیں تھا۔ میں جب تک جہاز سے اتر کر دور نہ چلی جاتی میرا اضطراب ختم نہ ہوتا۔ تاہم ہم جہاز کے کس حصے میں تھا اور اسے کس وقت بھٹنا تھا یہ تو خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ میرے حیرت انگیز ذہن نے اس سلسلے میں میری کوئی رہنمائی نہیں کی تھی۔ بہر حال اپنے اندر پھیل ہوئی ہے چینی پر قابو پاتے ہوئے میں نے بھی دوسرے مسافروں کی طرح بیلٹ باندھ لی۔ میری سیٹ کھڑکی کے قریب تھی اسی لیے جب جہاز ایئر پورٹ پر اترتا تو میں کھڑکی سے باہر کا ہارہ لینے لگی۔ رن وے کے اس حصے میں دور تک کوئی اور جہاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاز رکا تو مجھے کافی لمبے پر کھڑی ہوئی جیسے نظر آئیں جن میں میرے اندازے کے مطابق فوجی جوان تھے۔ پھر سب کچھ انتہائی سرعت کے ساتھ ہوا۔ تمام مسافروں اور جہاز کے عملے کو اس جہاز سے اتار لیا گیا جن میں خود میں بھی شامل تھی۔

شدید خطرے کی حدود سے نکلنے ہوئے اور دوسرے مسافروں کے ساتھ ایک بس میں سوار ہوتے وقت میں نے صرف اتنا دیکھا کہ کچھ افراد تیزی کے ساتھ اس جہاز کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔ ان کے پاس جو سامان تھا اسے دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ یہ وہ افراد ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر بموں کا سراغ لگاتے ہیں اور پھر انہیں ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ قاہرہ ایئر پورٹ سیورٹی کا عملہ یقیناً انتہائی مستعد تھا کہ اس نے محدود وقت میں تمام انتظامات پہلے ہی سے مکمل کر لیے تھے۔

بسوں کے ذریعے جہاز کے مسافروں کو نسبتاً ایک الگ تھلک حصے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ سیورٹی ملازم ایئر پورٹ کی عمارت کے اس حصے کی نگرانی کر رہا تھا۔ مسافروں سے کہا گیا تھا کہ قاہرہ سے وہی طائر کچھ ہی دیر بعد دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائے گی۔ ”فلسطین محاذ آزادی کی اہم سیاسی شخصیت کو غالباً اس حصے کی بجائے وی آئی بی روم یا پھر کہیں کسی اور محفوظ جگہ پر رکھا گیا تھا۔ مجھے ان مسافروں میں کوئی ایسی سیاسی شخصیت نظر نہیں آئی تھی۔ ان تمام انتظامات کا مقصد سمجھنا میرے لیے مشکل تھا۔ اس واقعے کی تشہیر غیر ملکی فضائی کمپنی کے لیے بھی کسی طرح مناسب نہیں تھی اور نہ سیاسی طور پر اصل واقعے کا سامنے آنا بہتر تھا۔

جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی وجہ سے بہت سے مسافر دوبارہ اس جہاز میں سفر کرنے پر آمادہ

مضامین میں بکھر جائے، بھک سے اڑ جائے اور کیا معلوم موت دے پاؤں قریب سے گزر جائے! یقیناً بہر حال بے یقینی سے غنیمت ہوتا ہے چاہے موت ہی کا یقین کیوں نہ ہو لیکن بے یقینی آدی کو جیسے جی مار دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ عقائد کے باب میں ہے۔ وہ لوگ جن کے عقائد مضبوط ہوتے ہیں جنہیں اپنے اپنے مذاہب پر پختہ یقین ہوتا ہے ان کے مذہب نے زندگی اور موت کا جو تصور پیش کیا ہے جو تشریح کی ہے ان کے عقائد کا حصہ بن جاتی ہے تو وہ بڑے سکون سے مر جاتے ہیں کہ انہیں یقین ہوتا ہے زندگی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ اس زندگی کے بعد بھی ایک اور زندگی ہے اصل زندگی! مگر اس کے برخلاف جو لوگ بے عقیدہ ہوتے ہیں یا پھر تشکیک کی منزل میں ہوتے ہیں ان کے لیے بڑا عذاب ہے ایک حد تک زندگی بھی اور مختلف مذاہب نے جو کچھ بتایا ہے وہ بھی! تشکیک تذبذب اور بے یقینی کی فضا انہیں بے سکون رکھتی ہے۔ زندگی کی ہر سطح پر یہی عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ کسی بھی امر یا عمل کا طے نہ ہونا کہ وہ ظہور پذیر ہوگا یا نہیں اضطراب اور بے چینی کا سبب بن سکتا ہے خصوصاً اہل یقین کے لیے! میری آپ بیتی پڑھتے ہوئے غالباً میرے قارئین نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں بھی اہل یقین میں ہوں۔ سو بے یقینی کی اس فضا میں جس سے میں دوچار تھی میرے لیے عذاب ناک ہی تھی۔

جہاز کے اندر ہونے والی نقل و حرکت مجھے عجیب سی لگ رہی تھی۔ ایئر ہوسٹس اور اسٹیورڈز ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔ کیپٹن کی ہدایت کے مطابق وہ مسافروں کو پرسکون رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ مسافروں میں خواتین بھی تھیں مرد بھی اور بچے بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ خواتین خواہ کسی خطہ زمین کی ہوں مردوں سے پہلے جی چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاز کے انجن میں خرابی کی تفصیل جاننے کے لیے اسی لیے وہ مردوں کی نسبت زیادہ پیش پیش تھیں۔ ان کے اندر کا خیال انہیں ایئر ہوسٹس سے طرح طرح کے سوالات کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ معلوم نہیں جہاز کے کیپٹن نے اپنے عملے کو اصل خطرے سے آگاہ کیا تھا یا نہیں! لیکن ایئر ہوسٹس کی مصنوعی مسکراہٹوں اور ایک نوع کی بے چینی سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ ممکن ہے وہ اصل خطرے سے بے خبر ہوں۔ پھر بھی بے یقینی کا شکار ہیں۔

وہ چند منٹ میرے ہی لیے نہیں یقیناً جہاز کے بقیہ مسافروں کے لیے بھی گویا صدیوں پر محیط ہو گئے تھے۔ قریبی سیٹ پر بیٹھا ہوا نوجوان غیر ملکی دوبارہ مجھ سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس پر ایک اچھتی ہوئی سی نظر ڈالی تھی۔ وہ ایک اضطرابی کیفیت میں دانتوں سے اپنے ہاتھوں کے ناخن کتر رہا تھا اور وہی کیا بظاہر مجھے جہاز کا کوئی بھی مسافر نارمل نظر نہیں آ رہا تھا۔ عام حالات میں آدی اپنے اندر چھپے ہوئے اصل آدی کے چہرے پر مختلف نقاب ڈالے رہتا ہے مگر جب کسی بھی سبب حالات معمول پر نہیں رہتے تو سارے نقاب ایک ایک کر کے غائب ہو جاتے ہیں اور اصل آدی کا چہرہ نظر آنے لگتا ہے۔ میرے ارد گرد اس وقت ایسے ہی چہرے تھے خوف زدہ چہرے بے یقین چہرے رحم طلب چہرے!

مجھے یہ معلوم نہیں تھا اور نہ میں نے معلوم کرنا چاہا کہ فلسطین محاذ آزادی کی وہ اہم سیاسی شخصیت جہاز کے کس حصے میں ہے جس کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے جنون میں ایک شقی القلب تھا۔ اس تاریکی میں بھی شامل ہیں صرف ایک ہی چراغ، اقلے کا سامنے آنا بہتر تھا۔ گل نہیں ہوگا جانے کتنے گھر بے چراغ ہو جائیں گے۔ شاید ان تنگ انسانیت افراد کے سینوں میں دل

مسافروں کو جہاز تک پہنچایا جانے لگا۔ میں نے اس غرے میں کوئی دھماکا نہیں سنا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہم کو ناکارہ کرنے والا عملہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا تھا۔ دھماکا ہونے کے وقت سے پہلے ہی کچھ مہربان ہاتھ اس ہم تک پہنچ گئے تھے جو اس جہاز اور اس کے مسافروں کو لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا۔ شاید ان مسافروں میں سے کسی کو بھی ابھی سفر آخرت پر روانہ نہیں ہوا تھا اور یہ کیسی عجیب بات تھی وہ بھی اس سے بے خبر تھے کہ موت ان کی ہمسفر تھی جو کسی بھی لمحے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی۔ بعض اوقات بے خبری بھی کیسی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مگر میں اس وقت اس ”نعمت“ سے محروم تھی۔

جہاز کے دوبارہ پرواز کرنے سے قبل کیپٹن نے مسافروں سے معذرت کی کہ انہیں تاحق پریشانی اٹھانا پڑی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد جہاز فضا میں پرواز کرنے لگا۔

جو واقعہ پیش آیا اس سے براہ راست میرا کوئی تعلق نہیں تھا، میں اس کا سبب نہیں تھی۔ سبب وہ اہم سیاسی شخصیت تھی جس نے قاہرہ میں رک جانے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ غالباً وقتی طور پر! کیونکہ اب وہ شخصیت میری ہمسفر نہیں تھی۔ میں نے اپنے فطری تجسس سے مجبور ہو کر اپنے ہمسفروں کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس معاملے میں مزید دلچسپی نہ لینے کی ایک وجہ تو یہی تھی جو ابھی میں نے بیان کی، دوم یہ کہ مجرم پکڑا جا چکا تھا اور اس کا جو اصل مقصد تھا، وہ بھی واضح تھا۔ پھر یہ کہ مشاہدے کے سوا میرے بس میں تھا بھی کیا! ”تک بک دیدم دم نہ کشیدم“ والا معاملہ تھا اور یہ بھی کہ میں خود غیر معمولی حالات سے گزر رہی تھی۔ اس واقعے کے حوالے سے مجھے اب اپنے وطن میں ہونے والی ریشہ دوانیوں کا خیال آ رہا تھا، میں جن حالات میں اپنے وطن سے قاہرہ روانہ ہوئی تھی، وہ حالات کسی طرح اطمینان بخش نہیں تھے۔ قاہرہ سے کراچی تک کے سفر میں مجھے حالات کا ازسرنو جائزہ لینے کی مہلت مل گئی اور میں نے آئندہ کے لیے کچھ اہم فیصلے کیے۔

پھر جب ایک اعصاب شکن سفر کے بعد جاں فزا اعلان سماعت نواز ہوا کہ جہاز کراچی ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے ایک اور محاذ پر اپنے بدخواہوں کو شکست دے دی ہے۔ ان تمام تر کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ انہوں نے میرے لیے جو جال پھیلایا ہے، میں اس سے نکل نہ سکوں۔ اپنی دانست میں انہوں نے میرے پر کاٹ دیے تھے مگر جسے پرواز کی سعادت قدرت کی طرف سے نصیب ہوا اسے بھلا کون روک سکتا ہے!

ایئر پورٹ پر مجھے کسی بھی مرحلے سے گزرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اپنے شانے پر ایئر بک لٹکائے اور ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھائے میں ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر آ گئی اور بلا تکلف ایک خالی ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ اس وقت میرے چہرے پر کیونکہ ایک غیر ملکی عورت کا میک اپ تھا اس کے ملاوہ لباس بھی بدیسی تھا اس لیے مجھے ”آسامی“ جان کر کئی ٹیکسی والے میری طرف متوجہ ہو گئے۔ دو ایک نے الٹی سیدھی انگریزی جھاڑنے کی بھی کوشش شروع کر دی۔

جواباً اور ازراہ لفظ طبع میں نے غیر ملکیوں کے سے لہجے میں ان سے کہا ”ام کو ارڈو آتا۔ تم ام سے ارڈو بول سکتا۔“

”تم کدو جائے گا میڈم؟“ ابی ام کو بولو! ٹیکسی والا بول اٹھا جو نسبتاً میرے زیادہ قریب تھا۔

نہیں تھے۔ انہوں نے سکیورٹی کے عملے سے اس بات کا اظہار بھی کیا مگر اس طرح دوسری قاحتیں پیدا ہو جاتیں۔ جس بات کو بدو جوہ صینہ راز میں رکھا جا رہا تھا راز نہ رہتی۔ ایسے مسافروں کو سکیورٹی والوں نے پہلے نرمی سے سمجھانا چاہا، پھر بھی وہ بصدر رہے تو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ایسا ممکن نہیں۔

میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی مگر ظاہر ہے مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں تو خود اپنے عذابوں کی اسیر تھی اور کسی بھی طرح جلد از جلد قاہرہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ میرے حق میں یہ بہتر ہی ہوا تھا کہ اس جہاز کے مسافروں کو متعینہ حدود سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اور نہ کوئی باہر کا آدمی ان تک پہنچ سکتا تھا۔

مسافروں اور سکیورٹی والوں کے درمیان ابھی تک گویا چھپر چھاڑ جاری تھی۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگائے ہوئے ہماری بھر کم ایک شخص سکیورٹی والوں پر اپنا غصہ اتار رہا تھا۔ ”کیا ہم لوگ مجرم ہیں جو ہمیں یہاں اس طرح قیدیوں کی مانند رکھا جا رہا ہے اور گمرانی کی جا رہی ہے؟ جہاز کے انجن میں خرابی ہم نے تو پیدا نہیں کی!“

سکیورٹی کا ایک مسلح نو جوان اس شخص کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس پر وہ شخص اور بھی گرم ہو گیا۔ ”میں اپنے سفارتخانے کے ذریعے مصری حکومت سے احتجاج کروں گا۔ آپ کے عملے کی شکایت بھی کروں گا آپ لوگوں نے ہمیں تاحق مارچہ میں رکھا!“ اس شخص کی تیز آواز سن کر ایک ادھیڑ عمر سکیورٹی افسر ادھر آ گیا۔ اس نے نو جوان سکیورٹی والے سے حقیقت حال معلوم کی، پھر سوئیڈ بونیڈ ہماری بھر کم شخص کو مخاطب کیا ”جناب والا! بے شک آپ اپنے سفارت خانے کے ذریعے ہماری حکومت سے احتجاج کیجئے گا، لیکن فی الحال خود بھی پرسکون رہیں اور دوسرے مسافروں میں بھی خواہ خواہ خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش نہ کریں۔ ہم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں آپ ہی لوگوں کی حفاظت اور بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ ازراہ کرم ہمیں اپنے فرائض ادا کرنے دیا بصورت دیگر ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں اور سمجھدار معلوم ہوتے ہیں میرے خیال میں آپ میری بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے!“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں کچھ سختی آ گئی تھی۔

اس کے بعد ازم وہ شخص کچھ نہ بولا اور بڑا اتنا ہوا ایک طرف جا بیٹھا۔ میں قریب ہی کھڑی تھی۔ سکیورٹی افسر نے میری طرف دیکھا اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ”ٹیک اے سیٹ میڈم!“ اس نے مجھ سے بھی کہیں بیٹھ جانے کو کہا۔

”ٹھیک یو!“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس طرف بڑھ گئی جہاں اور بھی خواتین بیٹھ تھیں۔

رفتہ رفتہ سکیورٹی کے عملے کا بدلتا ہوا رویہ دیکھ کر وہ لوگ خاموش ہو گئے جو بلا سبب اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد فضائی کمپنی کی جانب سے مسافروں کی خاطر مدارات شروع ہو گئی انہیں مختلف قسم کے مشروبات سرو کیے گئے تھے۔ میں نے شخص کا پی پی پراکتفا کیا تھا۔ اس ”قید“ میں یا اسے جو بھی کہا جاسکے تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا تو دوبارہ بسوں کے ذریعے

میں نے ایک بڑے ہوٹل کا نام لے دیا۔ اس نے پیسے بتائے جو ظاہر ہے کہ بہت زیادہ تھے۔ یہ بہر حال قاہرہ نہیں کراچی تھا جہاں عموماً ٹیکسیاں میٹر سے چلتی ہیں اسی لیے میں نے بدستور ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا کہ کیا تمہاری ٹیکسی کا میٹر خراب ہے۔

”ابی! اور ایئر پورٹ پر آکر بی میٹر سے چلے گا میم صاحب تو بچوں کو کیا کھلائے گا!“ ٹیکسی ڈرائیور نے گویا عذر پیش کیا۔

اس بحث میں مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے میں نے اس سے کہا کہ میٹر ہی سے چلو بعد میں میٹر کے علاوہ جو چاہو گے لے لینا، مگر صرف اتنے پیسے کہ مجھے اپنے لٹ جھانے کا احساس نہ ہو۔ میں نے اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ پہلے بھی پاکستان آچکی ہوں اور یہ شہر میرے لیے نیا نہیں ہے۔ وہ بھی میرے اردو بولنے سے یقیناً کچھ نہ کچھ اندازہ تو لگا ہی چکا ہوگا اس لیے میٹر سے چلنے پر راضی ہو گیا۔ پھر اسے یہ خیال بھی رہا ہوگا کہ میں میٹر کے علاوہ بھی کچھ پیسے دینے کا وعدہ کر چکی ہوں۔ اس نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا اور ڈکی میں رکھنے لگا۔ میں اس دوران میں ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ایئر بیگ میں نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔

میں نے مصطفیٰ ٹیکسی والے سے ایک بڑے ہوٹل کا نام لے دیا تھا ورنہ حقیقتاً مجھے ایئر پورٹ سے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر جانا تھا۔ صدر کے علاقے میں داخل ہونے تک میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کچھ نہ کہا اور سفر جاری رہا۔ پھر جب وہ صدر کے علاقے کو ایک جانب چھوڑتے ہوئے میوزک فاؤنٹین سے بائیں جانب مڑا تو میں نے اس سے رکنے کے لیے کہا۔ سڑک کی مخالف سمت مجھے کچھ خالی ٹیکسیاں کھڑی نظر آ گئی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے میرے کہنے پر فٹ پاتھ کے قریب ٹیکسی روک دی پھر حیرت کا اظہار کرنے لگا کہ ابھی ہوٹل دور ہے میں وہاں کیوں اتر رہی ہوں؟ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور میٹر دیکھتے ہوئے پرس کھول کر کرائے کے علاوہ اسے پانچ روپے اور تھما دیے اس نے روپے گن کر جیب میں رکھ لیے اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا تاکہ ڈکی سے میرا سوٹ کیس نکال سکے۔ میں اس سے پہلے ہی اتر گئی تھی۔

پھر جب وہ ٹیکسی سیدھی چلی گئی تو میں نے سوٹ کیس اٹھائے ہوئے آنے اور جانے والی دونوں سڑکوں عبور کیں اور مخالف سمت پہنچ گئی۔ وہاں سے میں ایک اور ٹیکسی میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کے لیے روانہ ہو گئی۔ میں کیونکہ اس وقت ایک غیر ملکی عورت کی شخصیت اپنانے ہوئے تھی اس لیے یہ احتیاط میرے لیے ضروری تھی۔

اس ٹیکسی کو بھی میں نے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے خاصا پہلے ہی چھوڑ دیا۔ اپنی منزل کی طرف پیدل جاتے ہوئے میری آنکھوں میں اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ اسے وہیں ہونا چاہئے تھا جہاں میں جا رہی تھی۔ مجھے اپنے لوگوں پر یقین تھا کہ انہوں نے اس دوران میں ذکیہ کی ہر طرح خبر گیری رکھی ہوگی۔ قاہرہ ایئر پورٹ پر جب وہ مجھ سے رخصت ہونے والی تھی تو میں نے اسے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا نمبر دے دیا تھا۔ ذکیہ نے یقیناً میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے کراچی پہنچتے ہی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر فون کیا ہوگا۔ میں یہی سوچتی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اپنی منزل سے فریب ہوتی

گئی۔

آپریشن سیل کی عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ مسلح محافظوں کی نظر میں آچکی ہوں۔ میں بظاہر لائق کے انداز میں اس طرف قدم اٹھانے لگی جدر ڈیوٹی روم تھا۔

ڈیوٹی روم تک پہنچنے سے قبل مجھے کم از کم دو جگہ بآسانی روکا جاسکتا تھا۔ ابھی میں بائیں جانب مڑ کر ہمشکل چند قدم چلی ہوں گی کہ میری پشت سے ایک ٹھوس شے آگئی اور یہ ٹھوس شے کسی رائفل کی نال کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی۔

”رک جاؤ..... کون ہو تم؟ مجھ سے سخت لہجے میں کہا گیا۔

”عذرا خان۔“ میں نے رک کر اطمینان سے بغیر مڑے جواب دیا۔ میں اپنی اصل آواز ہی میں بولی تھی۔

”تم اگر عذرا خان ہو تو پھر وہ کون ہے جو پہلے سے یہاں موجود ہے؟“

میں سمجھ گئی کہ میری اصل آواز سننے کے باوجود محافظ نے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا کہ کوئی اور عورت میری آواز کی نقل کر کے اسے بے وقوف بنا سکتی ہے۔ میں اسی لیے مزید شناخت کی خاطر بولی ”تمہیں دھوکا ہوا ہے، وہ عذرا خان نہیں بلکہ عذرا خان کی چھوٹی بہن ذکیہ ہے۔ ویسے بانی داوے اس وقت ڈیوٹی انچارج کون ہے عثمانی یا کمانڈر نواز؟“

”سوری میڈم!“ یہ کہتے ہوئے محافظ نے میری پشت سے رائفل کی نال ہٹالی۔ اسے لازماً اب یقین ہو گیا تھا کہ میں عذرا خان ہی ہوں کوئی اور نہیں۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں آگے بڑھ گئی۔ پھر مجھے ڈیوٹی روم تک پہنچنے سے پہلے کسی اور محافظ نے نہیں روکا۔ میں بہر حال ان کی مستعدی اور ہر وقت چوکنا رہنے سے خوش ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ میری ہی ہدایات کا نتیجہ تھا کہ چاہے کوئی بھی ہو جب تک وہ اپنی شناخت نہ کر ائے اسے متعینہ حدود سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

آپریشن سیل کی عمارت کے مختلف گوشوں میں انتہائی حساس قسم کے مائیکروفون نصب تھے جو دیواروں میں اس طرح لگائے گئے تھے کہ نظر نہ آسکیں۔ یہ وقت ضرورت ان سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ ان کا تعلق ڈیوٹی روم سے تھا۔ ڈیوٹی روم میں موجود شخص اگر چاہتا تو عمارت کے کسی بھی حصے میں ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔ یہ مائیکروفون عموماً اس وقت استعمال کیے جاتے تھے جب کوئی خلاف توقع واقعہ رونما ہو یا پھر کسی سبب ان کے استعمال کی ضرورت پیش آجائے۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت بھی ڈیوٹی انچارج عثمانی نے ان مائیکروفونز کے ذریعے میرے اور محافظ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی ہوگی۔ دن کے وقت ڈیوٹی پر عثمانی ہی ہوتا تھا۔ میں غالباً پہلے بھی یہ لکھ چکی ہوں کہ بظاہر اس عمارت میں داخل ہونا بہت آسان معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ کوئی بھی شخص بغیر علم و اطلاع کے عمارت کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا تھا جب تک خود عمارت کے مکین ایسا نہ چاہیں۔ میری بجائے اس وقت اگر کوئی عورت کسی غلط ارادے سے عمارت میں داخل ہوتی تو اب تک اسے عمارت کے انٹرنیٹل حصے میں پہنچا دیا جاتا جو ایسے ہی افراد

کے لیے مخصوص تھا۔ سیل کے ارکان اس سے بھی واقف تھے کہ کبھی کبھی دانستہ خود میں بھی انہیں آزمائش میں ڈالتی رہتی ہوں تاکہ وہ ہر وقت چوکنا رہیں۔ وہ اس لیے میرے ساتھ بھی کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے تھے۔

میں جب ڈیوٹی روم میں داخل ہوئی تو عثمانی مجھے اپنا منتظر ملا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور خیریت پوچھی۔ میں سوٹ کیس اور ایئر بیگ ایک جانب رکھ کر ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ طویل سفر نے بہر حال مجھے تھکا دیا تھا۔ عثمانی میری توقع کے مطابق مجھے پہچان گیا تھا اس نے یقیناً مائیکروفون کے ذریعے میری آواز سن لی ہوگی ورنہ میں نے اپنے چہرے پر ایسا میک اپ کیا تھا کہ میرا کوئی قریبی شناسا بھی مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔

”ذکیہ تو خیریت سے ہے نا؟“ میں نے عثمانی سے پہلا سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ کی ہدایت کے مطابق وہ یہاں آنے کے بعد باہر نہیں گئیں ہاں وہ آپ کی طرف سے بہت فکر مند تھیں۔ روز ہی آپ کے بارے میں پوچھتی رہتی تھیں کہ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع ملی یا نہیں!“

”ٹھیک ہے اور کوئی خاص بات؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ان کی زبانی ہمیں جن حالات کا علم ہوا وہ ہمارے نزدیک تشویش ناک تھے۔ میں نے کمانڈر نواز سے اس سلسلے میں بات کی تھی کہ کیوں نہ وہ یا پھر میں قاہرہ روانہ ہو جائیں ممکن ہے آپ کو ہماری مدد کی۔“

”کمانڈر نواز نے یقیناً تمہاری رائے سے اختلاف کیا ہوگا!“ میں درمیان میں بول اٹھی۔

”جی ہاں“ انہوں نے کہا تھا، ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ آپ کو انڈر سٹیٹ کریں اور پھر یہ بھی کہ قاہرہ میں آپ کو تلاش کر لینا تقریباً ناممکن ہوگا۔“ عثمانی بتانے لگا۔

”کمانڈر نواز کا اندازہ درست ہی تھا۔ بہر حال تفصیلی گفتگو تم لوگوں سے پھر کبھی ہوگی فی الحال میرے کمرے کی چابی مجھے دے دو اور یہ بھی بتا دو کہ ذکیہ کس کمرے میں ہے؟“

عثمانی نے میرے کمرے کی چابی مجھے دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ ذکیہ کہاں ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی بتایا کہ ذکیہ کے کمرے میں بھی انٹرکام لگا دیا گیا ہے تاکہ یہ وقت ضرورت اسے کوئی پریشانی نہ ہو اور وہ ڈیوٹی روم وغیرہ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں گویا اب اپنے گھر اپنے لوگوں میں آ گئی تھی اور مجھے کوئی دھڑکا نہیں رہا تھا۔ یہ میری دنیا تھی میرے لوگ تھے یہاں میرا علم چلتا تھا اسی لیے ٹھکن کے باوجود میرا ذہن بہت ہلکا پھلکا تھا۔

ڈیوٹی روم سے نکل کر میں اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ آشنایا وادد نے جیسے طویل عرصے کے بعد میری پذیرائی کی پہلے میں نے اپنے چہرے سے ماریا وٹن کا میک اپ ختم کیا پھر الماری سے کپڑے نکال کر ہاتھ روم میں ہٹس گئی۔ نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد انٹرکام پر میں نے چکن روم سے رابطہ قائم کیا میں نے فی الحال صرف دو کپ چائے لانے کو کہا تھا، چکن روم کے بعد انٹرکام پر میں نے ذکیہ کا نمبر دبایا۔ دوسری جانب سے فوراً ہی ریسپور اٹھا لیا گیا اور مجھے اپنی بہن کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو!“

”ذکیہ! کیسی ہو تم؟ یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو؟“ میں نے کہا۔

”کون؟“ باجی..... آپ؟.....“ اس نے یقیناً میری آواز پہچان لی تھی۔

”ہاں میں ہی بول رہی ہوں۔“

”مگر..... مگر آپ کب..... کب یہاں آ گئیں؟..... مجھے..... مجھے تو کسی نے.....“

”ابھی کچھ دیر پہلے یہاں پہنچی ہوں۔ تم ایسا کرو کہ میرے کمرے میں آ جاؤ!“ یہ کہہ کر میں نے اپنے کمرے کا نمبر بتایا اور راستہ بھی سمجھایا۔ ”میں نے تمہارے لیے چائے بھی منگوائی ہے چائے پینے کے دوران میں ہم باتیں بھی کرتے رہیں گے۔“

”میں آ رہی ہوں..... آ رہی ہوں باجی! اس کے لہجے سے انتہائی خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں انٹرکام کا ریسپور رکھ کر ابھی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا پھر واپس آ کر ایک آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔

جلد ہی ذکیہ میرے کمرے میں آ گئی۔ میں نے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا وہ میرے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ میں جانتی تھی کہ یہ محبت کے آنسو ہیں۔

”پگلی!“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اب رونے کی کیا بات ہے ابھی تک بالکل بچی ہو تم۔“ میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے محبت سے کہا پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”چلو بیٹو شامش! ہاں یہ بات ہوئی نا!“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر میں بھی مسکرانے لگی۔ ”چلو بیٹھ جاؤ ادھر۔“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور پھر خود بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”باجی! وہ سب کیا تھا؟ کون لوگ تھے وہ؟“ ذکیہ قدرے توقف کے بعد مجھ سے پوچھنے لگی۔

”بھول جاؤ انہیں اب وہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔ ان واقعات کو ایک خواب سمجھ کر بھلا دو۔“ میں نے بات ٹال دی۔ ”یوں سمجھ لو کہ میرے کچھ دشمن مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے تمہیں ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور میں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی سمجھ گئیں!“

”جی ہاں سمجھ گئی“ آپ تو ہیں ہی شروع سے پراسرار“ ذکیہ کے مزاج کی فطری شگفتگی لوٹ آئی تھی۔ اس نے یہ جملہ کچھ اس طرح ادا کیا تھا کہ مجھے ہنسی آ گئی پھر ہم دونوں ہی ہنسنے لگیں۔ یوں کبھی کبھی بے فکری سے ہنسا بھی کتنا اچھا لگتا ہے۔

اسی دوران میں چائے آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے ذکیہ سے کہا۔ ”فی الحال احتیاطاً دو ایک میچہ تم قاہرہ نہ جاؤ تو بہتر ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ تم میرے ساتھ رہو تاکہ.....“

”این اونو!“ وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بندی ہرگز آپ کے ساتھ نہیں رہے گی!“

”وجہ؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”بور ہو گئی میں یہاں! مگر حضور کا حکم تھا کہ اس عمارت سے باہر نہیں نکلنا سو پڑے پڑے کمرے میں سڑتے رہے میں اس قید خانے میں رہنے پر ہرگز آمادہ نہیں۔“

”تو تمہیں یہاں رہنے کو کون کہہ رہا ہے پگلو!“

”پھر؟“

میرے کمرے میں آ گئے۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ ڈاکٹر رچرڈ کے نائب سولومن اور اس کے ساتھیوں کی کوئی رپورٹ ہے؟“
میرے پیچھے انہوں نے کوئی ہنگامہ تو نہیں کیا؟ وہ اب تک مفروضہ ہیں یا پکڑے گئے؟“ میں نے یکے بعد دیگرے کئی سوال کر ڈالے۔ کراچی کی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے کہ سولومن اور اس کے ساتھی یہاں کوئی ہنگامہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔“ کمانڈر نواز محتاط انداز میں بولا بلکہ میرا خیال تو یہ ہے یہاں پولیس اور دوسرے متعلقہ محکموں کے الرٹ ہو جانے کے سبب وہ اپنے ساتھیوں سمیت یہاں سے فرار ہو چکا ہے۔ گزشتہ دنوں مشرقی پاکستان کے کچھ شہروں میں اس طرح کی کچھ گڑبڑ ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب امریکی ایجنٹوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی ہے اور وہ اب غالباً وہاں گڑبڑ پھیلانا چاہتے ہیں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ سولومن اور اس کے ساتھی یہاں سے فرار ہو کر وہاں پہنچ گئے ہیں۔“

کمانڈر نواز کا تفصیلی جواب سن کر میں کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی ”میری غیر موجودگی میں شہر یار نے کوئی نئی چال نہیں چلی؟ ان دنوں وہ کہاں ہے؟“

”اسلام آباد میں۔“ کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ ”اس عرصے میں وہ کراچی نہیں آیا۔“

”کسی اہم شخصیت نے تو اس دوران میں مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”جی ہاں، محترم وزیر داخلہ نے ایک بار فون کیا تھا۔“

”کیا جواب دیا تم نے؟“

”یہ کہ آپ آؤٹ آف نیشن ہیں اور ہمیں آپ کے پروگرام کا علم نہیں۔“

”ان دنوں ان کا قیام کہاں ہے؟“

”وہ بھی اسلام آباد میں ہیں۔“

”میرے لیے کوئی پیغام چھوڑا انہوں نے؟“

”وہ صرف یہ کہ جب آپ کراچی آ جائیں تو ان سے رابطہ قائم کر لیں۔“

”میرا خیال ہے کمانڈر نواز کہ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، محترم وزیر داخلہ کو بھی اسے ذرا رخ سے یہی معلوم ہوا ہے۔ غالباً وہ مجھے اسی سلسلے میں باخبر کرنا چاہتے ہوں گے۔ بہر حال ممکن ہے کوئی اور ہی قصہ ہو میں ان سے بات کر لوں گی۔ ہاں یاد آیا وہ امریکی ایجنٹ جیفرسن ابھی تک گویا ہمارا مہمان ہے!“ میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

”جی ہاں، آپ نے ابھی تک اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“ کمانڈر نواز بولا۔

قاہرہ میں میرے ساتھ جو کچھ گزری اس سے میں تم دونوں کو ابھی آگاہ کر دوں گی تاکہ نئی صورتحال میں تم لوگ بے خبر نہ رہو اور میرے نئے اقدامات کو فالو کر سکو۔ فی الحال جیفرسن کا معاملہ درپیش ہے۔ اس کا فیصلہ میں آج ہی کر دوں گی۔ ”یہ کہنے کے بعد میں نے مختصر اُن دونوں کو قاہرہ میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا“ پھر کمانڈر نواز کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کمانڈر اب ڈاکٹر رچرڈ اور اس کے گرگے میرا پیچھا نہیں کریں گے؟ اور عثمانی تم بھی تو کچھ بولو!“

”جی ہاں، عثمانی فوراً اٹھا۔“ جو حالات آپ نے بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا

”میرے ساتھ کوٹھی میں رہنا۔“

”اور وہاں بھی یہ پابندی ہوگی کہ کوٹھی سے نہیں نکلتا؟“

”نہیں نا! اب ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں سنجیدہ ہو گئی۔ ”ویسے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی کہ میرے ہی پاس رکو، تم جانتی ہو کہ میں نے بھی تم پر پہرے نہیں بٹھائے اور تمہیں اپنے طور پر زندگی برتنے کی پوری آزادی دی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔“

”آپ تو سیریس ہونے لگیں۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”بکومت اور میری بات سنجیدگی سے سنو!“

”فرمائیے! ہم تو پیدا ہی سننے کے لیے ہوئے ہیں، چھوٹے جو ہوئے۔“

”تم اگر چاہو تو کچھ دن میرے ساتھ رہو اور پھر سوئزر لینڈ یا امریکہ وغیرہ گھوم آؤ۔ سیر و تفریح سے تمہاری صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ ان دنوں تم کچھ جھک گئی ہو۔“

”منظور ہے! خرچہ پانی آپ کے ذمے اس لیے کہ یہ آپ ہی کی تجویز بلکہ حکم ہے، بندی جس کی تعمیل کرے گی۔“

”اچھا بندی صاحبہ! آپ چائے پی چکی ہیں، اب یہاں سے ٹہل جائیں، کل ہم کوٹھی میں منتقل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک کے لیے یہ قید اور برداشت کر لیں۔“

میری بات سن کر وہ کرسی سے اٹھی اور مخصوص انداز میں جھک کر بولی۔ ”تھینک یو سوچ، باجی دی گریٹ!“

پھر وہ مرکز گویا لیفٹ رائٹ کرتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ذکیہ بچپن ہی سے خوش مزاج، شوخ اور شیریں، قاہرہ میں میری وجہ سے اسے جن غیر معمولی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، ان کے سبب اس کی ساری شوخی، رخصت ہو گئی تھی۔ اب کم از کم اس کی حد تک حالات معمول پر آ چکے تھے، اسے میری فکر تھی تو اب میں بھی اس تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اسی لیے اب خوش نظر آ رہی تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میرے دل سے دعا نکلی کہ وہ سدا اسی طرح خوش رہے۔ میں نے اس سے جو کچھ کہا تھا درست تھا، قاہرہ سے کراچی تک کے سفر میں میں نے جو اہم فیصلے کیے تھے ان میں سے ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ اب میں اپنی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کروں گی۔ اس کے لیے مجھے کیا نئے حفاظتی انتظامات کرنا تھے، میں ان پر بھی غور و خوض کر چکی تھی۔

کمانڈر نواز کے ڈیوٹی پر آنے سے پہلے ہی میں عثمانی کو مطلع کر چکی تھی کہ وہ رک جائے، سیل کے ان دونوں ذمے دار افراد سے مجھے رپورٹ بھی لینا تھی، انہیں ان حالات سے بھی آگاہ کرنا تھا جن سے میں نبرد آزما رہی تھی اور اپنے آئندہ لائحہ عمل سے بھی انہیں آگاہ کرنا تھا۔ پھر جب وقت مقررہ پر کمانڈر نواز آ گیا تو اس نے انٹرکام پر مجھے اپنی آمد سے مطلع کیا۔

عثمانی اور تم، دونوں میرے ہی کمرے میں آ جاؤ، ڈیوٹی روم میں کسی اور کی ڈیوٹی لگا دو۔ میں نے کمانڈر نواز سے کہا۔

”جی بہتر ہے، ہم دونوں آ رہے ہیں۔“ جواباً کمانڈر نواز بولا۔

میں نے انٹرکام کا ریسور رکھ دیا، دروازہ پہلے ہی میں کھول چکی تھی، وہ دونوں کچھ ہی دیر بعد

ہے کہ ڈاکٹر رچرڈ تجربے کی ناکامی کے بعد آپ کی طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ امریکی ایجنٹ بلا سبب آپ کا پیچھا نہیں کریں گے۔

میں نے دانستہ ان دونوں کو یہ بتانا ضروری سمجھا تھا کہ ڈاکٹر رچرڈ مجھ سے اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل بھی چاہتا تھا۔ ڈاکٹر رچرڈ کی بابت انہیں بہر حال یہ علم تھا کہ وہ لوز کیریکٹر بھی ہے۔ عثمانی اپنے خیال کا اظہار کر چکا تو میں نے کمانڈر نواز کو بولنے کا اشارہ کیا۔

”عثمانی کی رائے سے میں جزوی طور پر متفق ہوں“ کلیتہً نہیں۔“ کمانڈر نواز نے اپنی عادت کے مطابق محتاط الفاظ میں جواب دیا، پھر ذرا توقف سے اپنی بات کی وضاحت میں بولا۔ ”یہ بات بہر حال امریکی ایجنٹوں سے چھپی نہیں رہ سکے گی کہ تجربے کی ناکامی کے باوجود روسی ایجنٹ آپ کی طرف سے مایوس نہیں ہیں اور یہ کہ وہ آپ کے ذہن پر تجربات کرنا چاہتے ہیں، ممکن ہے جلد یا بدیر وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں کہ ابھی امکانات یکسر ختم نہیں ہوئے۔ یوں ایک بار پھر آپ کے سامنے دہرا خطرہ ہو گا۔ پھر وہ جو ایک مشکل ہے تاکہ بلی کھائے نہیں تو اوندھا دے۔ اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ میری مراد یہ ہے کہ ایک تو انتقاماً، دوم اس لیے کہ دوسرے ہلاک والے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائیں امریکی ایجنٹ خدانخواستہ آپ کو قتل کر سکتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ بلا سبب یہ در دوسری مول نہ لیں مگر اس کا امکان بہر حال ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات تو خیر بالکل واضح ہے کہ آپ ہمیشہ سے تحریب کاری اور ملک دشمن سرگرمیوں کے خلاف ہیں۔ وہ لوگ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر ملک میں انتشار پھیلاتا چاہتے ہیں اور آپ بہر حال قدم قدم پر انہیں ایسا کرنے سے روکتی رہی ہیں اور آئندہ بھی یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ وہ آپ کے ہاتھوں زک بھی اٹھا چکے ہیں اس صورت میں بھی ان سے ٹکراؤ ناگزیر ہے۔“ کمانڈر نواز یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کے تجزیے کو پوری توجہ اور انہماک سے سنا، درمیان میں کچھ نہ بولی۔ جب وہ اپنی بات پوری کر چکا تو میں نے کہا۔ ”کمانڈر! میری دانست میں تم نے تقریباً وہی باتیں کہیں جن پر میں غور کر چکی ہوں۔ تمہارے اوپر میرے تجزیے میں زیادہ فرق نہیں، لیکن حالات کا یہ صرف ایک رخ ہے۔ موشوروف کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ کیا وہ ایک ٹیلی پیٹھ ہونے کے سبب ڈاکٹر رچرڈ سے زیادہ خطرناک نہیں؟“

”جی ہاں، مگر ڈاکٹر رچرڈ اور اس میں فرق ہے، رویے اور طریقہ کار کا فرق! ڈاکٹر رچرڈ اور دیگر امریکی ایجنٹوں کی طرح اس نے اب تک اوجھے اور گھٹیا ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے۔ آئندہ کیا صورت رہے گی، ظاہر ہے قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جہاں تک اس کے ٹیلی پیٹھ ہونے کا تعلق ہے تو آپ خود بتا چکی ہیں کہ اس کے باوجود قاہرہ میں وہ آپ کو تلاش نہیں کر پایا اور یہ بھی کہ آپ کے ٹریپ میں آ گیا۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ آپ کا ذہن پڑھنے میں بھی ناکام رہا۔ گویا اگر آپ چاہیں تو وہ آپ کے ذہن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ ٹیلی پیٹھ کے فن کی بابت جہاں تک مجھے علم ہے، کسی ٹیلی پیٹھ کے لیے بھی ہر ذہن پڑھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔“

کمانڈر نواز کی بات سن کر مجھے ایک اچھا نکتہ سوجھ گیا جو میرے آئندہ لائحہ عمل میں مفید ثابت

ہو سکتا تھا۔ میں نے پہلے اسے اپنے آئندہ لائحہ عمل سے باخبر کیا، پھر بولی ”جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ اب میں اپنی کوٹھی ہی میں قیام کرنا چاہوں گی اور اس ضمن میں ضروری حفاظتی انتظامات سے بھی تمہیں آگاہ کر چکی ہوں۔ سو میں کوٹھی کے اندر اور باہر سیل کے ایسے ارکان کا انتخاب کرنا چاہتی ہوں جو مضبوط قوت ارادی کے مالک ہوں اور ان کے ذہن پڑھے نہ جاسکیں۔ ایسے ارکان کا انتخاب مشکل تو ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ حتمی طور پر ظاہر ہے کچھ بھی کسی کے متعلق نہیں کہا جاسکتا، لیکن ارکان کے گزشتہ ریکارڈ اور کارکردگی کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ انتخاب کسی حد تک ممکن ہے۔ ہاں ایک بات شاید میں بھول جاؤں، وہ بھی نوٹ کر لو! میرے ذاتی ملازمین کی فہرست سیل کے ریکارڈ میں ہوگی۔ اس میں ان کے نام پتے اور دیگر تفصیلات درج ہیں۔ میری خواہش ہے کہ اگر وہ لوگ دوبارہ میری ملازمت میں آنا پسند کریں تو انہیں تلاش کر کے میرے پاس کوٹھی پر بھیج دیا جائے۔ ویسے مجھے امید یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا، چاہے اس دوران میں وہ کہیں اور ہی ملازمت کیوں نہ کر چکے ہوں۔ تم لوگ میرے آئندہ اقدامات کے بارے میں سب کچھ سمجھ گئے یا کوئی ابہام باقی ہے؟ میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے وال کیا۔

”ابہام تو خیر کوئی نہیں..... کمانڈر نواز کچھ کہتے کہتے رک گیا۔“

”ہاں ہاں کہو نا بلا جھجک اپنے خیال کا اظہار کرو!“ میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”ممکن

ہے تمہارے خیال سے مجھے اتفاق نہ ہو، اس کے باوجود میں تمہاری بات سننا چاہتی ہوں۔“

”میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جس طرح گزشتہ کچھ عرصے سے آپ انتہائی محتاط قدم اٹھا رہی

نہیں..... یعنی یہ کہ آپ کا قیام زیادہ تر یہیں اسی عمارت میں رہے اگر مزید کچھ دن.....“

”میں سمجھ گئی تمہاری بات کمانڈر!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”تم مجھے ممکنہ خطرات سے بچانا

چاہتے ہو..... زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں صرف اتنا کہوں گی کہ اب یہاں سے میری طبیعت

اب چکی ہے خطرات کے باوجود میں کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں، وہی زندگی بسر کرنا چاہتی

ہوں جو پہلے بسر کرتی تھی۔ پھر بھی اگر کوئی ایسا وقت آ ہی گیا کہ مجھے دوبارہ روپوشی اختیار کرنا پڑی تو یقیناً

رو میں اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گی، بہر حال یہ عمارت بھی میری ہی ملکیت ہے اور اس سے وابستہ

انفراد بھی میرے اپنے ہیں۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ قدرے جذباتی ہو گیا۔ ”اب مطمئن

ہوئے تم؟“

وہ میرے جاں نثار تھے، مجھ سے محبت کرتے تھے، میرے لوگ تھے، میں ان کے جذبات کی قدر

راتی تھی۔ ہمیشہ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ مجھے خطرات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میرے سوال کے

واب میں کمانڈر نواز نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولا۔ ”انشاء اللہ کل دوپہر کے بعد تک آپ کے احکام

کی تعمیل ہو جائے گی اور آپ اپنی کوٹھی میں قیام کر سکیں گی۔“

”ٹھیک ہے، اب تم دونوں جا سکتے ہو۔“

میری اجازت ملتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ان کے سپرد خاصا کام کر دیا،

نہ بہر حال کل تک پورا ہونا تھا اس لیے انہیں مزید اپنے پاس بٹھائے رکھنا وقت کا زیاں ہی ہوتا۔ یوں

میں ابھی انہی باتوں پر غور و فکر کر رہی تھی کہ انٹرکام کی تیل بج اٹھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔

”بابی! میرا خیال ہے کہ جب سے آپ آئی ہیں اپنے کمرے ہی میں بند ہیں اور آپ کو باہر کے موسم کی کچھ خبر نہیں۔“ یہ ذکیہ تھی۔

”باہر کے موسم کو کیا ہوا؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”سچ بابی بڑی مزیدار پھوار پڑ رہی ہے۔ میں نے ابھی باہر نکل کر دیکھا تھا۔“ وہ بولی۔ ”ایسے میں کہیں گھونسنے چلیں نا۔“

”کھانا کھا لیا تم نے؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا، پھر شرارت بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ اگر اجازت دے دیں تو یہاں کے کچن میں جا کر پکڑے وغیرہ تل لوں۔“

”ذکیہ!“

”جی ارشاد۔“

”شرارت نہیں اس بات کو ذہن میں رکھو کہ یہ بہر حال گھر نہیں ہے۔“

”تو پھر گھر کب چلیں گی؟“ وہ بچوں کی طرح چٹختی۔

”تم سے کل تک صبر نہیں ہو رہا، کہا تھا میں نے کہ کل چلیں گے۔“

”اور آج کاروگرام آپ نے گول کر دیا؟“

”کون سا پروگرام؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آج تو کوئی پروگرام نہیں تھا!“

”نہیں تھا تو بنا لیجئے نا! پلیز بابی دی گریت۔“

”اچھا کہو کہاں چلو گی؟“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کہیں بھی..... بس یہاں سے باہر نکلنے کو جی چاہ رہا ہے۔ کچھ اور نہیں تو لانگ ڈرائیونگ ہی

سہی۔“

”وماغ درست ہے تمہارا؟ بارش کے موسم میں لانگ ڈرائیونگ.....؟ بارش تیز ہو گئی اور کہیں

گاڑی پھنس گئی پھر؟“

”پھر تو ج اور بھی مزہ آئے گا۔ گاڑی دین لاک کر کے چھوڑ دیں گے اور چھم چھم چھم بارش

میں بھگتے ہوئے.....“

”ملک عدم سدھار جائیں گے!“ میں نے بظاہر خفگی سے کہا۔ ”بے وقوف کہیں کی!“

”آپ ہی کی بہن ہوں اب جو چاہے کہہ لیں۔“

جواباً میں نے اسے ایک بار پھر ڈانٹ پلائی۔ وہ خاصے موڈ میں لگ رہی تھی اور میں اندازہ لگا

چکی تھی کہ اس وقت وہ ٹالے نہیں ٹلے گی۔ یہی سوچ کر میں نے کہا ”اچھا تم لباس وغیرہ تبدیل کر لو میں

خود تمہارے پاس آتی ہوں۔“

”تھیک یو دیری مچ!“ وہ اپنی کامیابی پر یقیناً خوش ہو گئی اور انٹرکام کا سلسلہ منقطع کر دیا، غالباً

بھی میں تمام ضروری باتیں کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ میں فون پر محترم وزیر داخلہ سے بھی بات کر لینا چاہتی تھی۔ ان دونوں کے جاتے ہی میں نے کمرہ اندر سے بند کر لیا اور انٹرکام پر ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کر کے اپنے کمرے میں موجود ٹیلی فون سیٹ پر لائن لے لی تاکہ براہ راست اسلام آباد سے بات کر سکوں۔ اس وقت ڈائریکٹ ڈائنگ کا نظام متعارف نہیں ہوا تھا۔ ٹرنک کال کے لیے خاصا خوار ہونا پڑتا تھا اور لائن فوراً نہیں ملتی تھی۔ میں نے ایکسیجنگ کو نمبر بتاتے ہوئے مصلحتاً یہ بھی بتا دیا کہ یہ کس کا نمبر ہے۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ آپریٹر مجھے جلدی لائن دے دے اور میری یہ توقع پوری ہوئی۔ نصف گھنٹے بعد ہی میں فون پر وزیر داخلہ سے بات کر رہی تھی۔

”ہاں ابھی عذرا تم کہاں آؤٹ آف سٹیشن تھیں؟“ انہوں نے حسب معمول شفقت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

”آؤٹ آف سٹیشن تھی اور آج ہی یہاں پہنچی ہوں۔“ میں ان سے بلا سبب رازداری برتنے سے اجتناب کرتی تھی۔ ”بس اچانک مصر جانا پڑ گیا۔ آپ فرمائیں میرے لائق کیا خدمت ہے؟ مجھے یہاں آتے ہی آپ کا پیغام مل گیا تھا۔“

”پرسوں غالباً میں کراچی پہنچوں ابھی کچھ طے نہیں ممکن ہے مجھے ڈھاکہ جانا پڑے۔ اگر وہاں کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا تو پھر کراچی یقیناً آؤں گا۔ تم سے جو بات کرتا ہے ذرا تفصیل طلب ہے اس لیے بالمشافہ ملاقات ضروری ہے۔ کل شام تک یہ طے ہو جائے گا کہ مجھے ہی ڈھاکہ جانا ہے یا بغیر میرے جائے کام چل سکتا ہے۔ تم اگر فون پر ایوٹیلبل نہ بھی ہو میں تمہارے لیے پیغام چھوڑ دوں گا۔“

میں سمجھ گئی کہ فون پر گفتگو کرنے سے وہ گریز کر رہے ہیں اس لیے بولی۔ ”بہتر ہے میں آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔ کوئی اور حکم؟“

”ایسے لہجے میں بات نہ کرو!“ انہوں نے مجھے محبت سے ڈانٹ دیا۔ ”یہ نہ بھولا کرو کہ میں تمہیں اپنی بچوں کی طرح سمجھتا ہوں اور بچوں کو حکم نہیں دیا جاتا! انہیں شفقت و محبت سے ہر بات سمجھائی جاتی ہے۔ خدا حافظ! اسی طرح کے الفاظ وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکے تھے۔“

پھر انہوں نے مجھے مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور میں مسکرا کر رہ گئی۔ ٹیلی فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور ان کے دورہ ڈھاکہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ دورہ بے سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ کمانڈر نواز کی رپورٹ کے مطابق مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں یقیناً کوئی گڑ بڑ شروع ہو چکی تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ خطہ زمین مغربی پاکستان سے انتہائی فاصلے پر ہونے کے باوجود ایک نظریاتی اخوت کا امین تھا۔ وہاں کی سیاسی صورتحال سے میں بخوبی واقف تھی۔ سرحدوں پر کیا صورت تھی اس سے بھی نا آشنا نہیں تھی۔ بنگال اپنے باطن اور ظاہر میں کیا تھا اس کا مشاہدہ بھی میں کئی بار کر چکی تھی۔ ماضی میں پاکستان کے لیے اس خطے نے کیا قربانیاں دی تھیں یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ وہاں کا افلاس بھی میری نظر میں تھا اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ ہمارے حریف اس خطے کے باسیوں کو کس طرح ایک پلانٹ کر سکتے ہیں؟

پراسرار ہے! تم کیوں یہ بور باتیں کر کے اپنی تفریح غارت کرنا چاہتی ہو..... چلو بیٹھو!“

”تو اس طرح تو نہ ڈانٹیں نا! یہ کہتے ہوئے وہ کار میں بیٹھ گئی“

”اور سنو ذکیہ! یہ بات میں انتہائی سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں کل کے بعد تم اس عمارت اس کے مینوں وغیرہ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کرو گئی! میں نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔“ اس عمارت کے محل وقوع کا ذکر بھی تمہاری زبان پر نہیں آتا چاہئے کسی بھی صورت میں اگر مجبور نہ ہوتی تو میں تمہیں قاہرہ سے ہرگز یہاں نہ بھیجتی۔“

”اب آپ مجھے اتنی بچی بھی نہ سمجھیں نا!“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”مجھے جس کار میں ایئر پورٹ سے یہاں لایا گیا تھا اس کے شیشے دھندلے تھے تاکہ مجھے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ عمارت کہاں واقع ہے! اب میں اتنا تو سمجھتی ہوں! آخر آپ کی چھوٹی بہن ہوں!“

”تو اے عزیز از جان! چھوٹی بہن صلیب! یہ موضوع ختم..... اب اچھی اچھی پیاری باتیں کرو۔“ میں نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا خاک پیاری پیاری باتیں کروں! موڈ تو آپ نے چوٹ کر دیا! آپ کے ساتھ یہی تو سمیت ہے کہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہو جاتی ہیں۔ بس سارے زمانے کو اپنی مرضی کے مطابق ہانا چاہتی ہیں۔ آدمی اچھا خاصا بنس بول رہا ہے کہ آپ اسے روئے پر مجبور کر دیں گی بلکہ دلائل سے یہ ثابت کر دیں گی کہ یہ وقت واقعی رونے ہی کا ہے اور دوسرے لمحے اس سے کہیں گی کہ تم ہنستے کیوں نہیں؟ نا تو صحت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ جو لوگ بغیر ہنسے اس عالم فانی سے کوچ کر جاتے ہیں قبر میں ان پر سخت عذاب ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جواب طلبی ہوتی ہے کہ اے بندے یا بندی جب ہم نے تمہیں ہنسنے کی صلاحیت عطا کی تھی تو ساری زندگی تو روتا کیوں رہا؟“

ظاہر ہے کہ میں ذکیہ کی ان باتوں پر ہنس ہی سکتی تھی سو ہنستی رہی۔ ذکیہ بھی میرا ساتھ دیتی رہی چھوٹی ہونے کے باوجود میں نے اسے اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ کھل کر مجھ پر تنقید کر سکے۔ دل میں غبار رکھنے سے یہ بہتر ہے کہ کسی طرح کٹھار کس ہو جائے بہر حال اب ذکیہ دوبارہ ڈھب پر آگئی تھی۔

موسم واقعی اچھا تھا۔ ذکیہ کے ساتھ میں بھی انجوائے کر رہی تھی۔ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی امارت اب بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ میں دانستہ سلو ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

”بھوک تو نہیں لگ رہی تمہیں؟“ میں نے ایک سڑک پر گاڑی موڑتے ہوئے ذکیہ سے پوچھا۔

”ہاں لگ تو رہی ہے مگر..... مگر آپ مامیں گی نہیں۔“

”کیا نہیں مامیں گی! میں نے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے کہا پھر اس کی عادت کو مد نظر رکھتے ہوئے بولی ”اگر تم کسی ٹھیلے کے پاس گاڑی رکوا کر چاٹ واٹ کھانے کے موڈ میں ہو تو میں واقعی تمہاری بات نہیں مانوں گی۔“

”کر دیا نا آخر آپ نے سارے ڈرامے کا ڈرامہ سین..... ویسے آپ یہ کدھر چل رہی

اس خوف سے کہ کہیں میں اپنا ارادہ نہ بدل دوں!

میں نے انہی باتوں سے بچنے کے لیے اب تک گھر داری کا جھگڑا نہیں پالا تھا اور ذکیہ کو بھی خود سے دور دور رکھا تھا۔ میرے سامنے زندگی کے کچھ اور مقاصد تھے جن کے حصول کی خاطر میں کسی کو بھی اپنے پاؤں کی زنجیر بنانا نہیں چاہتی تھی۔ میرا دل بھی جذبات سے خالی نہیں تھا اور نہ یہ کہ میں محسوسات سے عاری تھی مگر حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔ بقول فیض احمد فیض میں اس کی قائل تھی کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا! کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں زندگی کے متعلق اس شخصیت کے تصور و خیال کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ پہلا درجہ خیال ہی کا ہے اس کے بعد عمل کی نوبت آتی ہے گویا بالفاظ دیگر آدمی کا مکمل اس کے خیال ہی کا پرتو ہوتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ میرے ساتھ تھا۔ سوائے ایثار و قربانی کا نام دیا جائے یا میری مجبوری تصور کیا جائے میں بہر حال اپنے خیال و فکر کے دائرے کو نہیں توڑ سکتی تھی۔ اسی دائرے میں رہ کر میں زندگی کے تمام رنگ محسوس کر رہی تھی۔ رنگ تو یوں بھی میری کمزوری تھے۔ مصوری سے میری دلچسپی بے سبب تو نہیں تھی! لیکن کبھی میں نے اپنے اس شوق کو رسوا نہیں کیا تھا۔ میں اس سے آگاہ تھی کہ شوق بہ ہر رنگ رقیب سرد ساماں ہوتا ہے! ذکیہ کو بھی بہت سے شوق تھے جن میں سیر و تفریح اور سیاحت کا شوق سرفہرست تھا۔ میں اس کے مزاج سے واقف تھی اسی لیے اس وقت اس کی بات مان لی تھی۔

حفاظتی انتظامات کے بارے میں کمانڈر نواز کو میں نے جو ہدایات دی تھیں انہیں کے پیش نظر اسے آگاہ کرنا ضروری تھا کہ میں ذکیہ کے ساتھ کہاں جا رہی ہوں! سو لباس تبدیل کرنے سے پہلے میں نے اسے انٹرکام پر مطلع کر دیا۔ جب میں لباس تبدیل کر کے ذکیہ کے کمرے میں پہنچی تو وہ مجھے تیار ملی۔

”پھوار پڑنا تو بند ہو گئی بوا! کیا ارادے ہیں؟“ میں نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔ ”کیوں نہ پروگرام منسوخ کر دیا جائے؟“

”مجھے معلوم ہے آپ مجھے اپنی عادت کے مطابق ستار رہی ہیں ورنہ یہاں تک آنے کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتیں۔ بس اب چلیں! کراچی کے موسم اور کراچی کے بندے بند یوں سے تنگ آ کر ہی تو میں نے قاہرہ میں ڈیرا ڈال رکھا ہے جہاں نہ موسم بے اعتبار ہے نہ بندے!“

”بس رہنے دو اپنے قاہرہ کی تعریفیں!“ میں نے اس کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

”دیکھا ہے تمہارا قاہرہ بھی اور وہاں کے بندے بھی!“ باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں ڈیوٹی روم تک پہنچ گئے۔ کمانڈر نواز نے سپورٹس کار کی چابی میری طرف بڑھادی۔

”شکریہ!“ میں نے چابی لیتے ہوئے کہا اور پھر ڈیوٹی روم سے باہر نکل آئی۔

”یہ جو آپ کے بندے ہیں سب کے سب آپ ہی کی طرح پراسرار ہیں۔“ ذکیہ نے سپورٹس کار کی طرف بڑھتے ہوئے تہمرہ کیا۔

”ہوں گے تمہیں ان سے کیا لینا! میں نے اسے ٹال دیا اور کار کے قریب پہنچ کر اس کا دروازہ کھولنے لگی۔

”ویسے باجی یہ عمارت بھی کم پراسرار نہیں ہے۔“

”تو آخر میں کیا کروں ہے تو ہونے دو نا! تمہارے ذہن پر تو بس ایک لفظ مسلط ہو گیا ہے یہ

ملک دلاور.....“

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ذکیہ بی نے بولنے میں پہل کی ”میرا خیال ہے ملک جی کہ رکی جملوں کا تبادلہ آرام سے بیٹھ جانے کے بعد ہو سکتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو کم از کم میں بیٹھ جاؤں؟“

”ضرور ضرور! تشریف رکھیے!“ ملک دلاور نے قریب ہی پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ملک دلاور پھر ذکیہ سے مخاطب ہوا۔ ”اگر آپ اسے رکی بات نہ کہیں تو مجھے بیچ آپ کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ آج پہلی مرتبہ آپ کی باجی جی نے مجھے اپنے کسی رشتے دار سے ملوایا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر شریسی مسکراہٹ آ گئی۔

ملک دلاور مزید کچھ کہنے والا تھا کہ ذکیہ بول اٹھی ”معاف کیجئے گا ملک جی میں ان کی چھوٹی بہن ہوں رشتے دار نہیں۔“

”میرا تو خیال تھا کہ بہن سے بھی رشتہ ہوتا ہی ہے اسی لیے.....“

”تم لوگ یہ کیا باتیں لے بیٹھے!“ مجھے بولتا ہی پڑا اور میں نے ملک دلاور سے پوچھا ”کیا بارہوتم؟“

میرا مطلب ہے کہ معمولی بخار و خار ہے یا.....“

”بس یہی سمجھ لیں کوئی خاص بات نہیں۔“

”تم ٹال کیوں رہے ہو مجھے بتاؤ نا ڈاکٹروں نے کیا تشخیص کیا ہے؟“

”یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ بخار کوئی بیماری نہیں بلکہ کسی نہ کسی بیماری کی علامت ہوتا ہے۔ تاہم اس کا سبب معلوم نہیں ہوا ابھی ٹیسٹ وغیرہ ہو رہے ہیں بخار ٹوٹ نہیں رہا..... خیر چھوڑیں اس ذکر کو۔“

نہن بھر یہی قصہ کہانی ہوتی رہتی ہے آپ سنائیں بڑے دن بعد اس فکیر کا خیال آیا!

میں یہ بات نوٹ کر رہی تھی کہ ملک دلاور بہت سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا کہ کہیں کوئی ایسا لفظ نہ بول جائے جس میں قاف آتا ہو مگر غچہ کھا ہی گیا۔ باتوں کی رو میں اور کسی قدر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے وہ قصے کو ”کصہ“ اور ”فقیر“ کو ”فکیر“ کہہ گیا تھا۔ میں عموماً اس مسئلے میں اسے نہیں بخشتی تھی، لیکن اس وقت بیماری کا مارجن دیتے ہوئے میں نے براہ راست ”کھنٹائی“ سے گریز کیا اور بولی۔ ”ملک دلاور تمہاری بات سن کر اس وقت ایک بہت پرانا لطیفہ یاد آ رہا ہے مگر بغض لطیفے پرانے ہونے کے باوجود یہ قصصیتوں کے حوالے سے نئے ہو جاتے ہیں تم بھی سنو ذکیہ بڑا مزیدار لطیفہ ہے۔“ یہ کہتے ہی میں نے بغیر لطیفہ سنانے لگی۔ ”ایک کشتی میں ایک امیر اور ایک فقیر سفر کر رہے تھے۔ فقیر کے سر میں شدید ناراض تھی۔ وہ بار بار دونوں ہاتھوں سے اپنے گھنجے سر کو کھجھار رہا تھا۔ امیر کی طبع نازک پر یہ منظر بہت گراں آ رہا تھا۔ آخر اس نے ایک راہ نکال لی۔ اس نے اشرفیوں سے بھری تھیلی نکالی اور فقیر سے کہا کہ اگر اس بے کنارے تک پہنچنے سے پہلے تم سر نہ کھجاؤ تو میں تمہیں دو اشرفیاں دے سکتا ہوں فقیر فوراً اس راہی ہو گیا اور امیر سے دو اشرفیاں لے لیں مگر ذرا ہی دیر بعد پھر سخت خارش ہوئی اور اس کا ہاتھ سر کی طرف بڑھنے لگا۔ امیر نے اسے ٹوکا اور پھر مزید دو اشرفیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ فقیر نے کسی نہ کسی طرح اپنے اوپر قابو پالیا اور سر کھجانے سے باز رہا۔ ایسا ہی وقفے وقفے سے دوسرے مزید ہوا۔ فقیر اشرفیاں

ہیں؟“

”کیوں کیا تم کراچی کے راستے بھول گئیں؟“

”یاد تو ہیں راستے لیکن مجھے کچھ گڑ بڑ لگ رہی ہے۔ کہیں آپ مجھے سیر سپاٹا کرانے کے

بہانے اپنے کسی کام سے تو نہیں جا رہیں؟“

”ایسا نہیں ہے بے وقوف! میں تمہاری ہی خاطر باہر نکلی ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا

”ایک شناسا ہے میرا بہت دلچسپ شخصیت کا مالک ہے شگفتہ مزاج اور ذہین..... کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا تعلقات محض واقفیت کی حد تک ہیں وہ بھی ایک طرفہ۔ میں تو اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں مگر وہ میرے متعلق بہت کم جانتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ جب میں یکسانی سے اوب جاتی ہوں تو کبھی کبھار اس سے مل لیتی ہوں۔“ پھر میں نے اسے ملک دلاور کے بارے میں بطور تعارف مختصراً کچھ باتیں بتا دیں اور پھر مزید بولی ”اس وقت ہم اسی کے ہاں چل رہے ہیں بہر حال میں یہ ذمہ ضرور لے سکتی ہوں کہ تم وہاں بور نہیں ہو گی اور یہ تمہیں خود ہی وہاں پہنچ کر معلوم ہو جائے گا کہ مجھے اس سے کوئی کام نہیں تھا۔“

”تو گویا اس شخص کی حیثیت درباری مسخرے کی سی ہے۔ جب آپ بور ہوں تو آپ کا موڈ بحال کر دے۔“ ذکیہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اب تم اسے اتنا انڈراستیمٹ بھی نہ کرو میرے باب میں وہ پر خلوص ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں عورت اور مرد کے درمیان دوستی کو میووب تصور نہ کیا جاتا اسے کوئی اور معنی نہ پہناتے جاتے تو میں اس شخص کو دوست کہنے میں زیادہ عار محسوس نہیں کرتی۔“

ایسی ہی باتوں میں راستہ کٹ گیا اور میں ملک دلاور کی کوشی تک پہنچ گئی۔ ملک دلاور کے متعلق میں نے ذکیہ کو یوں بھی پہلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ کہیں وہ پٹری سے اتر جائے تو ذکیہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

ملک دلاور کے ملازم نے ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کی بجائے بیڈ روم میں پہنچا دیا۔ اس کا سبب ملازم پہلے ہی بتا چکا تھا ملک دلاور بیمار تھا ہم دونوں خواب گاہ میں داخل ہوئے تو وہ ایزی چیئر پر بیروں پہ کبل ڈالے کسی سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سلکتی ہوئی سگریٹ تھی چہرے سے قدرے استحالہ نمایاں تھا۔ اس عالم میں وہ ملک دلاور کی بجائے کوئی اور ہی شخص معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر چونکا وٹ گیا اور پھر کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

”بیٹھے رہو!“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی اس پر ایک فقرہ چست کر دیا۔

”آج تو تم خاصے دیوداس معلوم ہو رہے ہو“ فقرہ چست کرنے سے میرا مقصد شخص یہ تھا کہ اگر وہ بیماری سے بیزار ہو چکا ہے تو اپنی اصل مزاجی کیفیت کی طرف لوٹ آئے۔

وہ بھلا کہاں فقرہ ہضم کرنے والوں میں سے تھا فوراً بول اٹھا ”دراصل دیوداسیاں نہ ہوں تو دیوداس بننا ہی.....“

”اس سے ملو یہ میری چھوٹی بہن ذکیہ ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور ذکیہ یہ

عشق کرتا ہو۔ ایسی صورت میں یہ اطلاع اس کے لیے بہر حال صدمے کا سبب بنتی۔ عشق کی اس سچی یا جھوٹی کہانی پر اگر میں یقین نہ کرتی اور مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ اس شخص نے مجھ سے پناہ مانگی ہے تو معاملہ بالکل سیدھا سادھا تھا۔ میرے نزدیک وہ بہر حال مجرم تھا۔ وہ ان لوگوں کا ساتھی تھا جو میرے ملک کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں ملوث تھے۔ سیل کے ارکان نے اسے اس وقت پکڑا تھا جب وہ میری کوشی میں دبی، ہم پھینکنے والا تھا۔ اسے میں نے اب تک قیدی کی حیثیت سے اس لیے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں رکھا ہوا تھا کہ وقت اور موقع ملنے پر بطور مہرہ اپنے حریفوں کے خلاف اس کے ذریعے کوئی چال چل سکوں۔ نئی صورتحال میں وہ میرے لیے زیادہ اہم نہیں رہا تھا۔ مہرے تو اسی وقت تک اہم ہوتے ہیں جب تک بساط پر ہوں۔ جیفرسن کی حیثیت اب ایک بٹے ہوئے مہرے کی سی تھی۔ میں نے اس لیے اس شب یہ فیصلہ کیا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر جیفرسن کو قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اپنے اس فیصلے سے میں نے کمائنڈر نواز کو بھی آگاہ کر دیا۔

دوسرے دن صبح میں دیر سے سوکر اٹھی، کمائنڈر نواز میرے لیے پیغام چھوڑ کر جا چکا تھا۔ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے کوشی میں میری منتقلی کے تقریباً تمام انتظامات وہ مکمل کر چکا تھا۔ اس کی جگہ اب عثمانی چارج لے چکا تھا اور بقیہ جو انتظامات رہ گئے تھے اس کے سپرد تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ پروگرام کے مطابق دوپہر کے بعد آپ یہاں سے اپنی کوشی کے لیے روانہ ہوئیں گی۔ پھر جب میں اسی دن دوپہر کو اپنے کمرے میں ذکیہ کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی تو انٹرکام پر عثمانی نے مجھے گویا ”اوکے“ کا سگنل دے دیا۔ ذکیہ کو میں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ غالباً کھانا کھا کر ہم لوگ یہاں سے چل دیں گے۔ یہ سن کر اس نے زور سے ”اللہ تبارک“ کہا تھا اور مجھے ہنسی آگئی تھی۔

کھانا کھا کر اور پھر چائے پینے کے بعد میں ذکیہ کو اپنے ساتھ لیے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے ڈیفنس روانہ ہو گئی۔

ڈیفنس میں جب اپنی کوشی کے گیٹ پر میں نے کارروائی اور جب ہارن بجانے پر گیٹ کھل گیا تو مجھے یوں لگا جیسے سب کچھ جوں کا توں ہو۔ میں نے بس ایک نظر چوکیدار کے چہرے پر ڈالی تھی جو ظاہر ہے سیل ہی کا ایک رکن تھا۔ مجھے علم تھا کہ عارضی طور پر میرے تمام ذاتی ملازمین کی جگہ سیل کے ارکان لے چکے ہیں۔ کارگیراج میں کھڑی کرنے کے بعد میں ذکیہ کے ساتھ اندر کوشی میں پہنچی تو کمائنڈر نواز کے ذہن کی داؤد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ کوشی ایک عرصے خالی پڑی رہی ہے۔

اپنے بیڈ روم کے برابر والا بیڈ روم میں نے ذکیہ کے حوالے کر دیا جو عموماً خالی پڑا رہتا تھا۔ ذکیہ وہاں اپنا سامان سیٹ کرانے لگی اور میں، کوشی کا ایک راؤنڈ لینے باہر آ گئی۔ کوشی کے نئے حفاظتی انتظامات میں مجھے بظاہر کوئی نقص نظر نہ آیا۔

شام ساڑھے پانچ بجے فون پر محترم وزیر داخلہ سے خود میری بات ہو گئی۔ ڈھا کہ جانے کا پروگرام توقع کے مطابق منسوخ ہو گیا تھا اور وہ کل صبح کی ایک فلائٹ سے کراچی پہنچ رہے تھے۔ فون پر انہوں نے آئندہ روز کی ملاقات کفرم کردی تھی۔ یہ ملاقات کل دوپہر سے پہلے گیارہ بجے اسٹیٹ گیٹ ہاؤس میں ہونا تھی، میری ہی ہدایت پر انہیں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے کوشی کا فون نمبر دے دیا گیا تھا اور

کمائنڈر ہاؤس کشتی کنارے کے قریب پہنچ گئی۔ فقیر کی قوت برداشت اب جواب دے چکی تھی وہ چیخ اٹھا اسے امیر! چاہے تو مجھے اشرفیوں سے بھری پوری تھیلی دے دے میں سر ضرور کھجاؤں گا، پھر وہ فکیر اشرفیاں پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر کھجانے لگا۔

ذکیہ نے یقیناً یہ لطیفہ نہیں سنا تھا اس لیے وہ خوب زور سے ہنسی۔ ملک دلاور بھی خجالت آمیز انداز میں ہنسنے لگا اور میں تو لطیفہ سنا کر ہنس ہی رہی تھی۔

آج تم پر پے در پے پوائنٹ ہو رہے ہیں اس لیے مزہ نہیں آ رہا، ہم لوگ چلتے ہیں۔” میں ہنسنے ہوئے کہنے لگی بقیہ آئندہ سہی۔

”مگر ابھی تو آئی ہیں آپ..... اور پھر یہ کیا سوچیں گی کہ چائے تک کو نہیں پوچھا۔ اس نے ذکیہ کی طرف اشارہ کیا۔“ ایسا بھی کیا ہوائی دورہ۔“

میں نے محسوس کیا کہ ذکیہ مزید رکنے کے موڈ میں ہے اس لیے صرف چائے کی حد تک اس کی بات مان لی۔ خلاف معمولی چائے لے کر آنے والی ایک بڑی بی بی تھیں، جنہیں پہلے میں نے اس گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ان بڑی بی کا چہرہ مانوس سا لگا جیسے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہو۔ اس شے کی تصدیق یوں بھی ہو گئی کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونکی تھیں۔ بی بی ٹالی سے کہنے لگی، چائے دانی وغیرہ نکال کر ہمارے سامنے رکھنے کے بعد بڑی بی فوراً ہی کمرے سے چلی گئی تھیں۔ ذکیہ ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں ان بڑی بی کے بارے میں ملک دلاور سے کچھ پوچھ گچھ کر لیتی۔ بہر حال کچھ دیر کو میرا ذہن الجھ سا گیا۔ چائے پینے کے دوران میں بھی میری طرف سے اور دلاور کی جانب سے تھوڑی بہت فقرے بازی ہوتی رہی اور ذکیہ بھی پیچھے نہ رہی مگر میرا ذہن انہی بڑی بی میں الجھا رہا۔ وہ چہرہ میں نے کب اور کہاں دیکھا تھا، مجھے یاد نہیں آ رہا تھا اور یہی میری الجھن کا سبب تھا۔

ملک دلاور کی کوشی سے واپسی میں دانستہ میں نے ان بڑی بی کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ ہوں گی کوئی بی الحال مجھے دیگر اہم مسائل درپیش ہیں۔ میری توجہ ان مسائل کی طرف ہونی چاہئے۔ انہی میں سے ایک مسئلہ باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کا تھا۔ میں نے کمائنڈر نواز سے کہا تھا کہ میں آج اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لوں گی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر واپس آنے کے بعد میں نے اور ذکیہ نے رات کا کھانا ساتھ کھایا، پھر میں ذکیہ کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر چلی آئی۔

جیفرسن کی حسین و جمیل بیوی سوزی قاہرہ میں اپنی بے راہ روی کے سبب ڈاکٹر رچرڈ کے ہاتھوں ہلاک ہو چکی تھی۔ جرمن سائنس دان شیفرڈ کے ساتھ میں نے بھی اسے پرانے قاہرہ کی ایک عمارت میں دیکھا تھا، میں ذکیہ کی تلاش میں وہاں پہنچی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ نے کسی سبب شیفرڈ کو تو بخش دیا تھا لیکن سوزی کی بے وفائی وہ برداشت نہیں کر سکا تھا ان واقعات کا تفصیلی ذکر میں گزشتہ قسطوں میں کر چکی ہوں۔ جیفرسن اس سبب ڈاکٹر رچرڈ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ جیفرسن کی اس کہانی میں کتنی حقیقت تھی اور وہ کس غرض سے میری پناہ میں آیا تھا اس سے قطع نظر میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیوی کو قتل کیا جا چکا ہے۔ بہر حال یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ بے وفائی کے باوجود حقیقتاً اپنی بیوی سے

میں ان کے فون کی منتظر تھی۔ ذکیہ کو میں نے پہلے ہی سونے کا بہانہ کر کے ٹال دیا تھا۔
وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی آئندہ روز میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچ گئی۔ ٹھیک گیارہ بجے
مجھے محترم وزیر داخلہ کے سیکرٹری نے اندر بھیج دیا۔ عرصہ دراز کے بعد ان سے میری بالمشافہ ملاقات ہو رہی
تھی۔ انہوں نے بڑی محبت و شفقت کا اظہار کیا۔ پھر گویا ہم دونوں ہی اصل موضوع پر آ گئے۔
”تمہارا کیا خیال ہے عذرا، غیر ملکی تخریب کاراب کہاں سرگرم عمل ہوں گے؟“ انہوں نے
سوال کیا۔

”میرے علم و اطلاع کے مطابق وہ لوگ یہاں سے راہ فرار اختیار کرنے کے بعد اب مشرقی
پاکستان پہنچ گئے ہیں۔“ میں نے واضح الفاظ میں جواب دیا۔
”ہاں وہاں کچھ گڑبڑ ہے، مگر ابھی حتمی طور پر کوئی بات سامنے نہیں آئی کہ واقعی یہ وہی لوگ
ہیں جو یہاں گڑبڑ پھیلاتا چاہتے تھے۔ ہاں اس غیر ملکی ایجنٹ سولومن کے متعلق ایک رپورٹ ضرور ہے کہ
اسے ڈھاکہ میں دیکھا گیا ہے، مگر وہ پکڑا نہیں جا سکا۔ دراصل میری خواہش یہ تھی کہ ہم اپنے طور پر تو
جو کچھ کر رہے ہیں، ٹھیک ہے تم بھی ذرا اس معاملے پر غور کر لو اور تمہارے لیے ممکن ہو تو خود ڈھاکہ چلی
جاؤ۔ تم اگر چاہو گی تو تمہارے لیے حفاظتی انتظامات کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔ میں اس لیے بھی کہہ
رہا ہوں کہ تمہارے مزاج سے واقف ہوں تم دو ایک بار پہلے بھی چند معاملات میں انکار کر چکی ہو کہ تمہیں
کسی قسم کی مدد درکار نہیں۔ ہاں بولو مجھے دو ٹوک جواب چاہئے۔“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری
طرف دیکھا۔

یہ تو خود آپ بھی جانتے ہیں کہ میں آپ کا حکم ٹالنے کی جسارت نہیں کر سکتی۔“ میں نے جواباً
کہا۔ اس بار بھی آپ سے صرف یہی درخواست ہے کہ مجھے اپنے طور پر کام کرنے کی اجازت دے
دیں۔“

”تم آخر یہ تکلف آمیز زبان استعمال کرنے سے باز کیوں نہیں آتیں!“ انہوں نے محبت
آمیز خنکی سے کہا۔

”اس لیے کہ میں بہر حال آپ کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں اور مجھے بچپن ہی سے بزرگوں کا ادب
کرنا سکھایا گیا ہے۔“

وہ میری بات سن کر مسکرائے، پھر بولے ”اچھا تو پھر تم کب تک وہاں جا سکو گی؟“
”فی الوقت تو میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن یہ طے ہے کہ ایز پاسیل میں ڈھاکہ پہنچوں
گی۔ یوں بھی اس معاملے میں پہل میری ہی طرف سے ہوئی تھی۔ میری خود بھی یہی خواہش ہے کہ مجرم
جلد از جلد پکڑے جائیں۔“

”کیا میں امید رکھوں کہ تم اس سلسلے میں مجھ سے رابطہ قائم رکھو گی؟“
”میری صاف گوئی کو معاف کیجئے گا، میں یہ وعدہ کرنے سے قاصر ہوں، بہر حال اس میں کوئی
کلام نہیں کہ اپنے وطن کے خلاف کی جانے والی کسی بھی سازش اور تخریب کاری کو حتی الامکان کامیاب نہیں
ہونے دوں گی اور اس سلسلے میں مجھے جب بھی قانون کا سہارا لینے کی ضرورت پیش آئی تو اس سے گریز

نہیں کروں گی۔“ میں نے پر جوش اور پریقین لہجے میں کہا۔
”ہاں یاد آ یا صدر مملکت سے میں نے بات کر لی تھی وہ تمہیں وقت دینے کے لیے راضی ہیں۔
اشارتا میں نے ان سے کہا تھا کہ ملک میں تخریب کاری کے واقعات کا سبب ہماری غیر جانبدارانہ خارجہ
پالیسی ہے اور ایک سپر پاور ایسا نہیں چاہتی۔ شہریار کے بارے میں بھی ان سے میری بات ہو چکی ہے۔
انہوں نے اس سلسلے میں مجھے تحقیقات کی اجازت دے دی ہے۔ صدر مملکت نے مجھ سے کہا ہے، یہ معاملہ
کیونکہ خارجہ پالیسی سے متعلق ہے اس لیے بہتر ہے کہ عذرا خان پہلے وزیر خارجہ سے مل لے۔“

”تو کیا وہ میرے نام سے آشنا ہیں؟“ میرے لہجے میں حیرت بھی تھی اور ایک نوع کی طمانیت بھی!
”کیوں نہیں! کئی بار تو وہ مختلف معاملات میں میری زبانی بھی تمہارا نام سن چکے ہیں۔ میں
انہیں یہ بھی بتا چکا ہوں کہ تم میری اپنی بچیوں کی طرح ہو۔“ ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ ”ہاں
تمہیں یہ بتا دوں کہ صدر مملکت آزادانہ خارجہ پالیسی کے سلسلے میں ہر رکاوٹ کو ختم کرنے کے حق میں ہیں
خواہ وہ کسی بھی سطح پر کیوں نہ ہو!“

”اگر ایسا ہے تو پھر نہ مجھے فی الحال محترم وزیر خارجہ سے ملنے کی ضرورت ہے نہ صدر مملکت
سے۔ کبھی کسی مرحلے پر مجھے یہ ضرورت پیش آئی تو میں آپ سے عرض کر دوں گی۔“ میں نے مودب لہجے
میں کہا۔

اسی وقت صوفے کے قریب ہی ایک تپائی پر رکھے ہوئے انٹرکام کی بیل بج اٹھی۔ محترم وزیر
داخلہ نے ذرا سا آگے جھک کر انٹرکام کا ریسپونڈ اٹھا لیا، پھر دوسری جانب سے کچھ سن کر کہا۔ ”ہاں ہاں
اب بھیج دو!..... ٹھیک ہے مجھے یاد ہے۔“

ان کے آخری الفاظ سن کر میرے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال آیا کہ غالباً انہیں کہیں جانا
ہے یا کسی اور سے بھی ملنا ہے۔ پھر یہی بات میری زبان پر بھی آ گئی۔

”تو پھر میں اجازت چاہوں گی۔“
”ابھی خاصا وقت ہے چائے پی کر جانا! آ رہی ہے چائے اور ابھی تو مجھے تمہاری امانت بھی تم
بک پہنچانا ہے۔“

”امانت!“

”صدر مملکت نے یہ امانت مجھے تم تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔“
یہ کہہ کر انہوں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک مہر بند لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا
دیا۔ ”اسے احتیاط سے اپنے پرس میں رکھ لو۔“

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ مہر بند لفافہ تھام لیا۔ اس پر ایوان صدر کی مہر تھی۔ یہ
بات میرے لیے انتہائی اہمیت کی حامل تھی کہ صدر مملکت نے میرے لیے کوئی مہر بند پیغام بھیجا تھا، وہ بھی
ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں جو خود بھی میرے لیے محترم تھی میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے
ہوئے وہ لفافہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔

مقام گلبرگہ شریف کا رہنے والا تھا۔ اس کا پورا نام عبدالسلام عثمانی تھا۔ مگر خود میں اور سیل کے دوسرے ارکان اسے صرف عثمانی ہی کہتے تھے۔ وہ بھی بڑی خوبیوں کا مالک تھا ریاست حیدر آباد کو جب ہندوستانی حکومت ہندوستان میں ضم کر رہی تھی تو وہ کسی طرح بچ کر وہاں سے نکل آیا اور اب نظر بانی طور پر وہ ایک محب وطن پاکستانی تھا۔ میں نے اپنی آپ بیتی کی ابتدائی قسط میں یہ بات لکھی تھی کہ میرے آپ بیتی پڑھتے ہوئے خود بخود میری شخصیت کے اسرار آپ پر کھلتے جائیں گے تو نہ صرف میں اپنی شخصیت سے پردے اٹھاتی جاؤں گی بلکہ مجھ سے متعلق جو افراد ہیں ان کے بارے میں بھی آپ رفتہ رفتہ سب کچھ جان جائیں گے۔ ابھی میں نے اوپر جو کچھ لکھا اس کا مقصد محض یہی ہے۔ بات یہ ہے کہ کہا اور لکھا کچھ بھی جائے مقصد کچھ بھی ہو لوگ اسے اپنے مفروضات اور تعقبات ہی کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے قطع نظر ماضی میں مجھ پر جو کچھ بیتی ہے وہ رقم کرتی رہوں گی۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے میرے حافظے کو بھی آپ خداداد صلاحیت ہی کہہ سکتے ہیں۔

اس روز میں اسٹیٹ گیٹ ہاؤس سے لوٹ کر اپنی کوٹھی پہنچی تو جاتے ہی اپنے کمرے میں بند ہو گئی مجھے مہربند لافاذ کھولنے کی جلدی تھی۔ احتیاط کے ساتھ لافاذ کھول کر کیا ہوا کاغذ میں نے نکال لیا۔ انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی تحریر پر میں نے ایک نظر ڈالی اور پھر عبارت کے آخر میں صدر مملکت کے دستخط دیکھے۔ صدر مملکت کی طرف سے وہ کوئی پیغام نہیں بلکہ میرے لیے ایک اعزاز تھا مجھے کچھ خصوصی اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ مجھے یہ اعزاز میرے مشفق کے ایما پر دیا گیا ہے جن کے ذریعے مجھے یہ لافاذ ملا ہے۔ ان اختیارات کی رو سے مجھے کم از کم پاکستان کی حد تک کسی بھی صوبے یا شہر میں قانون کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ براہ راست نہیں تو بالواسطہ محترم وزیر داخلہ نے میری بہت سی مشکلات حل کر دی تھیں جن سے میں قدم قدم پر دوچار ہوتی رہتی تھی۔ اتنا بڑا اعتماد بہر حال ہر شخصیت پر نہیں کیا جاتا میں نے اسی لیے اسے اعزاز لکھا ہے۔ وہ احتیاط نامہ اپنی کوٹھی کی بجائے میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کے ریکارڈ روم میں رکھنا چاہتی تھی جہاں میرے اور بھی اہم کاغذات محفوظ تھے۔ میں نے اسی لیے اسے دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ میری کوٹھی کے کمروں میں انٹرکام نہیں تھا اور کبھی مجھے یہاں ان کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی اگر یہاں بھی ایسا ہوتا تو شاید اب تک ذکیہ صبر نہ کرتی۔

اب دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا میرا پروگرام یہ تھا کہ کھانا کھا کر اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا چکر لگاؤں گی۔ حالات کے پیش نظر اس بات کا امکان بھی نظر آ رہا تھا کہ مجھے ڈھاکہ جانا ہی پڑے گا۔ مجھے اس سلسلے میں بھی کچھ ضروری انتظامات کرنا تھے پھر ذکیہ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ اسے بھی ہموار کرنا پڑتا۔ صبح اس سے ناشتے کے دوران میں سرسری سی گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے اسے صرف یہ بتایا تھا کہ گیارہ بجے میرا ایک اپائنٹمنٹ ہے واپسی دوپہر تک ہوگی۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کے کچھ ہی دیر بعد سیل کی وہ رکن دیے قدموں اندر آ گئی جو میری ذاتی ملازمہ خاص کا کردار ادا کر رہی تھی۔ دروازہ کھول کر میں ایزی چیئر پر نیم دراز ہو گئی تھی۔

صدر مملکت کی طرف سے ملنے والا مہربند لافاذ اپنے پرس میں رکھنے کے بعد میں نے اجازت طلب نظروں سے وزیر داخلہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ گئے اور دوبارہ یاد دہانی کرائی کہ چائے آ رہی ہے۔ دراصل اس مہربند لافاذ نے میرے ذہن کو الجھا دیا تھا اور میں جلد از جلد اسے کھول کر پڑھ لینا چاہتی تھی مگر وہاں نہیں۔ چند ہی لمحے بعد چائے آ گئی۔ چائے پینے کے دوران میں بنگال کی سیاسی صورتحال پر گفتگو ہوئی رہی میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ وزیر داخلہ بنگال سے متعلق حکومت کے نقطہ نظر کی وضاحت کر دینا چاہتے تھے جس سے بڑی حد تک میں بھی متفق تھی۔ اس ضمن میں ذاتی طور پر مجھے جہاں جہاں اختلاف تھا میں نے اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھا۔ اختلاف رائے کو کسی بھی جمہوری معاشرے میں صحت مند رجحان تصور کیا جاتا ہے مگر اس کی بھی ایک حد متین ہے۔ کسی بھی مسئلے میں اور کسی سے بھی اختلاف رائے کے باوجود میں اس حد سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔ حکومت کے اپنے معاملات تھے معلومات کے ذرائع تھے اور اپنی حکمت عملی تھی۔ اس سے میرا اتفاق یا اختلاف کسی گنتی میں شمار نہیں تھا۔ ایک فارسی شاعر کے بقول

سربراہان مملکت خود جانتے ہیں۔

وزیر داخلہ سے ملاقات کے بعد میں اسٹیٹ گیٹ ہاؤس کی عمارت سے باہر نکل آئی اور اپنی کار میں آ بیٹھی۔ وہاں سے اپنی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے عادت کے مطابق میں چوکننا اور محتاط تھی۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ میں آپریشن سیل کے حفاظتی دستے کے حصار میں ہوں کوئی چاہے بھی تو مجھے معمولی سی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میں نے یہ تمام انتظامات حالات کے پیش نظر کیے تھے۔ سیل کے ارکان میں پاکستان کے ہر صوبے کے افراد تھے اور میں ان کی صلاحیتوں اور مزاج سے بھی بخوبی آگاہ تھی۔ کمانڈر نواز عموماً ان کے روایتی مزاج اور صلاحیت کے مطابق ہی ان سے کام لیتا تھا۔ میرے حفاظتی دستے میں اکثریت اہل پنجاب اور اہل سرحد کی تھی۔ بلوچ، سندھی، مہاجر اور بنگالی بھی سیل سے متعلق تھے۔ ان میں سے اس وقت کچھ کی ڈیوٹی میرے ذاتی ملازمین کی حیثیت سے کوٹھی کے اندر تھی اور کچھ باہر رہ کر کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے۔ کمانڈر نواز نے کچھ دنوں تک فوجی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ اس کا تعلق صوبہ سرحد سے تھا۔ اس کے آباؤ اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے مغلوں کے زمانے میں یہاں آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے تھے۔ کمانڈر نواز کے اجداد کا پیشہ بھی سپہ گری تھا۔ اس کے مزاج میں نظم و ضبط اسی سبب تھا۔ آپریشن سیل کا نمبر دو یعنی عثمانی ہندوستان کی ایک ریاست حیدر آباد دکن کا تھا وہ دکن کے ایک

”یعنی وہ جو سیر و تفریح کی آخر تھی واپس لے لی آپ نے؟“ وہ بولی اور یہی میں اس سے لہلہانا چاہتی تھی۔
”پھر پھوٹو نہ منہ سے!“ میں نے بظاہر خفگی کا اظہار کیا اور پھر مسکرانے لگی کہ کہیں وہ سیریس نہ ہو جائے۔

”سچ آپ بہت ہی اچھی ہیں باجی۔“
”یقیناً بہت اچھی ہوں، مگر یہ سمجھ لینا کہ اتنی اچھی بھی نہیں ہوں کہ تمہیں ورلڈ ٹور کے لیے ٹیٹ کاٹ کر دے دوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔
”خیر یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا“ فی الحال یہ بتائیں کہ آج کا کیا پروگرام ہے؟ کوئی اور اپائنٹمنٹ تو نہیں؟“

”تم کہو تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ میں نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔ ”میرے پروگرام تو بننے لگتے رہتے ہیں۔“
”اگر آپ کو فرصت ہو تو آج بھی ملک دلاور کی طرف چلیں۔ وہ بندہ واقعی دلچسپ اور فقیرے ہارتھا آپ نے اس کے بارے میں غلط نہیں کہا تھا۔“

”ممکن ہے مجھے وقت نہ ملے ادھر جانے کا۔۔۔۔۔ تم خود کیوں نہیں چلی جاتیں میری طرف سے بھی اس کی طبیعت تو پوچھ لینا۔ راستہ تو تمہارے ذہن میں ہے نا؟“
”جی ہاں، مگر آپ بھی چلتیں تو۔۔۔۔۔ یوں بھی اس سے کل پہلی دفعہ تعارف ہوا ہے دوسرے ہی دن خود پہنچ جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا مجھے وہ بھی آپ کے بغیر!“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ملک دلاور قابل اعتماد بھی ہے اور جیسا کہ شاید میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا مخلص دوست بھی!۔۔۔۔۔ بس جو باتیں میں نے تمہیں کل سمجھائی تھیں ان کا خیال رکھنا، ممکن ہے وہ میرے متعلق تم سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرے یا۔۔۔۔۔“
”میں سمجھتی ہوں۔“ ذکیہ نے کہا ”اگر میرا موڈ بن گیا تو ادھر چلی جاؤں گی، مگر آپ کے بارے میں اسے ہوا نہیں لگنے دوں گی اور خود اپنے متعلق بھی کچھ بتاتے ہوئے محتاط رہوں گی۔“

اسی وقت ملازمنہ یا کر بتایا کہ کھانا لگ چکا ہے میں ذکیہ کے ساتھ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ کھانے کے دوران میں ذکیہ کو میں نے اشارتاً بتایا، ممکن ہے چند دن کے لئے مجھے ڈھاکہ جانا پڑے کام ایسا ہے کہ شاید میرے وہاں جائے بغیر نہ بنے۔

”باجی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ کو کراچی آئے ہوئے ابھی تیسرا دن پوری طرح نہیں گزرا ویسے پانی داوے کیا میں یہاں اکیلی رہوں گی؟“
”کیوں کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ یہ بھی تو تمہارا گھر ہی ہے اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ فوری طور پر میں احاکہ چلی جاؤں ابھی تو صرف ارادہ ہے۔“

”میں خوب سمجھتی ہوں آپ کے ارادوں کو! ادھر ارادہ کیا اور ادھر اڑن چھو!۔۔۔۔۔ اور میں جتنی ہی رہ جاؤں گی کہ آپ کو کیسے روکا جائے!“

”ذکیہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”اپنے کمرے میں ہیں اور کئی بار آپ کے بارے میں پوچھ چکی ہیں۔ اس وقت ایک انگریزی اخبار پڑھ رہی ہیں۔“ اس نے مودب اور دھیمی آواز میں جواب دیا، پھر بولی ”کھانا لگوا دوں؟“
”ہاں، مگر ذرا جلدی۔۔۔۔۔ کوئی پیغام؟“
”جی نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ میرا اشارہ پا کر کمرے سے چلی گئی۔

میں بھی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ذکیہ کو ابھی میری واپسی کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ برابر والا بیڈ روم میں نے اسے دے دیا تھا میں اپنے کمرے سے نکل کر رابڈاری میں آ گئی اور ذکیہ کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی۔
”کھلا ہے دروازہ آ جاؤ۔“ مجھے ذکیہ کی آواز سنائی دی۔

یہی میرا قیاس بھی تھا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں ہوگا، میں دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئی۔ ”تو یہ عیش ہو رہے ہیں، دوپہر کے وقت صبح کے اخبار پڑھے جا رہے ہیں۔“ میں اس کے بیڈ کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

مجھے یوں اچانک اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر وہ کچھ بڑبڑاسی گئی، پھر اس نے اخبار ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کون سے ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد اخبارات شائع ہوتے ہیں! صبح کے اخبارات ہی لوگ شام تک چائے پیتے رہتے ہیں۔“
”خیر اب ایسا بھی نہیں شام کے اخبارات بھی ہیں۔“

”جن میں سے زیادہ تر کا گزارہ صبح شائع ہونے والے اخبارات ہی کی کننگ پر ہوتا ہے۔“ وہ منہ کر بولی۔

میں اس دوران میں اس کے بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ ”تمہاری گفتگو سے معلوم ہو رہا ہے کہ تم شاید پاکستانی صحافت میں کوئی انقلاب لانا چاہتی ہو!“ میں نے ہنس کر کہا۔
”جی نہیں بی، فی الحال بندی کا کوئی ایسا ارادہ نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے تکیہ اپنی گود میں رکھ لیا۔ ”میں تو آپ کی آفر پر غور کر رہی تھی۔“
”کیسی آفر؟“

”یہی کہ آپ کے خرچے پر سوئٹزر لینڈ یا امریکہ وغیرہ گھوم آؤں۔ بقول آپ کے اس سے میری صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ کیا بور ہو گئیں یہاں؟“ میں جان کر انجان بن گئی۔ ”میں نے تمہارے گھومنے پھرنے پر پابندی تو نہیں لگائی، کہیں بھی گھومو پھرو گاڑی ہے ڈرائیور بھی ہے اور یہ سارا شہر بھی تمہارا دیکھا بھالا ہے۔“

”اسی لیے تو گھومنے پھرنے کو جی نہیں چاہتا۔“ وہ فوراً بول اٹھی ”یہاں کیا دیکھوں کہاں جاؤں؟ کوئی مصروفیت ہی نہیں۔“

”میرے دفتر چلی جا کر ذرا مصروفیت ہی کا رونا ہے تمہیں۔“

”ایہ کچھ بوکھلا گئی۔“ کہاں سے بول رہی ہیں آپ؟“
 ”یہیں کراچی سے اور کہاں سے۔“

”جی..... جی آداب!“

”تمہیں بڑی جلدی آداب کا خیال آ گیا“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”علیکم آداب! کام وام تو میک ٹھاک چل رہا ہے؟“

”جی ہاں بالکل..... آپ کب سے دفتر آ رہی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”فی الحال تو اس کا امکان نظر نہیں آ رہا“ ویسے اگر موقع ملا تو دفتر کا ایک آدھ چکر لگا لوں گی“

”نہیں کوئی دشواری تو نہیں؟“

”قطعی نہیں آپ مطمئن رہیں۔“

”اچھا تو خدا حافظ!“ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے ریسور کریدل پر رکھ دیا اور پھر کچھ دیر لرسیدگی کرنے کے لیے بستر پر دراز ہو گئی۔

سونے کا تو سوال ہی نہیں تھا، بمشکل نصف گھنٹے میں آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹی رہی، پھر اٹھ کر باتھ روم میں جا کھٹی اور لباس تبدیل کر کے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ صدر مملکت کا عطا کردہ خصوصی مختار نامہ میرے پرس ہی میں تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر پہلے میں نے ذکیہ لے بارے میں ایک ملازمہ سے پوچھا، اس نے میرے مشورے پر عمل کیا تھا اور اس وقت اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھی۔

سیل کا وہ رکن جو میرے شو فر کا کردار ادا کر رہا تھا، عمارت سے نکلنے ہی میری طرف بڑھ آیا۔ آمدے کی سیڑھیوں کے قریب ہی میری کار کھڑی تھی اسے یقیناً عثمانی کے ذریعے یہ پیغام مل چکا ہوگا کہ میں کچھ دیر بعد آپریشن سیل کی طرف جاؤں گی۔

”میڈم! آپ خود کارڈرائیو کریں گی یا.....“ اس نے قریب آ کر مودب لہجے میں کہا۔ اپنا ہلم اس نے اٹھوڑا ہی چھوڑ دیا تھا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا تھا۔

”نہیں، تم ڈرائیو کرو گے۔“

میرا جواب سن کر وہ پلٹا اور کار کا چھجلا دروازہ میرے لیے کھول دیا، میں کار میں بیٹھ گئی اور پھر پچھ ہی دیر بعد میری کار آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہاں پہنچتے ہی سیل کے ایک چست و تازہ رکن میجر شہباز سے میری ملاقات ہو گئی۔ اس کا لباس دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو آج کل جوڈو کراٹے کی مشق کر رہے ہو!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ میرے علم میں تھا کہ وہ بلیک بیلٹ حاصل کر چکا ہے اور فاضل اوقات میں سیل کے ارکان کو ان فنون حرب کی مشق کراتا رہتا ہے جن سے وہ آشنا ہے۔

”آپ اگر مناسب سمجھیں اور آپ کے پاس وقت بھی ہو تو میں ان دو بندوں کا معائنہ کرانا چاہتا ہوں جنہیں گزشتہ دنوں میں نے اپن فن سکھایا ہے۔“ میجر شہباز بولا، اس کے لہجے میں اس نے درخواست کا عنصر محسوس کر لیا تھا۔ سیل کے ارکان کی حوصلہ افزائی کی خاطر مونا میں ان کی کارکردگی کے

ذکیہ کی بات کے جواب میں ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میری نگاہ دائیں جانب اٹھ گئی، میں نے اس جانب دے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ ملازمہ کے ہمیں میں وہ بھی سیل ہی کی ایک رکن تھی جس نے مجھے ہاتھ کے خفیف سے اشارے سے بتا دیا تھا کہ میرے لیے کوئی اہم ٹیلی فون کال ہے۔ اشارہ کر کے ملازمہ واپس چلی گئی میں نے جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، پانی پی کر میں نے ذکیہ کو مخاطب کیا، میں تو اب کچھ دیر آرام کروں گی، تم جو چاہو..... دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میں کھڑی ہو گئی۔

”مجھے یہاں بھی کچھ پراسرار سرگرمیاں محسوس ہونے لگی ہیں۔“ ذکیہ نے میری طرف دیکھا، اس کی نگاہوں میں معنی خیزی تھی۔

”بکومت..... یہ میری کوٹھی ہے، وہ جگہ نہیں جہاں تم کل تک تھیں۔“ میں ہنس کر بولی ”میرا مشورہ ہے کہ کھانا کھا کر تم بھی آرام کرو۔“

”بجا ارشاد!“ ذکیہ کی آواز میں نے مڑتے مڑتے سنی۔ ”آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے!“ ڈائننگ روم سے نکل کر میرے قدموں میں تیزی آ گئی۔ وہ اہم ٹیلی فون کال میں اپنے بیڈ روم میں ریسور کرنا چاہتی تھی۔ میرے کمرے میں دو ٹیلی فون سیٹ تھے، جن میں سے ایک کا ایکسیشنیں باہر بھی تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر بیڈ کی ایک جانب تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون میس کے قریب پہنچ گئی۔ ٹیلی فون پر عثمانی تھا، میں نے اس کی آواز پہچان کر پوچھا، ”ہاں کیا بات ہے؟“

”سیل کے پٹرولنگ پونٹ کی جانب سے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ایک شخص کو گورقبرستان سے صدر کی طرف جاتے ہوئے ایک غیر ملکی سفارت کار کی کار سے اترتے دیکھا گیا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی ہے۔ وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں معلوم ہوتا ہے۔ سوئیڈ بوئیڈ ہے، ناٹی بھی.....“ ”ٹھیک ہے، جلیہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں، اگر وہ شخص مشتبہ معلوم ہوتا ہے تو اسے اٹھواؤ، میں خود بھی تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں اور کچھ؟“

”جی نہیں۔“ عثمانی نے جواب دیا اور میں نے ٹیلی فون کا ریسور رکھ کر لمبا سانس لیا۔ مجھے یوں بھی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر جانا ہی تھا، پھر یہ کہ فون پر مزید تفصیلات معلوم کرنا، مناسب بھی نہیں تھا۔

قاہرہ سے آنے کے بعد مجھے اب تک اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ اپنی فرم کی منیجر عارفہ سے فون پر گفتگو کر لیتی۔ میں نے یہ موقع غنیمت جان کر فون پر اپنی فرم کا نمبر ملایا اور اسی کے ساتھ وال کلاک پر نظر ڈالی۔ سوادو کے قریب ہو رہے تھے۔ بیچ کا وقفہ ختم ہو چکا تھا عارفہ کو اس وقت اپنی سیٹ پر ہونا چاہئے تھا۔ میری توقع چند ہی لمحے بعد پوری ہو گئی۔ آپریٹر نے میری آواز پہچان کر فوراً عارفہ سے میرا رابطہ قائم کر دیا۔

”ہیلو عارفہ، کیسی ہو؟“ میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔
 ”ٹھیک..... ٹھیک ہوں میڈم“ اچانک فون پر ایک طویل عرصے کے بعد میری آواز سن کر وہ

مظاہرے دیکھتی رہتی تھی۔ میجر شہباز شاید کسی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔

”چلو تمہارے بندے بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ میں مسکرا کر بولی ”باقی کام بعد میں سہی!“

”بہت بہت شکریہ میڈم!“ یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

میجر شہباز کے ساتھ میں ایک بڑے سے ہال میں آ گئی جو اسی طرح کی مشقوں کے لیے تھا۔ وہاں پہلے ہی سے سیل کے دو ارکان مخصوص لباسوں میں میرے منتظر تھے۔ میجر شہباز کا اشارہ پاتے ہی وہ دونوں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ ان میں سے ایک کی فلائنگ کلک کی داد مجھے دینا ہی پڑی۔ میرے خیال میں انہیں ابھی مزید مشق کی ضرورت تھی مگر اس وقت میں نے کچھ نہیں کہا اور ان کی تعریف کر کے اس کمرے سے باہر آ گئی۔ اب میرا رخ ڈیوٹی روم کی طرف تھا۔ میں عثمانی سے براہ راست اس شخص کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی جس کی بابت مجھے فون پر مطلع کیا گیا تھا۔

ڈیوٹی روم میں عثمانی مجھے منتظر ملا۔

”ہاں اب بتاؤ عثمانی؟ کیا وہ مشتبہ شخص، مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا؟“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

”جی ہاں!“ عثمانی جواباً بولا۔ اس سے ضروری پوچھ گچھ بھی کی جا چکی ہے ہمارا شبہ درست ہی ثابت ہوا اس شخص کے بریف کیس سے کچھ ایسے کاغذات ملے ہیں جن کی روشنی میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارے ایک بڑی ملک کے لیے جاسوسی کرتا رہا ہے۔“ یہ کہہ کر عثمانی نے اس ملک کا نام بھی بتایا۔

”یعنی یہ کوئی نیا قصہ معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے خیال آرائی کی پھر پوچھا کیا اس نے خود بھی اقبال جرم کر لیا ہے؟“

”بڑی حد تک..... وہ انتہائی خوفزدہ معلوم ہوتا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تشدد کی نوبت نہیں آئی ہوگی؟“

”جی نہیں میڈم!“

”اور میرے نزدیک یہی بات کچھ الجھا دینے والی ہے تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ جو لوگ ایسے کام کرتے ہیں فوری طور پر زبان نہیں کھولتے۔“

عثمانی نے میرے خیال کی تائید میں کہا ”مجھے بھی کچھ ایسا ہی شک ہے ممکن ہے کوئی اور معاملہ بھی ہو میں آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ اگر آپ خود.....“

”میں خود اسے دیکھ لیتی ہوں تم چالی دو بجھے میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی ”تم اگر مناسب سمجھو تو میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو ٹیپ بھی کر سکتے ہو۔“

عثمانی سے مہمان خانے کے اس کمرے کی چابی لے کر میں ڈیوٹی روم سے نکل آئی جہاں اس مشتبہ شخص کو رکھا گیا تھا۔ عمارت کے اس عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ زیادہ عرصے لوگوں کو یہاں نہیں رکھنا چاہئے۔ مجھے باغی امریکی ایجنٹ جیفرسن کا خیال آ گیا تھا جو ایک عرصے سے یہاں مہمان تھا۔ صدر مملکت کی طرف سے خصوصی مختار نامہ ملنے کے بعد قانون کی مدد حاصل کرنا اب

میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے نہ مجھے اب کسی سفارش کی ضرورت رہی تھی نہ اپنے اتفاقات کام میں لانے کی۔ جیفرسن کے بارے میں میرا فیصلہ یہی تھا کہ اسے قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں اب مختار نامے کی رو سے میرا محض یہ تحریری بیان کافی ہوتا کہ یہ شخص ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے۔ باقی کارروائی قانونی ادارے خود کرتے رہتے۔ تحریری بیان کی بھی اس صورت میں ضرورت پڑ سکتی تھی جب کوئی قانونی ادارہ اس کی ضرورت محسوس کرتا یا مطالبہ کرتا۔ ایسے معاملات میں عموماً قانون نافذ کرنے والا ہر ادارہ خود کریڈٹ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے کسی کریڈٹ نہ نہ کوئی دلچسپی تھی نہ اس کی ضرورت۔ میں تو اپنے طور پر حتی الامکان اپنے ملک کے مفاد کی خاطر ہمدرد کر رہی تھی۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں اب تک بہت سے قانون شکن اور تخریب کار میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔ اب جیفرسن کا بھی یہی انجام ہونا تھا۔ حالات کے پیش نظر میں نے اپنے ذہن میں اس کا طریقہ کار وضع کر لیا تھا۔

اپنے نئے مہمان کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں چند لمحے اندر کی سن گن لیتی رہی میں نے محسوس کر لیا کہ کمرے میں جو شخص بھی ہے اس نے یقیناً میرے قدموں کی چاپ سن لی ہے اور وہ کمرے کے دروازے کے قریب آ گیا ہے چند لمحے کے بعد میں نے قفل میں چابی گھما کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر روشنی تھی اور میرے سامنے ایک شخص سہا ہوا سا کھڑا تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی چہرے کے نقوس جاذب نظر تھے جسم پر عمدہ تراش کا سوٹ تھا ٹائی بھی باندھے ہوئے تھا۔ اسے لازماً یہ امید نہیں رہی ہوگی کہ اس ماحول میں کوئی صنف نازک اس سے ملنے آئے گی چہرے کی بہت سے یہی معلوم ہوتا تھا۔

”کمرے میں کرسیاں بھی ہیں تم بیٹھ جاؤ نا! میں نے اسے نرمی سے مخاطب کیا۔ میں اندر سے دروازہ بند کر دیتی ہوں پھر ہم دونوں اطمینان سے باتیں کریں گے۔ میرا انداز اور لہجہ دوستانہ تھا پھر یہ اچھے بغیر کہ اس پر میری بات کا کیا رد عمل ہوا ہے میں نے مڑ کر دروازہ بند کر دیا مگر اس سے پہلے چابی ادا لی۔ دروازہ بند کر کے چابی اپنے پرس میں ڈالنے کے بعد میں پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ابھی ایک ہفتوں سا بنا ہوا کھڑا تھا ہاں اب اس کے چہرے سے خوف کا تاثر بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ اور یہی میں چاہتی تھی۔ خوف کی جگہ حیرت نے لے لی تھی۔ میں نے اس سے بیٹھ جانے کے لیے دوبارہ کہا اور پھر وہ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میرے دوستانہ رویے پر کچھ اثر یقیناً ہوا تھا اسی لیے وہ بھی حیران حیران سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ہی پھر بولی ”ڈرنے یا حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تم ایک محفوظ جگہ ہو جہاں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ وہ سفارت کار جس کی گاڑی سے اتر کر تم شاید کسی ٹیکسی کی تلاش میں تھے اس کے آدمی بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے اگر تمہارے دل میں اس کی طرف سے یا اس کے آقاؤں کی جانب سے کوئی خوف ہے تو اسے بھلاؤ میں تمہیں اپنے تعارف کے طور پر یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرا اطلاق نہ یہاں کی پولیس سے ہے نہ کسی اور ایسے ادارے سے! لیکن ضرورت پڑنے پر میں ایسے کسی بھی ادارے سے فوری طور پر رابطہ قائم کر سکتی ہوں۔ یہ میں نے تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہو تمہیں میرے ہی ایما پر میرے آدمی یہاں لے کر آئے ہیں۔ اب وقت ضائع کیے بغیر سچ سچ مجھے

سب کچھ بتا دو کہ میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں، پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بھی کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گئی اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔

”میرا نام کرشن کمار ہے اور میں اندرون سندھ کا رہنے والا ہوں“

اس نے سندھ کے ایک سرحدی قصبے کا نام لیا۔

”تعلیم کہاں حاصل کی؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔

”جام شورو یونیورسٹی (سندھ) میں۔“

”کہاں تک؟“

”گرجویٹ ہوں۔“

”کیا تم اس کا ثبوت پیش کر سکو گے کہ تم نے جام شورو یونیورسٹی سے گریجویشن کیا ہے؟“

”ثبوت..... جی..... جی ہاں۔“

اس کا جواب سن کر میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تم کچھ گڑبڑا کیوں گئے؟ میرا مطلب ثبوت سے تھا۔“

”اس لیے کہ یہاں میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ ہر وقت آدمی ڈگری ساتھ لیے نہیں پھرتا، خیر اب آگے خود ہی اپنی کہانی بیان کرو کہ کس طرح تم ہمارے ایک پڑوسی ملک کے آلہ کار بن گئے؟“

کچھ دیر اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا رہا، ایک جاتا رہا، پھر اس نے ایک طویل سانس لیا اور مجھی سے سوال کر بیٹھا۔ ”آپ نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، کیا میں اس پر یقین کر لوں؟“

”نہ کرو یقین اس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم میری فکر چھوڑو اور اپنی بات کرو۔“

میرے لہجے میں ہلکی سی سختی آ گئی جس کی ضرورت بھی تھی پھر میں نے کچھ سوچ کر کہا ”تمہارے متعلق جہاں تک میرا اندازہ ہے تم طالب علمی ہی کے زمانے سے ان لوگوں کے چنگل میں پھنس گئے تھے۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟“

جواباً وہ خاصی دیر خاموش رہا اور میں اسے بولنے پر اکساتی رہی۔ بالآخر اسے میرے سوال کا جواب دینا ہی پڑا۔ ”جی..... جی ہاں، یونیورسٹی ہوسٹل میں رہ کر میں نے کسی طرح گزارہ کر لیا تھا لیکن اب مزید ایک سال وہاں رہ کر فائل ایئر پورا کرنا مجھے مشکل نظر آتا تھا۔ ہوسٹل کی حالت بہت خراب تھی۔

آئے دن دنگا فساد ہوتا رہتا، راتوں کو اس قدر شور اٹھتا کہ نیندیں حرام ہو جاتیں۔ اس کے باوجود شاید کسی نہ کسی طور میں ان لوگوں کے.....“

مزید کچھ کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہی کہ کہیں مظلوم بن کر اس طرح وہ میری ہمدردیاں تو حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ اس امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چند لمحے اس کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھ کر میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”ہاں تو پھر کیا ہوا؟“

ذرا توقف کے بعد اس نے مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھا اور آنسو پونچھنے لگا، پھر اس نے جو

کہانی سنائی، وہ ایک ایسے مظلوم نوجوان کی کہانی تھی جو اپنی طالب علمی کے دوران میں غربت اور لالچ کے جب پڑوسی ملک کا آلہ کار بن گیا تھا۔ اسے بلیک میل کیا جا رہا تھا اور وہ اس چکر سے نکلنا چاہتا تھا۔ اس کی اور باغی امریکی ایجنٹ کی کہانیاں بڑی حد تک ملتی جلتی تھیں، مگر صرف بظاہر!

اس کی کہانی سنتے ہوئے اور پھر اس کہانی کے اختتام تک میں ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ ”کرشن مارا تم یقیناً ایک اچھے اداکار ہو، تمہاری تربیت ذہین لوگوں نے کی ہے، تم اگر جاسوسی کا پیشہ اختیار کرنے

لی بجائے اداکاری کے فن کو اپناتے تو اس سے زیادہ کامیاب رہتے..... درمیان میں بولنے کی کوشش مت کرو، میں تمہاری پوری کہانی بڑے صبر و ضبط کے ساتھ سن چکی ہوں۔ تم نے ایک بڑے جرم کا اعتراف

لرنے کی بجائے نسبتاً چھوٹے جرم کے اعتراف کو غنیمت سمجھا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ تمہیں ریڈ ہینڈ پکڑ لیا گیا تھا، تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے ابتداء میں تمہیں اپنے متعلق جو کچھ

بتایا تھا، قطعی درست ہے۔ تمہیں قانون کے حوالے کر دیا جائے گا ہمارے ملک میں اقلیتوں کے ساتھ مساوات کا سلوک کیا جاتا ہے اور آئندہ بھی ہماری یہی پالیسی رہے گی، لیکن اس کی آڑ میں اگر کوئی بھی

فحش یا حکومت ہماری فراخ دلی اور مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گی تو اسے ایسا نہیں کرنے دیا جائے گا۔ شرافت، رواداری، بھائی چارے، مساوات اور انسانیت کا مطلب نہ بزدلی ہے نہ

پلہ اور۔“ یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ..... آپ میری بات تو سن لیں، میرے پاس ہر ثبوت موجود ہے، آپ کو غلط فہمی ہو رہی

ہے۔ میرے پاس یہاں کی یونیورسٹی کا سرٹیفکیٹ..... ڈگری.....!“

”ہوگا ثبوت!“ میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی ”ثبوت دیکھنا میرا کام نہیں ہے، یہ کچھ

ادرا لوگوں کا کام ہے جو وہ اپنے طور پر انجام دیں گے، اگر تم واقعی بے گناہ ثابت ہوئے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا، خدا حافظ۔“

”بھگوان کے لیے..... خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں.....“ وہ رونے لگا مگر میں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

آدمی کو جہاں نرم ہونا چاہئے، وہاں نرمی اور جہاں سختی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سخت ہونا چاہئے۔ میں نے بہت سے ایسے مجرموں کے بارے میں پڑھا ہے جنہیں سزائے موت دینے کے لیے

مہاشی کے پھندے کی طرف لے جایا جاتا ہے اور وہ آخر وقت تک یہی واویلا کرتے رہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا، کچھ ایسا ہی قصہ اس شخص کا تھا، جس نے اپنا نام کرشن کمار بتایا تھا، مجھے یہ بھی شک تھا

کہ اس کا اصل نام یہ نہیں ہے۔

اس کمرے سے نکل کر میں پھر ڈیوٹی روم میں پہنچ گئی۔

”عثمانی! تم نے میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ کر لی؟“ میں نے سوال لیا۔

”لیس میڈم!“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے اس گفتگو کا ٹیپ چاہئے، اس ٹیپ کی ایک نقل ریکارڈ روم میں رہے گی اور ہاں سنو.....“

افغانے کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ”کرشن کمار کی اصل شخصیت ظاہر ہوتے ہی جو ضروری اقدامات ہیں ان پر عمل کیا جا چکا ہے، بسترپوشی کے لیے اس کے جسم پر اب صرف ایک کپڑا ہے، کمرہ بھی بدل دیا گیا ہے، اس کے علاوہ یہ کہ اسے آپریشن روم میں استعمال ہونے والی میزوں میں سے ایک میز پر باندھ دیا گیا ہے، چڑے کے تسموں سے ڈاکٹر رشید نے اسے بے ہوشی کا انجکشن بھی جے دیا ہے اور سیل لے دو مسلح ارکان کی ڈیوٹی بھی نئے کمرے میں لگا دی گئی ہے۔

”ویری گڈ!“ میں نے کھلے دل سے عثمان کی کارکردگی کا اعتراف کیا۔

”تھینک یومیڈم!“ اس نے بھی بطور انکسار میرا شکریہ ادا کیا۔

پھر میں نے عثمانی کو آئندہ صبح کیلئے کچھ اور ضروری ہدایات دیں اور کھڑی ہو گئی۔ اب میرا ارادہ کٹھن کی طرف واپسی کا تھا۔ واپسی میں بھی میں نے خود کارڈ رائٹ نہیں کی۔

کونھی پہنچ کر معلوم ہوا کہ ذکیہ کچھ دیر قبل ملک دلاور سے ملنے گئی ہے۔ وہ میرے لیے پیغام پہنچا رہی تھی کہ فرصت ہو تو میں بھی وہیں آ جاؤں ذکیہ اور ملک دلاور دونوں پر ہی مجھے مکمل اعتماد تھا اس کے باوجود میرے نزدیک ذکیہ بہر حال بچی ہی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی ہوں یا اولاد بڑے بہن بھائیوں یا والدین کے لیے وہ ہمیشہ بچے ہی رہتے ہیں۔ میں یہ اطمینان بھی کر چکی تھی کہ سیل کے کچھ ارکان ذکیہ کی لڑی نگرانی کے لیے ساتھ ہی گئے ہیں اس کے باوجود کچھ سوچتے ہوئے میں نے ملک دلاور کا فون نمبر ملا لیا۔ یوں بھی مجھے اس کی عیادت کرنا تھی جب وہ فون پر آ گیا تو میں نے پہلے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔

”حال ایسا نہیں کہ تم سے کہیں“

”تم ملک دلاور ہی بول رہے ہوتا؟“ میں نے دانستہ حیرت سے کہا۔

”جی بندہ نواز..... آپ کا خادم ہی بول رہا ہے۔“

”اگر تم واقعی ملک دلاؤ رہی ہو، کوئی اور نہیں تو بیماری نے تمہیں خاصا رومانٹک بنا دیا ہے۔ تم تو اب ایک آدھ مصرع ڈھنگ کا بھی پڑھنے لگے ہو! محض مصرع میں نے اس لیے کہا کہ تمہیں یہ پورا مطلع یعنی غزل کا پہلا شعر یاد نہیں ہوگا۔“

”یہ بات ہے تو پھر سناؤں دوسرا مصرع!“

”نہیں، ہمکی دینے کی ضرورت نہیں، تم یقیناً کہیں سے یہ شعر سن بھاگے ہو گے۔ ویسے

نے اور چمکنے سے کم از کم ایک بات کا اندازہ ہو رہا ہے مجھے۔“

”وہ کیا؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”یا تو تم نے اپنی بیماری کو صبر کر لیا ہے یا پھر تشخیص ہو گئی ہے کہ تمہیں کیوں بخارا آتا ہے۔“

”دونوں میں سے فی الحال کوئی بات نہیں؛ دراصل آپ سے بات ہوتی ہے تو مجھے بخارا اتارنے

کا جانس مل جاتا ہے۔“

”حانس کو اردو میں ’موقع‘ کہتے ہیں اور اس میں ایک عدد ’قوئے‘ بھی آتی ہے شاید تم نے

اسی سے بچنے کے لئے حانس کہا۔“

پہلے فوری طور پر اس کا بندوبست کر دو کہ وہ خودکشی نہ کر سکے۔ یہ لو چاہی! میں یہاں ڈیوٹی روم میں موجود ہوں۔ یہ بندوبست کر کے جلد واپس آؤ، میں تمہیں کچھ اور ہدایات بھی دینا چاہتی ہوں۔“

عثمانی مجھ سے چالی لے کر چلا گیا اور میں اس کی داپسی کا انتظار کرنے لگی۔ میرا یہ شک درست ہی ثابت ہوا تھا کہ کرشن کمار جو کچھ خود کو ظاہر کر رہا ہے، حقیقتاً وہ نہیں ہے۔

نئی صورت حال میں جلد ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے فوری طور پر کیا نئے اقدام رو بہ عمل لانا ہیں۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کرسی پر آ بیٹھی جہاں کچھ دیر قبل عثمانی بیٹھا تھا۔ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میرا ہی قائم کیا ہوا تھا۔ اس کی بہتر کارکردگی کی خاطر ابتدائی دنوں میں مجھے بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ اس عمارت کے بارے میں پہلے بھی میں مختلف تفصیلات لکھتی رہی ہوں۔ کمائنڈر نواز عثمانی اور سیل کے دیگر ارکان کو میں نے ہی جدید تر سہولتیں فراہم کی تھیں تاکہ وہ بہتر فضا، بہترین سہولتوں اور عمدہ ماحول میں اپنی ذہانت و صلاحیت بروئے کار لائیں۔ خود میں بھی سیل کے کسی رکن کی جگہ ضرورت پڑنے پر کام کر سکتی تھی۔ مجھ سے زیادہ بھلا اس عمارت کے اسرار کسے معلوم ہوتے! عثمانی کی سیٹ پر بیٹھے ہی میں نے بائیں جانب ٹیلی فون ڈائریکٹری کے اوپر رکھی ہوئی وہ ڈائری اٹھالی جس میں ملک اور بیرون ملک کی تمام اہم شخصیات کے ٹیلی فون نمبر درج تھے اس کے علاوہ دیگر اہم مراکز کے نمبر بھی اس میں درج تھے۔ میں نے اس ڈائری میں ایک نمبر دیکھ کر ٹیلی فون ملایا دوسری جانب فون انٹینڈ کر لیا گیا تو میں بولی ”مجھے آنی جی صاحب سے بات کرنا ہے۔“ عذرا خان.....

جی..... اچھا! میں ہولڈ کرتی ہوں..... مصروف ہیں؟ جی..... اچھا کتنی دیر بعد؟..... رہنے دیں آپ
میں ان کے گھر پر فون کر کے بات کیا؟ اچھا میرے ریڈیوٹ کر لیتی ہوں..... ہاں ہاں کوئی بات نہیں
آپ صرف میرا نام..... نہیں، منیج کوئی نہیں!..... جی ہاں.....“ پھر تقریباً پانچ منٹ کے بعد مجھے فون پر
آئی جی (انپکٹر جنرل آف پولیس) کی آواز سنائی دی تو میں نے کہا ”جی ہاں“ عذرا خان عرض کر رہی
ہوں..... پہچان گئے آپ مجھے!..... شکریہ..... ویری سوری کہ آپ اٹھنے والے تھے اور میں نے آپ کو
ڈسٹرب کیا..... نہیں کوئی ایسا اہم معاملہ نہیں کل صبح کا وقت دے دیجئے!..... جی؟..... ٹھیک ہے انشاء اللہ
میں دس بجے پہنچ جاؤں..... سو کا سنڈ آف ہو!..... خدا حافظ!“

ٹیلی فون پر آئی جی سے گفتگو کے دوران ہی میں عثمانی واپس آ چکا تھا، میں اس کی سیٹ سے اٹھ گئی۔

”سنو عثمانی!“ میں دو بارہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر بولی۔ ”میں تمہیں یہ لفافہ دے رہی ہوں اس میں جو کچھ بھی ہے مجھے کل صبح اس کی فوٹو کاپی چاہئے، کل صبح آٹھ اور نو بجے کے درمیان! فوٹو کاپی کے بعد اسے ریکارڈ روم کے سیف میں رکھنا ہے جہاں اور بھی اہم کاغذات محفوظ ہیں۔ کرشن کمار کی گفتگو کا ٹیپ بھی اب کل ہی صبح چاہئے جلدی نہیں ہے اب یہ بتاؤ کہ کرشن کمار کا بندوست ہو گیا جس کے لیے ابھی میں نے تمہیں بھیجا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے وہ لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا جو پرس سے نکال چکی تھی۔ اس لفافے میں وہی مختار نامہ تھا جو مجھے محترم وزیر داخلہ کی معرفت ملا تھا۔

عثمانی مجھ سے وہ لفافہ لے کر میرے سوال کا جواب دینے لگا۔ اسی کے ساتھ اس کی نگاہ

”تو پھر میں بھی اونگیاں بونگیاں ماروں گا..... بالکل نہیں مانوں گا آپ کی بات چاہے محترمہ ذکیہ خاتون کا مزاج کڑوا ہو کہ میٹھا!“

”بس تم میں سو خرابیوں کی ایک یہی خرابی ہے کہ کبھی ہو جاتے ہو اسی لیے تو میں تمہیں زیادہ لفٹ نہیں دیتی۔“

”تو نہ دیں لفٹ! کون کہہ رہا ہے لفٹ دینے کو نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی مجھ پر نہیں۔ یہ سمجھ لیں کہ ایک عدد ہیشیرہ کا معاملہ ہے جو اللہ کے فضل سے جوان جہان ہے آپ کی طرح اور ایک جوان جہان شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔“

”تم بہت اذیل منٹو ہو! بولو تمہاری وہ ذرا سی شرط کیا ہے؟“

”تھوڑا سا شربت..... شربتی آنکھوں والا یعنی شربت ویدار جو آپ اکثر پلاتی آئی ہیں مگر ابھی تک پیاس.....“

میں نے ملک دلاور کی بات پوری ہونے سے پہلے لائن کاٹ دی۔ گزشتہ روز کا سارا انتقام اس نے آج لے لیا، مگر میں نے بھی اسے بخشا نہیں تھا۔

ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی، میں نے فوراً ریسپور اٹھا لیا ”ہیلو!“

..... ملک دلاور کی آواز سنائی دی۔

”ہیس!..... پی آئی اے انکوائری“ میں فوراً آواز بدل کر بولی۔ ”سوری رانگ نمبر“

ملک دلاور میرے جھانسنے میں آ گیا۔ وہ غالباً یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ میں اپنی کوٹھی ہی سے بول رہی ہوں یا پھر وہ اپنے اندازے کی تصدیق چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ وقتی طور پر جھانسنے میں آ جانے کے باوجود چین سے بیٹھ جانے والا بندہ ہرگز نہیں۔ وہ ایک بار پھر میرا فون نمبر ملا سکتا ہے اور یہی ہوا۔ ذرا توقف کے بعد پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اس مرتبہ پھر ریسپور اٹھا لیا اور ملک دلاور کی آواز پہچانتے ہی بغیر کسی تاخیر کے آواز بدل کر بولی تھی ”پی آئی اے“ اس مرتبہ ایک خبر رساں ایجنسی کی ٹیلی فون آپریٹر بن گئی تھی۔

”اے پراسرار خاتون! کہیں آپ آواز بدل کر تو نہیں بول رہیں؟“

”وہاٹ نان سینس“ میں نے بدستور بدلی ہوئی آواز میں کہا اور ریسپور رکھ دیا، مگر لائن کاٹ کر اور کریڈل کی بجائے تپائی پر اب ملک دلاور میرا نمبر ملاتا تو اسے لائن انکج ملتی۔ اس سے جان چھڑانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ میں اسے ستانے کی خاطر یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے شے کی تصدیق ہو جائے۔ فی الوقت مجھے کوئی ایسا ضروری کام نہیں تھا کہ میں ملک دلاور کے گھر جانے سے گریز کرتی، لیکن ابھی تک کچھ طے نہیں کر پائی تھی جاؤں یا نہیں؟ یہی سوچتے ہوئے مجھے وہ بڑی بی یاد آ گئیں جنہیں گزشتہ روز میں نے ملک دلاور کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور ان کا چہرہ مجھے آشنا لگا تھا۔ ذکیہ کی موجودگی کے سبب ملک دلاور سے میں ان بڑی بی کے بارے میں کچھ نہ پوچھ سکی تھی جو میرے لیے ذہنی ابھرن کا سبب بن گئی تھیں۔ اس وقت بھی اگر میں ملک دلاور کے گھر جانے کا فیصلہ کرتی تو وہاں ذکیہ ہوتی، ملک دلاور سے فون پر فقرے بازی کی فضا میں یہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، میں اس وقت ملک

”میں لاکھ کہتا رہوں چانس چانس آپ چانس دیتی کب ہیں!“ میرے فقرے کو پیٹتے ہوئے اپنی دانست میں اس نے انتقامی کارروائی شروع کر دی۔

”کیا فون پر مزید گفتگو کا ارادہ نہیں ہے؟“ میں بھی اس کے فقرے کو ٹال گئی۔

”ارے پراسرار خاتون! فون بند کرنے سے پہلے یہ ضرور بتا دیجئے گا کہ کہاں سے بول رہی ہیں کل آپ نے یہ چانس ہی نہیں دیا کہ اتنا پتا معلوم کر سکتا۔“

”کیوں وہ تمہارے کھوجی کیا ہوئے جو تمہیں میری رپورٹس دیا کرتے تھے؟“ میں نے اسے چھیڑا ”کیا وہ بھی بیمار ہو گئے؟“

”بیمار تو بس ہم ہیں آپ کے اور یہ بیماری دل آخر ایک دن کام تمام کر دے گی۔“

”اچھا تو تم نے میری میری وہ غزل بھی پڑھ لی جس کے ایک مصرع کو نثر میں بیان کر رہے ہو کیا تمہارے میٹرک کے کورس میں یہ غزل بھی شامل تھی؟“

”کورس میں تو اور بہت کچھ تھا اے پراسرار خاتون! اس سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں کیوں اس بندہ ناچیز کے زخم ہرے کر رہی ہیں دیے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس بندے کو میرے اور کئی شعر یاد ہیں۔ چانس دیں تو سناؤں؟“ پھر مجھے بولنے کا موقع دینے بغیر اس نے میرا صاحب کا ایک شعر پڑھا۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے

میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

”ملک دلاور! تمہاری میڈیکل رپورٹس تو جانے کب آئیں گی، اور کیا خبر ان رپورٹس سے کیا بات سامنے آئے۔ اس سے پہلے میں تمہیں ایک دوستانہ مشورہ دینا چاہتی ہوں شادی کر لو فوراً بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا ہاں ایک بات اور سن لو بلکہ کرہ میں باندھ لو کہ جب نکاح پڑھانے والا تم سے قبول کہلوائے تو پوری طرح چوکنا رہتا یہ لفظ اپنی زبان پر ہرگز نہ لاتا میں تمہیں اس کا صحیح طریقہ بتاتی ہوں! تم یا تو سکھڑ اور نیک بیبیوں کی طرح بس سر ہلا دینا، اگر اس پر بھی اصرار ہو کہ دو تولے کی زبان ضرور ہلاؤ تو کہنا کہ سانوں منظور اے بادشاہو! سمجھ آ گئی؟“

”آہو!..... ہو رگل کرو نہی!“

”زیادہ لہر میں آ کر بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرو مجھے اتنی چٹائی بہر حال آتی ہے کہ تسی اور اسی کا مطلب سمجھ سکوں“ سمجھ آئی!..... اب وہ بات سنو جس کے لیے میں نے تمہیں فون کیا ہے۔“

”لو میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے میری طبیعت پوچھنے کے لیے فون کیا ہوگا خیر جی دیں!“

”ذکیہ ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری مزاج پر سی کے لئے روانہ ہوئی ہے اس سے زیادہ اوگی ہوگی نہ ہاں کتنا یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ وہ مزاج کی ذرا کڑی ہے۔“

”آپ ہی کون سی میٹھی ہیں!..... میں آپ کی بات ماننے کو ایک سو ایک پریسٹ تیار ہوں مگر ایک ذرا سی شرط ہے۔“

”میں تمہاری کوئی شرط ورط نہیں مانوں گی، حکومت۔“

دلاور کے گھر جاتی یا نہ جاتی، اس سے بہر حال بڑی بی کے بارے میں استفسار ضروری تھا۔
کچھ ہی دیر بعد میں نے خود ملک دلاور کا نمبر ملایا، فون ملک دلاور ہی نے اٹینڈ کیا تھا۔
اس مرتبہ میں اپنی اصل آواز میں بول رہی تھی ”ملک دلاور تم اتنی بک بک کرتے ہو کہ جو
ضروری بات کرنا ہوئی ہے وہ رہ جاتی ہے۔“

”ارشاد ہوا!“

”کل میں نے تمہارے ہاں ایک بڑی بی کو پہلی بار دیکھا تھا اور۔۔۔۔۔“

”دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے“ وہ درمیان میں بول اٹھا۔

”تم پھر پڑی سے اتر رہے ہو!۔۔۔۔۔ یہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے آپ ہی کچھ ارشاد فرمادیں۔“

”تم بولنے دو جب نا کچھ کہوں سچ میں تو پڑ بولنے لگتے ہو۔“ پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید
کچھ کہتا، میں رکے بغیر کہے گئی ”ان بڑی بی کا چہرہ مجھے مانوس لگا تھا جیسے پہلے بھی انہیں کہیں دیکھا ہو مجھے
سو فیصد یقین ہے کہ وہ بھی مجھے پہچان گئی تھیں شاید اسی لیے فوراً چائے سرو کر کے چلی گئیں بلکہ صرف کپ
اور چائے دانی وغیرہ سامنے رکھ کر کمرے سے۔۔۔۔۔“

”یہ تو بہت برا ہوا خاتون اب کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔ ویسے میرا خیال یہ ہے کہ وہی ہوگا جو منظور خدا ہو
گا! آپ کیا ارشاد فرماتی ہیں سچ اس مسئلے کے؟“

”دلاور۔۔۔۔۔ ملک دلاور تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔“

”اس لیے کہ سمجھ ابھی آئی نہیں کہیں گئی ہوئی ہے!“ وہ مجھ پر چوٹ کر گیا۔

”پھر میں بھی شروع ہو جاؤں!۔۔۔۔۔ کھسیانی بلی کی طرح کھانا نوچتے نظر آؤ گے ابھی!“

”پہلی بات تو یہ سن لیں کہ میری صنف کے بارے میں آپ کا غلط خیال ہے میں بلاتو ہو سکتا

ہوں مگر۔۔۔۔۔ خیر چھوڑیں اس بات کو! اور میری بھی ایک بات گرہ میں باندھ لیں۔۔۔۔۔ ویسے معاف کیجئے گا

یہ گرہ میں باندھنا میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا، گرہ لگانا تو میرے خیال میں کہتے ہی باندھنے کو ہیں۔

پھر یہ گرہ میں باندھنا کیا ہوا؟ آپ اردو زبان کی دعویدار ہیں آپ ہی اس پر لائن ڈال سکتی ہیں۔۔۔۔۔

چلیں لائن ڈالنے کا کام بعد میں ہوتا رہے گا میں یہ کہہ رہا تھا آپ ایک بات اپنے دماغ میں اچھی طرح

بٹھالیں کہ ہر بندہ یا ہر بندی آپ کی طرح پراسرار نہیں ہوتا یا ہوتی، آئی سمجھ ان بچاری بڑی بی پر رحم کریں

انہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ نے انہیں کہاں دیکھا ہوگا، یہ بھی مجھے معلوم ہے مگر بتاؤں گا نہیں

اگر بتایا بھی تو شرط وہی پہلے والی بدستور ہے! چائیں چاہئے، دیدار کا چائیں!“

”میں تمہیں یہ چائیں ضرور دوں گی آ رہی ہوں!“ جھنجھلاہٹ میں میری زبان سے یہ بات

نکل ہی گئی۔

”بلے بلے!“ یہ کہتے ہی ملک دلاور نے خود فون رکھ دیا اور اس کے ”بلے بلے“ کہنے

جھنجھلاہٹ کے باوجود میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

ملک دلاور سے ذکیہ کے بارے میں پوچھنا کہ وہ پہنچ گئی یا نہیں؟ فضول ہی تھا، وہ کبھی اس کا

صحیح جواب نہ دیتا، اب میں واقعی اس کی کوشش جانے کا فیصلہ کر چکی تھی، بڑی بی کے بارے میں اب مجھے کوئی
خاص تجسس نہیں رہا تھا۔ ملک دلاور نے اپنی اول فول کے درمیان بہر حال یہ بتا دیا تھا کہ انہیں میں اچھی
طرح جانتا ہوں، یہ بات میرے لیے کافی تھی۔ انہیں میں نے کب اور کہاں دیکھا تھا، یہ میرے لیے زیادہ
اہم نہیں تھا۔ اس مرتبہ کوشش سے روانہ ہوتے وقت میں نے ڈرائیو کو ساتھ نہیں لیا۔ ذکیہ بھی بظاہر تنہا گئی
تھی۔ میں نے بھی خود ہی کار ڈرائیو کرنے کا فیصلہ کیا۔ رواںگی سے قبل میں نے کوشش میں متعین سیل کے
ارکان کو بھی باخبر کر دیا تھا کہ کہاں جا رہی ہوں! قاہرہ سے کراچی آئے ہوئے مجھے کئی دن ہو گئے تھے مگر
اب تک مخالف محاذ پر خاموشی اور یہ خاموشی کسی طوفان کی آمد کا اشارہ بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تو خیر ممکن ہی
نہیں تھا کہ میرے حریف مجھے صبر کر لیتے۔ یہ بات بھی ممکن نہ تھی کہ انہیں کراچی میں میری موجودگی کی
اب تک خبر نہ لگی ہو۔ ان کے ذرائع سے میں بخوبی واقف تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ تو بڑی حد تک میری سمجھ میں آ
گیا تھا، لیکن موشوروف ابھی تک پوری طرح مجھ پر نہیں کھلا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ ڈاکٹر رچرڈ کی نسبت
موشوروف سے میری معرکہ آرائیاں کم رہی تھیں اس کی حکمت عملی بھی ڈاکٹر رچرڈ سے قطعی مختلف تھی۔ میں
اسی سب اسے ڈاکٹر رچرڈ سے زیادہ خطرناک کہتی اور سمجھتی تھی۔ تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود میں اسی
لیے بے حد چوکنا تھی ملک دلاور کی کوشش پہنچنے تک میں موشوروف ہی کے متعلق سوچتی رہی۔

کوشش کے کمپاؤنڈ میں مجھے وہ کار نظر آ گئی تھی جو ذکیہ کے لے کر آئی تھی۔ کار سے اتر کر جلد ہی

ملک دلاور کے ملازم کی رہنمائی میں اندر پہنچ گئی۔ ملک دلاور میرے بارے میں اپنے ملازم کو ہدایت

دے چکا تھا مجھے اس پر جھنجھلاہٹ تو ہوئی کہ ملازم نے ڈرائنگ روم میں کیوں بٹھا دیا مگر میں نے اس کا

اظہار نہ ہونے دیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے مجھے پانچ منٹ سے زیادہ ہو گئے تو غصہ آنے لگا۔ اس

دوران میں اندرونی سمت سے مجھے کئی بار ملک دلاور اور ذکیہ کے بھرپور قہقہے بھی سنائی دیے۔ جب میرا

غصہ بڑھنے لگا تو میں اٹھ کر ٹھٹھکی گئی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے میرے قدموں کی چاپ نہیں

ابھر رہی تھی۔ ملازم جیسے مجھے وہاں بٹھا کر بھول ہی گیا تھا۔ یہ تو مجھے خبر تھی کہ ملک دلاور کے گھر میں اس

کے اور ملازمین کے سوا کوئی اور نہیں رہتا اس کے علاوہ یہ بھی کہ کوشش بھی اندر سے میری دیکھی بھالی تھی۔

ملک دلاور جان بوجھ کر میرا خون کھولا رہا ہے، اس احساس کے باوجود میرا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ

پہلے بھی اس نے اسی سے ملتی جلتی ایک حرکت کی تھی آخر میں کب تک اپنا خون کھولتی رہتی مجبوراً ڈرائنگ

روم سے نکل کر بیچ و تاب کھاتی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی، اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کے میں ملک

دلاور کے کمرے تک پہنچ گئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”یہ کیا تیزی ہے ملک دلاور!“ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر غصہ ضبط کرتے کرتے

میں تقریباً چیخ اٹھی۔

کمرے میں لمحہ بھر کو سناٹا چھا گیا۔ ملک دلاور اور ذکیہ دونوں ہی گنگ سے ہو کر تصویر حیرت بن

گئے۔ دلاور کو شاید یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ اس کی شرارت کے نتیجے میں مجھے اس حد تک غصہ آ جائے گا۔

ذکیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا اور پھر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے

لگی جیسے میرا غصہ مذاق رہا ہو اسی سے شاید ملک دلاور کا حوصلہ بڑا گیا۔ اس نے جلدی سے کہا ”آپ کب

وہ پورا شعر پڑھنا غضب ہو جاتا۔

ملک دلاور بھی ایک کانیاں تھا، میری بات کا مطلب سمجھ گیا شاید اوسمکرانے لگا میں نے تیوریوں پر ہل ڈال لیے تو وہ بولا، ”ان بڑی بی کو بلاؤں اگر آپ ملنا چاہیں، وہ گرائیں ہیں اپنی، یعنی بیج دریاؤں میں سے ایک دریا کے کنارے آباد ایک گاؤں کی ہیں۔ انہیں آپ نے کئی سال پہلے نرگس کے گھر ناظم آباد میں دیکھا وگا۔ کچھ عرصے وہاں انہوں نے کام کیا تھا، پھر پنجاب چلی گئی تھیں۔ اپنے شوہر کے فوت ہونے پر وہ پھر کراچی آ گئیں، ابھی کوئی ہفتہ بھر پہلے نرگس نے مجھ سے ان کی سفارش کی کہ اپنے پاس رکھ لو۔ دراصل پجارے غریب غرباء بڑے لوگوں کو ایک آدھ دفعہ دیکھ کر بھی یاد رکھتے ہیں کہ خدا جانے ان سے کب کیا کام پڑ جائے، ہاں بڑے لوگ بھول جاتے ہیں انہیں! میں نے فون پر آپ سے ٹھیک ہی کہا تھا، ان ان پجاری بڑی بی پر رحم کریں وہ آپ کی طرح پراسرار نہیں ہیں۔“

”تو مسٹر دلاور آپ بھی باجی کو پراسرار سمجھتے ہیں حالانکہ.....“

”ذکیہ!“ میں نے ذکیہ کو گھور کر دیکھا۔

”سوری باجی!“ ذکیہ فوراً کٹ ٹو سائز ہو گئی، اس کے ذہن سے اس فضا میں شاید میری ہدایات نکل گئی تھیں۔

”سب پر آپ کی تری چلتی ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کاش کوئی آپ کو بھی اپنی تری میں رکھنے والا، یعنی آپ کا گھر والا ہوتا۔“

ملک دلاور نے کچھ ایسے لمحے میں یہ جملہ ادا کیا کہ میں ہنس پڑی اور ذکیہ تو میری موجودگی کے سبب جانے کب سے اپنی ہنسی روکے بیٹھی تھی! پھر خاصی دیر تک ہنسی کا دور چلتا رہا۔ ہم تینوں ہی قہقہے لگا رہے تھے یوں جیسے ساری دنیا میں ہم سے زیادہ خوش کوئی نہ ہو، میں نے اس دوران میں یہ بات بھی محسوس کی کہ ملک دلاور اور ذکیہ دوسری ہی ملاقات میں ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں دلاور نے کئی بار یہ کوشش بھی کی کہ میں اپنی سکونت کے متعلق کچھ بتا دوں مگر نہ صرف میں بلکہ ذکیہ بھی اس بات کو گول کر گئی۔ دلاور نے رات کا کھانا کھلا کر ہم دونوں کی جان پھوڑی تھی۔ جب بھی میں اٹھنے کا ارادہ کرتی، وہ اشارتاً امیر مینائی کا شعر سنانے کی ”ڈھمکی“ دے دیتا اور مجھے مجبوراً مزید بیٹھنا پڑتا۔ واپسی میں ذکیہ اور میں الگ الگ کاروں کے ذریعے اپنی کوٹھی پہنچے۔ ذکیہ کے ساتھ میں نے آج جی خاصا وقت گزار لیا تھا اس لیے اسے شب بخیر کہا تو وہ مزید گپ شپ کے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن صبح میں جلدی سو کر اٹھ گئی۔ ذکیہ اس وقت تک جاگ نہیں تھی۔ موقع غنیمت جان کر ناشتا کرتے ہی میں تیار ہوئی۔ میں نے اسی عرصے میں ڈرائیور سے کہلوایا تھا کہ وہ بھی آپریشن میل ہیڈ کوارٹر چلنے کے لیے تیار ہو جائے۔ میں عمارت سے باہر آئی تو وہ کار کے قریب مستعد کھڑا تھا۔ میں اپنی منزل پر پہنچ گئی تو مجھے ڈیوٹی روم میں کمانڈر نواز نظر آیا، تمام تیاریاں مکمل ہیں کمانڈر؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی ہاں میڈم!“ اس نے جواب دیا، پھر مزید بولا، ”یہ رہی صدر مملکت کے خصوصی اجازت

تشریف لائیں؟ ملازم نے مجھے بتایا ہی نہیں!“

”بہت زیادہ بھولے شاہ نہ بنو ورنہ بری طرح پیش آؤں گی۔“ میں آگے بڑھ کر ذکیہ کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی، ”تمہارے ہی ایما پر ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہوگا!..... کچھ بھی سہی“ میرے نزدیک شرارت سے زیادہ یہ واقعی بدتمیزی ہے۔“

”آپ چاہے بری طرح پیش آئیں یا زیر زبر ہوں، میں حلفیہ یہ بیان دینے کو تیار ہوں کہ یہ بدتمیزی خادم کی نہیں ہے میں ابھی اس ملازم کو بلا کر اس سے پوچھتا ہوں کہ آخر اسے اتنی جرأت کیسے..... سوری کیسے ہوئی کہ آپ جیسی عزت مآب خاتون کو اس نے.....“

”اسے تمہاری ہی ہدایت پر کچھ دیر کو کوشی سے رفو چکر ہو جانا چاہئے، اگر اس نے یہ نہیں کیا تو بے وقوفی کی ہے۔“

”اگر وہ آپ کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میری ہدایت پر رفو چکر نہیں ہوتا تو پھر اسے گھن چکر بنا دوں گا..... سوری، دیری سوری محترمہ عذرا خاتون! غلطی سے سچی بات زبان پر آ گئی۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

”غلطی نہیں مسٹر دلاور! اس لفظ کا تلفظ غا..... لا..... طی ہے“ ذکیہ نے بھی موقع دیکھ کر اس کی دھتکتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کیا کہا آپ نے طی!..... میں اسے ہی سمجھا تھا۔ خواتین اس لفظ کو بر محل استعمال کرتی ہیں اور کبھی کبھی ’سی‘ کے بعد ہائے اللہ بھی کہنا ضروری سمجھتی ہیں ہماری زبان میں بھی اسے لفظ کے معنی ہیں اور.....“

”مسٹر ملک دلاور! بات طی کی ہو رہی تھی، غلطی کا طی! آپ خواہ مخواہ عورتوں کی طرح ’سی‘ اور ہائے اللہ“ کرنے لگے، میری بجائے ذکیہ اسے گھسنے لگی۔

”آپ دونوں محترم خواتین! ایک کو اٹھاؤ دوسری کو بٹھاؤ کی طرح ہیں، یعنی چہرے مہرے اور گفتگو میں بھی! محترمہ ذکیہ خاتون آپ نے اپنی ہمیشہ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میں اسی لیے تو انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بھول گیا تھا۔“

”باجی ٹھیک کہہ رہی تھیں یہ بہر حال بد اخلاقی تھی۔“

”کبھی کبھی ایسی بھول چوک ہو جاتی ہے آخر بندہ بشر ہوں آپ کی باجی کی طرح تو نہیں ہوں نا۔“ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا، ”اگر آپ کو غصہ آ گیا تھا تو سوری“

”اب بھی اگر گھر کی گنجائش رہ گئی ہے۔“ جو جواب میں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

آپ کے اس طرح آنکھیں دکھانے پر مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ آنکھیں دکھلاتے ہو.....

”میں فوراً بول اٹھی، ”ملک دلاور ان بڑی بی کا کیا قصہ تھا، پہلے وہ بتاؤ، نظر نہیں آئیں“ میں نے فوراً ہی ملک دلاور کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنا چاہی کیونکہ کبھی کبھی وہ مچھلو پن پر بھی اتر آتا تھا۔ اس سے بعید نہیں تھا کہ پورا شعر پڑھ دیتا۔ ذکیہ کی وہاں موجودگی میں استاد داغ کے ہم عصر امیر مینائی کا

تائے کی فوٹو کاپی.....“ اس نے میری طرف فوٹو کاپی بڑھائی، میں نے اس پر ایک نظر ڈال کر اسے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ ”یہ کرشن کمار اور آپ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ٹیپ ہے۔“

میں نے وہ بھی لے کر پرس میں ڈال لیا اور بولی ”کرشن کمار کا کیا حال ہے اب؟ ہوش آ گیا اسے“

”ابھی کچھ دیر قبل اسے ہوش میں لایا گیا ہے۔“

”اور دوسرے مہمان یعنی جیفرسن کے کیا حال چال ہیں؟“

”وہ کچھ پھیلنے کی کوشش کر رہا تھا جب اسے بتایا گیا کہ یہاں سے کہیں اور منتقل کیا جانے والا ہے تیار ہو جائے تو وہ آپ سے ایک بار ملنے کی ضد کرنے لگا بہر حال اب وہ راہ راست پر لایا جا چکا ہے۔“

”اور کوئی خاص بات؟“ میں نے کماؤر نواز سے سوال کیا۔

”جی نہیں میڈم!..... مزید کوئی حکم ہو تو فرمائیں۔“

”ہاں یاد آیا وہ میرے ذاتی ملازمین کے سلسلے میں کیا رہا؟ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے

پوچھا۔

”آج شام وہ کسی وقت کوٹھی پر پہنچ جائیں گے میں اس سے پہلے آپ کو مطلع کر دوں گا۔“

کماؤر نواز نے بتایا۔

”اچھا تو پھر میں اب چلتی ہوں آئی جی سے مجھے دس بجے ملنا ہے اور اس وقت سوانو ہونے والے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں ڈیوٹی روم سے باہر نکل آئی۔

دوبارہ اپنی کار میں آ کر بیٹھے ہی میں نے ڈرائیور سے پولیس ہیڈ آفس چلنے کو کہا ”دوسرے ہی لمحے کار سٹارٹ ہو گئی۔“

”زیادہ تیز رفتاری سے چلنے کی ضرورت نہیں وہاں پہنچنے کے لیے دس بجے تک کا وقت ہے میرے پاس۔“ میں نے ڈرائیور کو ہدایت دی اور سیٹ سے سر نکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دس بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے کہ میری کار پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں داخل ہوئی میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے کار ایک طرف پارک کر دی اور جلدی سے اتر کر میرے لیے پچھلا دروازہ کھولا پھر مودب کھڑا ہو گیا میں کار سے اتر کر پرس تھا سے پولیس ہیڈ آفس کی عمارت میں داخل ہو گئی۔

مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ آئی جی میری پذیرائی کے لیے اپنے کمرے سے نکل کر باہر کھڑا ہوگا۔ ذاتی طور پر مجھے یہ کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا خواہ وہ کوئی بھی ہو اسے غیر ضروری اہمیت دینے سے دیگر اہم امور پر نظر نہیں رہتی۔ اسی خرابی کے سبب یہ مجبوری ہی میں بھی ادھر کارخ کرتی تھی۔ ایٹنی کیٹس یقیناً اہم ہوتے ہیں اور اخلاق بھی ضروری ہے مگر اس طرح کسی غیر سرکاری شخصیت کی پذیرائی مناسب نہیں ہوتی۔ میں آئی جی سے پہلے بھی مل چکی تھی مگر اس نے اس درجہ پذیرائی کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ شاید اسے سرکاری طور پر میری اہمیت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ اپنی غیر ضروری پذیرائی پر ناگواری

کے باوجود میں نے بھی اسے دس کیا اور پھر اس کے کمرے میں آ گئی۔

”آپ اپنی کرسی پر تشریف رکھیں۔“ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے کرسی پر بیٹھنا نہیں چاہتا۔

”آپ تو بیٹھیے!“ وہ خوش اخلاقی سے بولا۔

”میں اس وقت تک نہیں بیٹھوں گی جب تک آپ اپنی کرسی پر نہیں بیٹھ جائیں گے۔ میں آپ کی نہیں اس کرسی کی نگریم چاہتی ہوں جس پر بیٹھنے سے آپ گریز کر رہے ہیں۔“

”اچھا یہ بات ہے تو پھر میں آپ کے حکم کی تعمیل کیے دیتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

میں نے بھی پھر تکلف نہیں کیا اور اس کے رو برو ایک نشست سنبھال لی۔ اب مزید کسی تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بطور پیش بندی کہا ”میں ناشتا کر کے آئی ہوں نہ چائے پیوں کی نہ ٹھنڈا! بس وہ بات سن لیں جس کے لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔“

”جی بالکل فرمائیں۔“

میں نے کچھ کہنے سے پہلے اپنا پرس کھولا اور وہ ٹیپ نکال کر میز پر رکھ دیا جس پر میری اور کرشن کمار کی گفتگو ریکارڈ کی گئی تھی۔ پھر میں نے اس ٹیپ اور کرشن کمار کے بارے میں آئی جی کو ضروری معلومات فراہم کیں مگر درمیان میں آپریشن میل کا ذکر نہ آنے دیا۔

”صد فیصد یہ شخص پڑوسی ملک کا جاسوس معلوم ہوتا ہے میں آپ کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں اس شخص کو آپ ہمارے حوالے کر دیں۔“

”وہ بھی ہو جائے گا ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔“

”جی..... جی فرمائیے!“

”سولومن کیس یاد ہے آپ کو؟“ میں نے کہا اس کیس میں خود آئی جی سولومن کے خلاف آپریشن کا انچارج تھا۔

میری بات سن کر آئی جی چونک اٹھا ”جی ہاں بالکل یاد ہے اور..... اور ابھی وہ کیس ختم نہیں ہوا۔“

میں نے مختصر باغی امر کی ایجنٹ جیفرسن کے متعلق بھی آئی جی کو بتا دیا۔

”لیکن..... یہ..... یہ شخص اتنے دن سے تھا کہاں؟ آپ نے فرمایا ہے کہ اسے اس وقت پکڑا گیا تھا جب یہ آپ کی کوٹھی میں دقتی بم پھینکنے والا تھا۔ واقعات سے تو پتا چلتا ہے کہ یہ سولومن آپریشن سے پہلے کی بات ہے۔“

”جی ہاں میں نے تصدیق کی۔“ سولومن آپریشن پر تو آخری مرحلے میں عمل کیا گیا تھا۔ جیفرسن اس وقت سے اب تک میری تحویل میں رہا ہے اسے سولومن کے خلاف استعمال کیا جاسکتا تھا لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اسے بھی آپ کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ میں عرض کر چکی ہوں کہ وہ بھی سولومن کے ساتھیوں میں سے تھا باقی کارروائی آپ کر سکتے ہیں۔“

کمپاؤنڈ میں آپریشن سیل کی بند وین کو میری کار سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے پولیس افسر کو غیر محسوس انداز میں وین کی نشاندہی کرادی۔ وہ پولیس افسر وین کی طرف بڑھ گیا تو میں بھی مزید آگے بڑھی۔ وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر میجر شہباز بیٹھا تھا وہ میرا مخصوص اشارہ پاتے ہی دروازے کو کھول کر نیچے اتر آیا۔

کچھ ہی دیر میں کئی مسلح پولیس والے وین تک پہنچ گئے۔ میں اب اپنی کار تک پہنچ چکی تھی۔ اسی وقت میرے آدمیوں نے وین کا پچھلا دروازہ کھول کر پہلے کرشن کمار کو باہر نکالا، پولیس والوں نے اسے جھکڑیاں پہنا دیں اور عین اسی لمحے میرے ذہن میں ہلکی سی سنناٹا ہوتی۔ اسی کے ساتھ میں نے شدید خطرہ محسوس کیا۔ میری نظریں کرشن کمار پر جمی ہوئی تھیں جو سینہ تھامے جھکتا چلا جا رہا تھا، اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”جیفرسن اور کرشن کمار! یہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟ بالآخر وہ پولیس والوں کے مزاج کے مطابق اپنے فطری تجسس کو نہ دبا سکا اور سوال کر ہی بیٹھا۔“
”اس وقت وہ دونوں ایک بند وین میں میرے آدمیوں کی زیر نگرانی پولیس ہیڈ آفس کے احاطے ہی میں موجود ہیں۔“

”جی؟“ آئی جی اپنی حیرت پر قابو نہ پاسکا۔
”جی ہاں!“ میں نے مسکرا کر انکشاف کیا میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لائی تھی کہ آپ کے ہینڈ اور کردوں۔ مگر ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ سولومن کی طرح وہ دونوں بھی فرار نہ ہو جائیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے سولومن کو آپ کے سپرد کیا تھا تو وہ قطعی بے بس تھا۔“
”آئی جی کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار نظر آنے لگے تو..... تو وہ آپ..... آپ ہی تھیں؟“

”بالکل..... کہیں تو یہ بھی بتا دوں کہ سولومن کے فرار کے بعد آپ کس طرح بدحواس ہو کر اس کوشی سے نکلے تھے!“
”مجھے یقین آ گیا مجھے!..... آئی ایم ویری سوری! اس..... اس معاملے میں ہرگز ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ مجھے یقین دہانی کرانے لگا۔

”ایک آخری بات مجھے آپ سے اور عرض کرنا ہے کہ اس وقت بہ مجبوری میں نے سولومن کیس کے حوالے سے جو یہ باتیں آپ سے کی ہیں میرے اور آپ ہی کے درمیان وقتی چاہیں کیا میں یہ توقع رکھوں آپ سے؟..... اس لئے کہ میں اپنے طور پر اور اپنی دانست میں اپنے وطن عزیز کے لیے جو خدمات انجام دے رہی ہوں کسی بھی سطح پر ان کی تشہیر نہیں چاہتی۔ تشہیر سے میرے کام میں رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی اس سے زیادہ میں کچھ عرض نہیں کرنا چاہتی۔“
”اس سلسلے میں آپ مجھ پر مکمل بھروسہ کر سکتی ہیں انشاء اللہ کبھی اور کہیں میری زبان پر یہ بات نہیں آئے گی۔ آئی جی کے لہجے میں خلوص اور اپنائیت تھا۔

”شکریہ!..... اب اٹھیے اور ان دونوں بندوں کو اپنے چارج میں لے لیجئے!..... یا اگر آپ مناسب سمجھیں تو خود باہر تک جانے کی بجائے اپنے کسی ماتحت کی ذیوبنی لگا دیں تاکہ کمپاؤنڈ میں موجود عام لوگوں کو معاملے کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو سکے۔

”آپ جو بھی فرمائیں میں اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔“
”تو پھر بغیر میرا تعارف کرائے اپنے کسی قابل اعتماد ماتحت کو میرے ساتھ کر دیں میں وین کی نشاندہی کر دوں گی پولیس والے جیسے ہی وین کے قریب پہنچیں گے میرے آدمی میرا اشارہ پاتے ہی وین کا پچھلا دروازہ کھول دیں گے۔ یہ معاملہ کیونکہ دو غیر ملکی جاسوسوں اور ملکی سالمیت سے تعلق رکھتا ہے اس لئے میں اتنی احتیاط اور رازداری برت رہی ہوں آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔“
پھر آئی جی نے میرے ایما کے مطابق تمام بندوستانہ کر دیا تو میں اس کے کمرے سے نکل پھر آئی جی۔ ایک پولیس افسر بظاہر اجنبی کی طرح میرے ساتھ ہولیا تھا۔

پولیس ہیڈ آفس کے کمپاؤنڈ میں کھیلے جانے والے اس خونی ڈرامے کا علم آئی جی کو بھی ہو گیا مگر جب تک وہ باہر آیا اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ حملہ آور زخمی نوجوان کو کشاں کشاں وہاں سے لے جایا جا چکا تھا میرے ایما پر جیفرسن کو بھی پولیس کی تحویل میں دیا جا چکا تھا اور کرشن کمار کی لاش بھی اٹھوائی جا چکی تھی۔ اس کے علاوہ سیل کے ارکان بھی میرے ہی اشارے پر بندوین میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔

اب اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے یاد نہیں کہ اس سنسنی خیز واقعے کے چشم دید گواہ وہاں کتنے تھے مگر کیونکہ یہ واقعہ غیر ملکی ایجنٹوں سے متعلق تھا اور میں اسی لیے اتنی رازداری اور احتیاط سے کام لے رہی تھی اسی سبب اس واقعے کی تشہیر کو روک دیا گیا نہ اخبارات کو اس کی ہوا لگنے دی گئی تھی نہ چند افراد کے سوا کسی کو اصل واقعے کے اسباب کا علم ہو سکا تھا۔ آئی جی اور اس کے چند ماتحتوں کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی کہ اصل معاملہ کیا تھا۔

موجودہ حالات کے پیش نظر وہاں میرا مزید رکنا ناگزیر تھا۔ کرشن کمار کے قتل کا معاملہ کرنا ہر چند کہ اب پولیس کا درد سر تھا، لیکن ذاتی طور پر خود میں بھی جس میں مبتلا تھی ایک شخص جس کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور اسے کب پولیس کے حوالے کیا جائے گا اس شخص کو عین اس وقت کس طرح ٹھکانے لگا دیا گیا۔ جب پولیس اسے اپنی تحویل میں لے چکی تھی؟ آخر کرشن کمار کو قتل کرانے والوں کے ذرائع معلومات کیا تھے؟ میرے اور سیل کے چند ارکان کے سوا کسی کو بھی تو یہ معلوم نہیں تھا کہ کرشن کمار کو پولیس کے حوالے کیا جانے والا ہے پھر کس طرح اور کس سطح پر یہ بات لیک آؤٹ ہوئی؟ اگر ایسا نہیں تھا تو پھر کرشن کمار کے قتل کو کس خانے میں رکھا جاسکتا تھا؟ وجہ قتل تو ظاہر تھی اسے قتل کرانے والے یہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ وہ اقبال جرم کر لے۔ کرشن کمار کے اس اعتراف کا مطلب کہ وہ واقعی پڑوسی ملک کا جاسوس ہے پڑوسی ملک کے لیے سودمند ثابت نہ ہوتا اس اعتراف سے پہلے ہی اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی گئی تھی۔

کرشن کمار کے قتل کی وجہ سے میرے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوئے انہیں سوالات نے مجھے وہاں مزید رکنے پر مجبور کر دیا اس الجھی ہوئی تھی کا ایک سرا بہر حال ابھی میرے ہاتھ میں تھا اور دوسرا کرشن کمار کی کار پر گولی چلانے والا نوجوان تھا۔ سیل کے ارکان کی بیدار مغزی کے سبب وہ حملہ آور نوجوان اگر حراست میں نہ آ گیا ہوتا تو شاید یہ معما ہی رہتا میں اسی غرض سے آئی جی کے ساتھ واپس عمارت کی طرف چلتے گئی۔

”آئی ایم ویری سوری میڈم!“ آئی جی نے میرے ساتھ چلتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

”کس لیے؟..... اس میں آپ کا کیا آپ کے آدمیوں کا تو کوئی قصور نہیں ہے جو کچھ ہوا قطعی غیر متوقع تھا۔“ میں نے بھی دھیمے لہجے میں بات کی۔

”آفٹر آل..... میں خود کو اس سے بڑی الذمہ نہیں سمجھتا یہ واقعہ بہر حال پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں رونما ہوا ہے۔“

یہ سامنے کی بات تھی کہ کرشن کمار کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ہے گولی کسی ایسے ریوالور سے چلائی گئی تھی جس پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا ورنہ یہ دھماکا ضرور سنائی دیتا پھر اس سے پہلے کہ معاملے کی تائید پہنچ کر خود مجھے حرکت میں آنا پڑتا سیل کے ارکان نے صورتحال کو تیزی سے سنبھال لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا کسی فاسٹ ایکشن مووی کے مانند تھا۔ ممکن ہے یہ واقعہ بیان کرنے میں مجھے اس سے زیادہ دیر لگ جائے جتنے عرصے میں تیزی کے ساتھ یہ واقعہ رونما ہو گیا، لیکن ہوا سب کچھ بہت جلدی۔

سائیلنسر چڑھے ہوئے ریوالور سے کرشن کمار پر گولی چلانے والا نوجوان ایک کار میں تھا جیسے ہی کرشن کمار کو پھٹکڑیاں پہنائی گئیں اس نوجوان کی کار حرکت میں آ گئی اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ کار کی کھڑکی سے باہر نکالا اور کرشن کمار کے سینے پر فائر کرتا ہوا سرعت سے کمپاؤنڈ کے گیٹ کی طرف اپنی کار بڑھالے گیا میری نگاہ کیونکہ کرشن کمار پر بھی اس لیے میں خود یہ سب کچھ نہ دیکھ پائی۔ مجھے بعد میں سیل کے ارکان سے ان ساری تفصیلات کا علم ہوا تھا وہ اپنی اطراف سے پوری طرح چوکنا تھے۔ حملہ آور نوجوان کی کار کمپاؤنڈ کے مین گیٹ تک نہ پہنچ سکی تھی کہ پے درپے گئی دھماکے ہوئے مگر یہ دھماکے فائر دیں کے نہیں تھے سیل کے ارکان نے بھی سائیلنسر چڑھے ہوئے ریوالوروں سے حملہ آور کی کار کو نشانہ بنایا تھا۔ دھماکے کار کے اگلے پچھلے ٹائر برسٹ ہونے کے تھے۔ کار کے ٹائر برسٹ ہوتے ہی شاید حملہ آور نوجوان کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا اس نے انتہائی سرعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کار کا دروازہ کھولا اور ایک طرف بھاگ کر قریب ہی کھڑی ہوئی ایک جیب کی آڑ لینا چاہی اس کے ہاتھ میں ریوالور اب بھی تھا لیکن جیب تک پہنچتے پہنچتے وہ جج مار کر ڈھیر ہو گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور ہاتھ لے خون بہہ رہا تھا۔ سیل کے رکن میجر شہباز نے اس کے ہاتھ کا کامیاب نشانہ لیا تھا۔

پولیس والوں کو غالباً اس وقت ہوش آیا جب حملہ آور نوجوان زمین پر ڈھیر ہو کر دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا وہ سب تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکے۔ کرشن کمار کے گولی لگنے ہی سیل کے ایک رکن نے دین کا پچھلا دروازہ بند کر دیا تھا تاکہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امریکی ایجنٹ جیفرسن فرار نہ ہو جائے۔

میں جب دین کے قریب پہنچی تو کرشن کمار آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔

میں نے آئی جی کی دعوت قبول کر لی۔ وہ اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایات دے کر مجھے ماتھ لیے اپنے کمرے میں آ گیا کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے دروازے پر مستعد لکڑے ہوئے کانسیل سے چائے کے لیے بھی کہہ دیا تھا اور یہ بھی کہ کسی کو کمرے میں نہ آنے دیا جائے۔

اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد آئی جی نے کچھ اسی سے ملتے جلتے سوالات شروع کر دیئے جو نو دیر کے ذہن میں پہلے آچکے تھے۔

”آپ کے ان تمام سوالوں کے جواب وہی نو جوان دے سکتا ہے جس نے کرشن کمار کو قتل کیا ہے۔“ میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”یہ بھی تو امکان ہے کہ وہ محض درمیانی کڑی ہو اور اسے کچھ معلوم نہ ہو۔“

”ممکن ہے“ میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”اسے صرف قتل کرنے کے لیے بھی آلہ کار بنایا جاسکتا ہے اس کے باوجود اصل مجرم تک پہنچنے کی کوئی نہ کوئی راہ ضرور پیدا ہو جائے گی۔ اس سے قطع نظر یہ بات تو بہر حال واضح ہے کہ کرشن کمار کو قتل کرانے میں کسے دلچسپی ہو سکتی ہے!..... اصل مسئلہ کچھ اور ہے!..... ابھی تو آپ نے جو سوالات کیے وہ خود میرے لیے بھی

ہواب طلب ہیں۔ یہ معاملہ قیاسات پر مبنی معلوم نہیں ہوتا۔ حالات اور واقعات کی روشنی میں یہی ظاہر ہوتا ہے جیسے سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا۔ کوئی بھی ذہن خاص ان واقعات سے یہی نتیجہ اند کرے گا۔ میں غیر جانبدارانہ طور پر ان واقعات کو مختصراً بیان کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کرتی ہوں۔ اس میں نہ آپ پارٹی ہیں نہ میں! یوں سمجھئے کہ ایک معزز اور با اعتماد شہری کسی ملزم کو پولیس لے حوالے کرنے لاتا ہے۔ عین اس وقت ملزم کو قتل کر دیا جاتا ہے جب وہ پولیس کی تحویل میں دیا جاتا ہے۔ اس واقعے سے کئی سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ معزز شہری جس پر پولیس نے اعتماد کیا، کیا واقعی اعتماد کے قابل تھا؟ نمبر دو یہ کہ اگر وہ اعتماد کے قابل تھا تو کیا اس کے ماتحتوں پر بھی اعتماد کیا جاسکتا ہے!..... کہیں انہی میں سے کوئی تو اصل مجرم یا مجرموں سے ملا نہیں تھا؟..... ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ ایسا نہیں تھا، وہ شہری اور اس کے ساتھی قابل اعتماد ہیں تو ای صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کس طرح اصل مجرم یا مجرموں کو یہ خبر ہوئی کہ ان کا بندہ پولیس کے حوالے کیا جانے والا ہے؟ چلیں یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ کسی طرح قیاس کے سبب یا ان اور ذریعے سے یہ معلوم ہو گیا کہ ایسا ہونے والا ہے تو پھر سچ مقام اور وقت کا تعین کیسے کیا گیا؟ اور پہلے ہی سے ایک شخص کو قتل پر کس طرح مامور کر دیا گیا؟..... یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہر ذہن خاص کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں اور..... میں مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں عقب سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی۔ آنے والا آئی جی کا اردلی تھا جو چائے کی تہ اٹھائے ہوئے تھا۔ چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات بھی تھے۔

اردلی چلا گیا تو میں نے چائے پیتے ہوئے آئی جی کو مشورہ دیا کہ اس دوران میں کرشن کمار اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کا ٹیپ سن لے۔ اسے اب تک وہ ٹیپ سننے کا موقع نہیں

”لیواٹ!“ میں بولی۔ ”میں فوری طور پر اس نو جوان سے ملنا چاہتی ہوں جس نے کرشن کمار پر گولی چلائی تھی اب صرف وہی کلو ہمارے ہاتھ میں رہ گیا ہے۔“

”یقیناً!“ آئی جی میری تائید میں بولا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد میں آئی جی کے ہمراہ اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں کرشن کمار کے قاتل سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں پولیس والوں نے مار مار کر اس کا براہر کر دیا تھا۔ یقیناً وہ نو جوان رحم کا شوق نہیں تھا اس کی زبان کھلوانا بھی ضروری تھا اور یہ بھی کہ وہ قاتل تھا مگر اس کے باوجود ایک دم ”تھرڈ ڈگری“ کا استعمال مجھے کچھ بھلا نہیں لگا۔ پولیس والوں نے اسے ”فٹ بال“ بنایا ہوا تھا۔ جب آئی جی میرے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا تو ان کا یہ ”کھیل“ ایک دم رک گیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی۔ آئی جی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے پھر اس نے اپنے ماتحتوں کو ڈانٹ پلائی میرے خیال میں بھی وہ لوگ کیس لگا کر رہے تھے۔ ایسے معاملات میں فوری طور پر تشدد کی بجائے نفسیاتی حربوں سے کام لیا جاتا ہے۔ کئی کو تشدد کر کے زخمی یا ہلاک کر دینا بہت آسان ہوتا ہے مگر اس سے اقبال جرم کرا لینا بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ایسے افراد سے جن پر غیر ملکی جاسوس ہونے کا الزام ہو!

اس حملہ آور نو جوان کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں فرش پر بڑا کر رہا تھا اس کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی بھی نہیں کی گئی تھی اس میں شک نہیں کہ بعض کیسز میں ”تھرڈ ڈگری“ کا استعمال ہی سب سے موثر ثابت ہوتا ہے اور یہ پیش بھی غلط نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھی بھاگتا ہے مگر یہ کلیہ نہیں ہے ہر کیس پر اسے اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ مارشل آرٹ کی تربیت کے دوران میں تو خاص طور پر اس طرح کی مشقیں کرائی جاتی ہیں جس فرد میں جتنی زیادہ قوت برداشت ہوتی ہے وہ اتنا ہی بہتر ثابت ہوتا ہے۔ کئی افراد مل کر ایک فرد کو زد و کوب کر رہے ہیں اور وہ مار برداشت کرتا رہتا ہے خود ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ بعینہ یہی طریقہ تربیت ان افراد کا بھی ہوتا ہے جو دوسرے ممالک میں جا کر اپنے ملک کے مفادات کی خاطر جاسوسی کرتے ہیں اسی سبب تھرڈ ڈگری یعنی تشدد ان پر زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتا۔ آئی جی کیونکہ سمجھدار تھا اسی لیے اس نے ایسا کرنے پر حتمی کا اظہار کیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ پہلے اس کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کی جانا چاہئے۔“ میں نے آئی جی کو مخاطب کیا۔ ”اس کے بعد بھی اسے پوری طرح اپنے حواس میں آنے کے لیے کچھ وقت لگا اسی صورت میں اس سے پوچھ گچھ ممکن ہے آپ کے خیال میں کتنی دیر لگے گی..... میرا مطلب یہ کہ کب تک مجھے انتظار کرنا پڑے گا؟“

آئی جی غالباً میرے سوال کا مقصد سمجھ گیا اور بولا ”کم از کم ایک گھنٹہ!..... اس دوران میں آپ مناسب سمجھیں تو میرے کمرے میں انتظار کر لیں۔ اگر اسے تکلف کا نام نہ دیں تو عرصے میں ہم لوگ چائے بھی پی لیں گے۔“

اگر آپ مانتے نہ کریں اور میری درخواست ذاتی طور پر قبول کر لیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ خود آپ اس سے جس طرح بھی چاہیں پوچھ گچھ کریں۔ آپ چاہیں گی تو میں خود بھی آپ کی معاونت کیلئے ساتھ رہوں گا اور اسے اپنے لیے اعزاز سمجھوں گا۔ آئی جی منکسر المزاجی سے کہنے لگا۔

”اعزاز کیا جناب!..... مجھے تو آپ حکم دینے کے مجاز ہیں۔ یہ آپ کا محکمہ ہے اور میں بہر حال باہر سے آئی ہوں۔ یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے کہ آپ مجھے اتنی عزت بخش رہے ہیں۔ سرکاری معاملات میں مداخلت میرا منصب نہیں ہاں ایک شہری ہونے کی حیثیت سے قانون اور قانون کے رکھوالوں کی مدد کرنا میرا فرض ضرور ہے۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ اس حملہ آور نوجوان کا بیان لوں۔ آپ کیلئے میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ اس کیس کو خود ذیل کرنے کی بجائے اسے سنٹرل انٹیلی جنس والوں کے سپرد کر دیں۔ ہاں اس سلسلے میں ابتدائی کارروائی اور ضروری خانہ پری بہر حال آپ کی ذمہ داری ہے۔“

آئی جی نے میرے مشورے سے اتفاق کیا، پھر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اردلی کو بلا کر اپنے ایک ماتحت کو طلب کیا۔ اردلی چلا گیا تو وہ مجھ سے بولا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ اب تک حملہ آور نوجوان اپنے حواس میں آچکا ہو گا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔“

میں نے صرف اثبات میں سر ہلانا کافی سمجھا اور خاموشی کے ساتھ آئی جی کے ماتحت کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

آئی جی کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کے ایک ماتحت افسر نے یہی رپورٹ دی کہ اب حملہ آور نوجوان اس قابل ہو گیا ہے کہ اس سے ضروری پوچھ گچھ کی جاسکے۔ یہ سنتے ہی آئی جی اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں کی۔

اس کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے جہاں کرشن کمار کے قاتل کو رکھا گیا تھا، میں نے آئی جی کے ماتحت افسر سے سوال کیا۔ ”آفسر! آپ لوگوں نے اس نوجوان کی تلاشی تو لے لی ہوگی ابھی طرح یا..... نہیں؟“

”جی..... جی ہاں..... جی۔“ اس نے جواب میں کہا۔

”جہاں تک میرا اندازہ ہے آفسر! آپ کو اس سلسلے میں کوئی علم نہیں..... خیر کوئی بات نہیں، ہم خود ہی وہاں چل رہے ہیں، دیکھ لیں گے۔“ میں نرمی سے بولی۔

آئی جی نے سخت نظروں سے اپنے ماتحت کو دیکھا اور اس کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔ ایسے مانا، ”اچھی طرح“ نے گڑ بڑا دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تلاشی سرسری طور پر لی گئی تھی اور بعد میں یہ بات درست بھی ثابت ہوئی۔

ذرا ہی دیر بعد آئی جی اور آئی جی کے ماتحت افسر، ہم تینوں اس کمرے میں پہنچ گئے۔ پولیس والوں نے بہر حال اتنی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا کہ کرشن کمار کے قاتل کو ایک کرسی سے اندھ کر بٹھا دیا تھا اور کمرے میں ایک مسلح پولیس والا بھی اس کی نگرانی کیلئے موجود تھا۔ میرے کہنے

ملا تھا جو خود میں نے ہی اسے فراہم کیا تھا۔ کرشن کمار کے قتل کے بعد اب اس ٹیپ کی اہمیت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ آئی جی نے کیس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر منگوایا اور پھر چند ہی لمحے بعد مقتول کرشن کمار کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ پہلے وہ باتیں سنائی دی تھیں جو ابتدا میں کرشن کمار سے میں نے کی تھیں۔ میں نے اس سے اپنی گفتگو کے آخر میں نام بتانے اور اس جگہ کی نشاندہی کے لیے کہا تھا جہاں کا وہ رہنے والا تھا جواباً کرشن کمار نے کہا تھا۔ ”میرا نام کرشن کمار ہے اور میں اندرون سندھ کا رہنے والا ہوں۔“ ٹیپ پر کرشن کمار اور میرے درمیان ہونے والے سوال جواب سنائی دیتے رہے۔ آئی جی توجہ سے سب کچھ سنتا رہا۔ کرشن کمار اپنی کہانی سنا چکا تو میری آواز ابھری۔ ”کرشن کمار! تم یقیناً ایک اچھے اداکار ہو تمہاری تربیت ذہین لوگوں نے کی ہے تم اگر جاسوسی کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے اداکاری کے فن کو اپناتے تو اس سے زیادہ کامیاب رہتے!“

ٹیپ چلتا رہا، ”ثبوت دیکھنا میرا کام نہیں ہے یہ کچھ اور لوگوں کا کام ہے جو وہ اسے طور پر انجام دیں گے۔ اگر تم واقعی بے گناہ ثابت ہوئے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا، خدافظ!“

”جھگڑاؤں کے لیے..... خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں.....“ کرشن کمار کی سسکیاں اور رونے کی آواز کے ساتھ میرے قدموں کی دور دوری چپ سنائی دی اور پھر ٹیپ ختم ہو گیا۔ آئی جی نے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آف کر دیا۔

آئی جی کے چہرے سے بیک وقت حیرت اور عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا جس کا اظہار اس نے الفاظ میں بھی کیا۔ ”حیرت انگیز مسٹر راخان!..... آپ انتہائی غیر معمولی ذہن کی مالک ہیں..... یہ میں کسی اور..... اور سبب نہیں بلکہ حقیقتاً اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کی وجہ سے کہہ رہا ہوں۔ آپ نے مقتول کرشن کمار کی پتھریک ستوری کے باوجود قطعی صحیح نتیجہ اخذ کیا۔“

یقیناً پڑوسی ملک کا جاسوس ہی تھا۔

”خیر اب وہ قصہ تو تمام ہوا..... اصل مسئلہ ابھی بدستور موجود ہے۔“ میں بول اٹھی۔

جگہ جہاں میں نے کرشن کمار کو رکھا تھا اور جہاں اس کا یہ بیان ٹیپ کیا گیا، میرے اور میرے ساتھیوں کے سوا کسی کے علم میں بھی نہیں ہے۔ آپ اسے ایک محفوظ قلعے کے مانند سمجھ سکتے ہیں۔ وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ جن ملک دشمن عناصر سے میں اب تک برسرِ پیکار رہی ہوں، اپنی تمام تر کوششوں اور ذرائع کے باوجود اس جگہ کا سراغ نہیں لگا سکے۔ یہ خود ستانی نہیں حقیقت ہے کہ تخریب کاروں اور ملک دشمنوں کیلئے میں اور میرے ساتھی ہمیشہ خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ میری محفوظ پناہ گاہ ہے۔ اس تک کسی کا پہنچنا ممکن نہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا!..... یہ سب کام میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ آپ اس کیس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں۔ ان حالات میں شخص جو زیرِ حراست ہے، میری مراد کرشن کمار کے قاتل سے ہے، سو وہ خاصا اہم ہو جاتا ہے۔ اگر کا بیان بہت سی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا سکتا ہے، مگر شرط وہی ہے کہ وہ زبان کھول دے یا اس کا زبان کھلوائی جاسکے!“

نوجوان کے منہ سے نکلے ہوئے ایک لفظ نے میرے کئی سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ اس نے میری باتوں کے جواب میں صرف ”ماتا جی“ یعنی ”ماں“ کہا تھا۔ اس ایک لفظ سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی تھی کہ وہ مسلمان نہیں ہندو ہے دوسری بات یہ کہ میں نے جو مفروضات قائم کر کے اس سے گفتگو کا آغاز کیا تھا وہ سو فیصد درست تھے۔ وہ بھی کرشن مکاری طرح پڑوسی ملک کا ایجنٹ تھا۔ ”یہ نوجوان قابل رحم ہے۔“ میں نے آئی جی کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا ”اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیں۔ یہ شاید اب خودکشی کا ارادہ بدل دے۔ اس نے کسی ایسے ہی موقع کے لیے اپنے پاس کوئی زود اثر زہر چھپا رکھا ہوگا۔ وہ اس سے لے لیں کیونکہ ابھی اسے زندہ رہنا ہے۔ اسے اپنی ماں کے پاس پہنچنا ہے!“

”نہیں!“ وہ نوجوان خلاف توقع ایک دم چیخ اٹھا ”مجھ پر رحم نہ کرو! مجھے قتل کر دو مار دو مجھے!“

میری ماں میری دھرتی ہے!..... دھرتی ماں!..... میں اس سے غداری نہیں کر سکتا!..... میں..... میں تم لوگوں کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گا..... کچھ بھی!..... چاہے تم لوگ مجھے قتل ہی کیوں نہ کر دو؟ اپنی دھرتی ماں پر قربان ہو جاؤں گا..... امیر ہو جاؤں گا!“

”سنو نوجوان!“ میری آواز میں بے حد نرمی تھی۔ ”ہمیں تم سے کچھ نہیں پوچھنا“ کچھ بھی نہیں کیونکہ ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ پہلے سے معلوم ہے اور ہم تمہارے اس جذبے کی بھی قدر کرتے ہیں کہ تم اپنی مادر وطن پر قربان ہو جانا چاہتے ہو۔ ہم تمہارے اس جذبے کو سلام کرتے ہیں! تم یقیناً اپنی دھرتی ماں سے محبت کرتے ہو۔ اگر تم یہی چاہتے ہو کہ اپنی دھرتی ماں سے دور یہاں مارے جاؤ اور کوئی تمہیں رونے والا بھی نہ ہو تمہاری ارحمی بھی نہ اٹھے تو ہم ظاہر ہے کہ تمہاری خواہش کا احترام ضرور کریں گے۔ تمہیں اپنی دھرتی ماں پر قربان ہو کر امر ہو جانا چاہئے۔ تمہاری وہ ماں تمہیں یاد کر کے دم توڑ دے گی جس نے تمہیں جنم دیا تھا!“ میں اپنی بات ختم کر کے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی جس پر وحشت کے سے آثار تھے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر یہ خاموشی اسی نوجوان کی آواز سے ختم ہو گئی وہ مردہ سی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”اگر آپ لوگ مجھ سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتے تو پھر کیوں آئے ہیں میرے پاس؟“

”صرف یہ بتانے کے فریب دیا گیا ہے تمہیں!“ دھوکا کیا گیا ہے تمہارے ساتھ! تم لوگوں کے بھولپن، معصومیت اور حب الوطنی کو تمہارے ہی ملک کا ایک مخصوص ٹولا اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے استعمال کر رہا ہے دھرتی ماں کے نام!..... صرف تمہیں نہیں ہوتم سے نہ جانے کتنے نوجوان اس جنون میں مبتلا ہو کر مارے جا رہے ہیں؟ اور وہ جو انہیں ایوانوں میں بیٹھ کر راج کر رہے ہیں انہیں تمہاری اور تم ایسے پاگلوں کی کوئی فکر نہیں۔ وہ تمہارا استحصال کر رہے ہیں۔ اپنے اقتدار کو مختلف بہانوں سے قائم رکھنے کیلئے وہ تمہارے خلوص، تمہاری انسانیت اور وطن سے تمہاری محبت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ غربت، بیروزگاری اور جہالت کی طرف سے اپنے عوام کی توجہ ہٹانے اور بنانے کی خاطر وہ پڑوسی ممالک سے خواہ مخواہ دشمنی کا رویہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ صرف

پر آئی جی نے اپنے ماتحت افسر اور مسلح پولیس والے کو کمرے سے باہر نکال دیا اور پھر اندر سے دروازہ بھی بند کر لیا۔

میں نے قاتل نوجوان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اس کے زخمی ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے ایک اور خاص بات نوٹ کی۔ آئی جی کمرے کا دروازہ بند کر کے میرے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ دانستہ میں نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔ فوری طور پر نوجوان نے رد عمل کا اظہار کیا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی پھیپی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اسی لمحے میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے زناٹے دار پھڑپھڑانے والے چہرے پر پڑا۔

”اجنٹ آدمی! تم اپنے سسرال میں نہیں آئے ہو!“

میں نے سخت لہجے میں کہا ”پھر اس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر بولی۔“ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی جائے گی! تمہیں دوبارہ فٹ بال بنایا جا سکتا ہے..... تمہاری انگلیوں کے ناخن پھینچے جا سکتے ہیں!..... تمہارے زخمی ہاتھ کے زخم پر حقیقتاً نمک چھڑکا جا سکتا ہے!..... اور..... اور تمہیں اسی کمرے میں ذبح کر کے تمہاری لاش بھی ٹھکانے لگائی جا سکتی ہے!..... وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس کی تمہیں توقع بھی نہ ہو مگر ایک بہتری کی صورت بھی ہے بچاؤ کا راستہ بھی ہے۔“ میں نے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کر لیا تھا اور براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سب کچھ کہہ رہی تھی۔ ”سنو! اپنے ملک..... اپنے وطن کے مفادات کی خاطر جان دے دینا یقیناً بڑی بات ہے لیکن مفادات کی جہدیں مقرر ہوتی ہیں!..... اگر ایک ملک کے مفادات سے دوسرے ملک کے مفادات پر ضرب پڑتی ہو تو یہ راہ راست نہیں ہے اور تم..... تم بھی راہ راست پر نہیں ہو!..... نہیں..... بولومت..... میں ابھی کچھ نہیں سننا چاہتی اور نہ تم سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں بے وقوف نوجوان کہ اگر تم خودکشی کا فیصلہ کر چکے ہو تو یہ غلط ہے!..... ابھی تمہیں زندہ رہنا چاہئے!..... یہاں اپنے وطن سے دور ایک اجنبی سرزمین پر تم قتل کر دیئے گئے مارے گئے تو سوچو ان کیلئے جو تم سے محبت کرتے ہیں اور یہاں سے ہزاروں میل دور تمہاری واپسی کے منتظر ہیں کیا تم ان سے ملے بغیر مر جانا چاہتے ہو؟..... کہ تمہارے سینے میں دل نہیں ہے؟ کیا بھی تم نے کسی سے محبت نہیں کی؟..... بولو تمہیں کسی سے محبت ہے؟..... جواب دو کہ کیا کوئی اس دنیا میں ایسا ہے جو تمہاری موت پر آنسو بہا سکے؟“

میں نے دیکھا کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی پلکوں کے گوشوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ہونٹ کاپنے لگے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔

”بولو!“ میں نے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔ ”جواب دو کون ہے وہ جسے تم سب سے

زیادہ چاہتے ہو؟“

”ما..... ماتا جی.....“ اس کے ہونٹ کاپنے لگے اور اسی کے ساتھ میں نے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ آئی جی دور کھڑا ہوا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ا

کرس ورنہ نہیں۔ گوپال کی نسبت کرشن کمار کم ذہین تھا۔ اس میں ایک اور کمزوری بھی تھی۔ وہ فضول خرچ اور سیر و تفریح کا بھی دلدادہ تھا۔ کراچی میں ان دونوں کا قیام یہاں کے ایک بڑے ہوٹل میں تھا۔ گوپال نے اس کی بھی مخالفت کی تھی مگر کرشن کمار نہیں مانا تھا۔ اس نے گوپال سے کہا تھا کہ اگر رقم ختم ہوگئی تو اپنے ملک کے کسی سفارتکار سے رابطہ قائم کر لیا جائے گا اور اس سے اپنی شناخت کرائے کے بعد رقم لے لی جائے گی۔ گوپال نے اس سے بھی اختلاف کیا اور کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ گوپال کو قائل کرنے کی خاطر کرشن کمار نے بالآخر اپنے ملک کے ایک سفارت کار سے رابطہ قائم کر ہی لیا۔ کرشن کمار اپنے مقصد میں کامیاب رہا، اسے خاصی رقم مل گئی تھی اور وہ آئندہ کیلئے بھی معاملہ طے کر آیا تھا۔ کراچی کے دوران قیام میں ان دونوں نے بڑی حد تک اپنے مشن کی تکمیل کر لی، مگر کرشن کمار کی فضول خرچی پھر رنگ لائی چند روز بعد ان دونوں کو کراچی سے لاہور کا رخ کرنا تھا مگر رقم کی پھر ضرورت پڑ گئی تھی۔ اسی دوران میں کرشن کمار نے کرائے پر ایک کار بھی حاصل کر لی تھی جو دونوں ہی کے استعمال میں رہتی تھی۔ جس روز کرشن کمار میرے آدمیوں کے ہتھے چڑھا، کرائے کی کاڈ گوپال کے مصرف میں تھی۔ کرشن کمار نے گوپال سے کہا تھا کہ وہ سفارت کار سے رقم لے کر ایک مقررہ مقام پر اس کا انتظار کرے گا۔ گوپال کو اس طے شدہ مقام تک پہنچنے میں چند منٹ کی دیر ہوگئی۔ اسی میں کرشن کمار اپنے ملک کے ایک سفارت کار کی کار سے اتر کر سیل کے ارکان کی نظر میں آ گیا۔ جس وقت سیل کے ارکان کرشن کمار کو اٹھا کر لے جا رہے تھے، گوپال کی کار وہاں پہنچ چکی تھی۔ اسے فوری طور پر گڑ بڑ کا احساس ہو گیا۔ اس نے انتہائی محتاط رہ کر سیل کے پٹرولنگ یونٹ کی بند وین کا تعاقب کیا اور آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی عمارت تک پہنچ گیا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ یہ عمارت انٹیلی جنس والوں کی ہے۔ وہ اسی لیے رات بھر دوری دور رہ کر عمارت کی نگرانی کرتا رہا۔ پھر جب دوسرے دن صبح وہی بند وین آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے پولیس ہیڈ آفس کی طرف روانہ ہوئی تو گوپال پھر اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کے بعد جب یہ مرحلہ درپیش ہوا کہ کرشن کمار کو بند وین سے اتار کر حراست میں لے لیا گیا تو گوپال نے اسے قتل کر دینے کا فیصلہ کیا کہ کہیں وہ تشدد کیے جانے پر زبان نہ کھول دے۔ پھر جو کچھ ہوا، میں پہلے بیان کر ہی چکی ہوں۔

گوپال یقیناً ذہین اور انتہائی چالاک نوجوان تھا جس نے سیل کے ارکان کو بھی جل دے دیا تھا۔ وہ پہلا غیر ملکی ایجنٹ تھا جو آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گیا تھا ورنہ اس سے پہلے بھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس واقعے سے یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ تمام تر احتیاط کے باوجود سیل کے ارکان کو مزید احتیاط اور مستعدی کی ضرورت ہے۔ گوپال ہی کی طرح کوئی اور بھی غیر ملکی ایجنٹ ان کا تعاقب کرتا ہوا آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر تک پہنچ سکتا ہے۔ میرے آدمیوں کو بہر حال اتنا چوکنا تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ کہیں کوئی ان کے تعاقب میں تو نہیں! یہ نگلیب جینس میرے نزدیک قابل معافی نہیں تھی۔ یہ میرے نزدیک بھیا نک غلطی تھی۔ پٹرولنگ یونٹ کے انچارج سے اس ضمن میں جواب طلبی لازمی تھی۔ اسے آخر تعاقب کیے جانے کا احساس کیوں نہ ہو

اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی خاطر ہے۔ اور تم..... تم ایسے نوجوان نادانستی میں ان کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں!..... تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ ان کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ بڑی ممالک میں اپنے ایجنٹ بھیج کر وہاں گڑ بڑ پھیلانے اور اپنے ملک کے عوام کو دھوکا دینے کا مطلب کیا ہے!..... سنو! میں بتاتی ہوں تمہیں!..... وہ تمہارے ملک کے باقتدار افراد تمہارے اوپر جنگ مسلط کرنا چاہتے ہیں اور جنگ اس لیے کہ تمہارے ملک کے عوام بھوکے ننگے ہونے کے باوجود جنگی جنون میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ اپنی بھوک بھول جائیں۔ انہیں یہ بات یاد نہ رہے کہ ان کے تن پر کپڑا نہیں ان کے رہنے کو گھر نہیں ہے! وہ اگر یاد رکھیں تو صرف یہ کہ ملک ہنگامی حالات سے دوچار ہے اور جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ تم ابھی بہت چھوٹے ہو اور نہیں جانتے کہ جنگ کتنی ہولناک چیز ہوتی ہے!..... مجھے تمہارے ملک کے غریب اور معصوم عوام پر رحم آتا ہے کہ وہ انجانے میں ایک سازش کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور سنو؟ تاریخی حقیقتیں اتنی آسانی سے نہیں بدلا کر تیں! اگر تم نے اتھاس (تاریخ) کا مطالعہ کیا ہے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ وہ تو میں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں جنہوں نے ملک گیری کی ہوس میں خود کو بھلا دیا۔ تمہارے نیا (لیڈر) جو تقریریں کرتے ہیں تمہارے ذہنوں میں جو ہر گھولتے ہیں وہ غلط ہے! انہیں ایک نہ ایک دن دل سے تاریخ کے فیصلوں کو قبول کرنا پڑے گا..... کچھ آ رہا ہے تمہاری سمجھ میں؟“ میں بر جوش لہجے میں بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گئی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس نوجوان کی نظریں پچی ہیں اور سر جھکا ہوا ہے۔ یقیناً میری باتوں کا اس پر اثر ہوا تھا۔ پھر مجھے اس نوجوان کو رام کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے اس کے مفروضہ نظریات و عقائد پر پھر پور ضرب لگائی تھی اور اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ اس کی قربانی رائجٹا جائے گی اور یہ کہ اسے واقعی مرنا نہیں چاہئے۔ اس کے بعد آئی جی نے نوجوان ہی کی نشاندہی پر اس کے ایک موزے سے چھوٹی سی بڑا نکال لی جس میں تیز قسم کا زہر موجود تھا۔ وہ کاغذ کی پڑیا پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی سیلی میں محفوظ تھی۔

میں نے ابھی تک اس سے دانستہ بیان دینے کیلئے نہیں کہا تھا۔ رفتہ رفتہ میں خود ہی اسے ایسے مرحلے تک لے آئی تھی کہ وہ زبان کھول دے۔ یہ مرحلہ آنے سے پہلے ہی میں نے اشارتاً آئی جی سے کہہ دیا تھا کہ بیان ریکارڈ ہونا چاہیے اور آئی جی نے اس کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس نوجوان نے جو حقائق بیان کیے اور جنہیں ریکارڈ بھی کر لیا گیا، وہ مختصر یہ تھے۔ نوجوان کا نام ہر گوپال تھا اور وہ کرشن کمار ہی کی طرح راجستھان کا رہنے والا تھا۔ کرشن کمار اور وہ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے سندھ کے علاقے میں داخل ہوئے تھے ان کے پاس تمام ضروری کاغذات موجود تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی باشندے ہیں۔ یہ تمام کاغذات جعلی تھے۔ انہیں اس غرض سے پاکستان بھیجا گیا تھا کہ وہ یہاں اہم تنصیبات کے متعلق ضروری معلومات حاصل کریں۔ ان دونوں کو کراچی کے علاوہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی جانا تھا، انہیں سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ وہ اپنے ملک کے سفارت کاروں سے انتہائی مجبوری کی حالت میں رابطہ قائم

سکا۔ اس کے علاوہ میجر شہباز بھی قصور وار تھا۔ اس نے بھی غفلت کا ثبوت دیا تھا۔ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے پولیس ہیڈ آفس تک دین کا تعاقب کیا گیا اور وہ بے خبر رہا۔ گوپال کا بیان سن کر میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا۔ اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وہ اب میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور ان نظروں میں کچھ تقاضا بھی تھا۔ ابھی تک اسے کرسی سے کھولا نہیں گیا تھا۔

”سنو گوپال!“ بلا آخر میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ میرا کوئی بھی تعلق پولیس یا کسی سرکاری محکمے سے نہیں ہے۔ مجھے تم محض ایک محب وطن شہری سمجھ سکتے ہو۔ یہ بات میں نے تمہارے مقتول ساتھی کرشن کمار سے بھی کہی تھی۔ یقین نہ آئے تو ان سے تصدیق کر لو۔ میں نے آئی جی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں صرف قانون کی مدد کی خاطر اب تک تم سے گفتگو کرتی رہی ہوں۔ میں تمہاری نظروں کا مفہوم سمجھ چکی ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو! یہ معاملات سرکاری ہیں جن میں میری مداخلت ممکن نہیں۔ ہاں میں تم سے اتنا وعدہ ضرور کر سکتی ہوں کہ اب اقبال جرم کے بعد تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے تمہیں اور کرشن کمار کو ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد غیر قانونی طور پر سرحد کراس کر کے اپنے ملک واپس جانا تھا، لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے۔ تمہارا ساتھی خود تمہارے ہی ہاتھوں قتل ہو چکا ہے اور یہ قتل میرے ملک کی حدود میں ہوا ہے۔ ہر چند کہ تمہارا ساتھی ہمارے ملک کا شہری نہیں تھا لیکن قتل بہر حال قتل ہوتا ہے۔ تم پر پہلا چارج تو غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کا ہے، دوسرا چارج میرے ملک کی اہم تنصیبات کے متعلق ناجائز طور پر معلومات اکٹھا کرنا ہے۔ کرشن کمار کے قبضے سے بھی کچھ ایسے ہی کاغذات برآمد ہوئے تھے جو ہمارے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کاغذات بھی میں قانون کے سپرد کروں گی۔ ایسے ہی کاغذات تمہارے ہونے کے اس کمرے سے بھی برآمد کر لیے جائیں گے جہاں تم ٹھہرے تھے۔ تیسرا چارج تم پر قتل کا ہے۔ ان تمام چارجز کے باوجود تمہاری عمر اور ذہانت دیکھتے ہوئے میری خواہش یہی ہے کہ تم زندہ رہو، تمہیں اپنے جرائم کی سزا ضرور بھگتنا پڑے گی، نیز یہ کہ آج کے بعد میرے ملک کے سرکاری اداروں کے ساتھ بھی تمہیں پورا تعاون کرنا پڑے گا اور تعاون کی صورت میں یہی ہے کہ تم سے جو کچھ پوچھا جائے تم پوری سچائی کے ساتھ اس کا جواب دے دو! جبھی تمہاری زندگی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اگر تم نے میری درخواست پر تعاون کیا تو یقیناً ایک روز اپنی دھرتی ماتا کے چرنوں میں پہنچ جاؤ گے اور اپنی ماتا جی کے چرن چھو کر ان کی دعا میں بھی لے سکو گے۔ یہاں سے واپسی کے بعد تمہارے لوگ اور تمہارا ملک تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تمہیں مجھ سے اگر مزید کچھ کہنا ہو تو بولو..... کیونکہ اب شاید ہماری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔“

اس کے چہرے پر حیرانی بھی تھی، دکھ بھی اور میرے لیے پسندیدگی کا عنصر بھی! اس نے میری طرف نظر اٹھائی اور صرف اتنا کہا۔ ”مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا“ میں صرف آپ کا نام

جاننا چاہتا ہوں۔ اپنے چھوٹے سے جیون میں اپنی ماتا جی کے بعد میں نے پہلی بار کسی ایسی عورت کو دیکھا ہے جس نے مجھے اتنا متاثر کیا ہے۔ میں شاید جیوت (زندہ) نہ رہوں پر جب تک یہ جیوت (زندگی) ہے سانس کی ڈور نہیں ٹوٹی، میں آپ کو یاد رکھوں گا۔“

میں اس کی بات سن کر مسکرا دی۔ ”گوپال! میرا نام عذرا خان ہے۔ تم نے صرف یہی پوچھا تھا اور میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا۔ اب میں چلوں گی، بھگوان تمہاری رکشا (حفاظت) کرے.....“ یہ کہہ کر میں نے آئی جی کو اشارہ کیا۔

آئی جی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور میں تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ باہر آئی جی کے کئی ماتحت موجود تھے۔ وہ کبھی مجھے دیکھ کر ایک دم الٹ ہو گئے۔ آئی جی بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلا اور اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایات دیتا ہوا میرے ساتھ چلنے لگا۔ وہ غالباً باہر تک مجھے چھوڑنے چل رہا تھا۔

”آپ زحمت نہ کریں میں چلی جاؤں گی۔“ میں نے اس سے کہا، پھر بولی۔ ”غالباً اب کوئی مسئلہ الجھا ہوا نہیں رہ گیا، آپ سارا معاملہ سنبھال لیں گے!“

جواباً اس نے میرے تعاون پر بے حد شکریہ ادا کیا اور پھر میرے اصرار پر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

میں جب پولیس ہیڈ آفس کی عمارت سے باہر آئی تو مجھے اپنی کار کا ڈرائیور مستعد و چوکنا ملا۔ میں کار کے قریب پہنچی تو اس نے فوراً ہی پچھلا دروازہ کھولا دیا۔

”آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر چلو! میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے آہستگی سے ڈرائیور کو ہدایت دی۔

کار کا پچھلا دروازہ بند کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور پھر اگلے ہی لمحے کار ٹارٹ ہو گئی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے خلاف توقع تقریباً ڈھائی گھنٹے وہاں گزار دیئے تھے حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ذکیہ کو صبح سوتے ہوئے میں چھوڑ کر آئی تھی۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے ملازمین سے یقیناً میرے بارے میں پوچھا ہوگا اور پور ہو کر اسٹڈی میں جاگھسی ہوگی۔ اسے بھی میری طرح مطالعے کا ٹھوڑا بہت شوق تھا مگر صرف وقت گزار کی حد تک! اس کے سارے دوست وغیرہ قاہرہ اور دیگر ممالک میں تھے۔ کراچی میں اس کی کوئی ایسی دوست نہیں تھی جس کی کمپنی میں وہ خوش رہ سکتی، اسی لیے مجھے اس وقت اس کا خیال آ گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے پر بھی اگر میں اس سے نہ ملتی تو وہ بہت چپقلی، مگر اس وقت میرا آپریشن سیل جانا ضروری تھا، اور یوں بھی دوپہر کے کھانے میں ابھی وقت تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ ذکیہ عموماً دو بجے سے پہلے بچ نہیں کرتی تھی۔ پولیس ہیڈ آفس سے نکل آنے کے بعد میں نے ڈرائیور سے کہا کہ آپریشن ہیڈ کوارٹر سے ٹراسمیٹر پر رابطہ قائم کرو اور عثمانی سے کہو کہ پٹرولنگ یونٹ کے انچارج کو ہیڈ کوارٹر میں فوری طور پر طلب کرے۔ اس کے علاوہ میجر شہباز کی موجودگی بھی وہاں ضروری ہے۔ میں ہیڈ کوارٹر کی طرف آ رہی ہوں۔

اب تم لوگوں کا تعاقب کرتے ہوئے غیر ملکی ایجنٹ یہاں تک پہنچنے لگے ہیں۔ یہ ہے تمہارا قصور! یہ ہے تمہاری غفلت! پولو! کچھ اور بھی سننا چاہتے ہو! ”کیپٹن شاد سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر اندامت تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد میں پھر بول اٹھی۔ ”تمہیں یقیناً پتا چل گیا ہو کہ کرشن کمار کو گولی ماری گئی۔ اس کے ذمے دار بھی تم ہو..... تم کیپٹن شاد! “ پھر میں نے مختصر اُسے گویاں کی روداد سنا دی۔ ”اب تم خود ہی بتاؤ کہ بنیادی غلطی کہاں اور کس سے ہوئی؟ تمہاری ہی طرح میجر شہباز بھی سزا سے نہیں بچ سکے گا اور میں اس کے لیے سزا تجویز کر چکی ہوں مگر اس نے پہلے تمہیں سزا دینا ضروری ہے!“

”میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں میڈم! آپ مجھے جو چاہے سزا دے سکتی ہیں۔“ کیپٹن شاد کے لہجے میں شکست بھی تھی اور دکھ بھی!

”تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اب سے رات بارہ بجے تک پیدل چلتے رہو گے اور اس دوران میں کہیں رکو گے نہیں۔ بارہ بجے رات کے بعد تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔ اس سزا کا اطلاق اسی وقت سے شروع ہو چکا ہے، گو آن!“

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔ کیپٹن شاد میری طرف دیکھے بغیر مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ میں نے انٹرکام پر عثمانی کو اس سزا سے آگاہ کر دیا اور ہدایت دی کہ سیل کے کسی رکن کو فوری طور پر کیپٹن شاد کی نگرانی پر مامور کر دیا جائے۔ اگر وہ رات بارہ بجے سے پہلے حکم عدولی کا مرتکب پایا جائے تو دوسرے دن مجھے رپورٹ دی جائے۔ اسی کے ساتھ میں نے اسے مختصر آپیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا، پھر میجر شہباز کو کمرے میں بھیجنے کے لیے کہا۔

ابتدا میں میجر شہباز کے ساتھ میرا رویہ نرم رہا۔ میں نے اس سے کہا، تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے انتہائی ذہانت اور بے حد مستعدی کا ثبوت دیا ورنہ کرشن کمار کا قاتل فرار ہو جاتا۔“

”میڈم! یہ آپ ہی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔“ اس نے انکساری سے کام لیا۔ میری حوصلہ افزائی کے سبب اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ”لیکن میجر!..... میری تربیت میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور رہ گئی ہے۔“ میرا لہجہ بدل گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم اتنے اندھے نہ ہو جاتے کہ اپنے تعاقب میں آنے والی کار کو بھی نہ دیکھ سکتے!..... وہ شخص..... وہ نوجوان جو پولیس ہیڈ آفس کے احاطے میں تمہاری ہی بیدار مغزی کے سبب پکڑا گیا، آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے پولیس ہیڈ آفس تک تمہاری دین کا تعاقب کرتا رہا تھا!“

”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے!..... اس نے عمارت کے..... اس عمارت تک کو.....“ وہ گھبرا کر ہکھلانے لگا۔

”میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو!“ میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ”تم شاید یہ

ڈرائیور نے فوراً ہی میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ اس کا تعلق بھی سیل ہی سے تھا۔ میری کار میں ایسے ہی مواقع کے لیے محدود قوت کا ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ ہیڈ کوارٹر جانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں سیل کے ارکان کو پیش آنے والے واقعے کے کلائمکس سے آگاہ کر سکوں۔ حتی الامکان میری یہی کوشش ہوتی تھی کہ میرے لوگ حالات سے پوری طرح واقف رہیں۔ سیل کے وہ ارکان جنہوں نے ذہانت اور مستعدی کا ثبوت دیتے ہوئے کرشن کمار کے قاتل گویاں کو فرار نہیں ہونے دیا تھا، بہر حال داد کے مستحق تھے۔ داد کے ساتھ ہی انہیں بیداد کا سامنا بھی کرنا پڑتا یہ الگ بات تھی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ کر میں نے اس کمرے کا رخ کیا جو صرف میرے استعمال میں رہتا تھا۔ اس کی ایک چابی اب میں نے بھی احتیاطاً اپنے پاس رکھ لی تھی۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ مجھے کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں اپنے کمرے میں پہنچ چکی ہوں۔ میری توقع کے عین مطابق چند ہی لمحے بعد انٹرکام کی نیل بج اٹھی میں نے ریسپورڈ اٹھا لیا۔

”میڈم! عثمانی کی آواز سنائی دی۔“ پٹرولنگ یونٹ کا انچارج کیپٹن شاد آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے یہاں پہنچ چکا ہے۔ میجر شہباز یہیں تھا۔ کیا دونوں کو آپ کے کمرے میں بھیج دوں؟“

”نہیں، دونوں کو نہیں!“ میرے لہجے میں ہلکی سی سختی آ گئی۔ ”پہلے کیپٹن شاد کو بھیجو! پھر جب میں کہوں میجر شہباز کو بھیجنا!“

”جی بہتر ہے“ عثمانی کے لہجے میں ہلکے سے خوف کا تاثر تھا۔ اس نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ کہیں کسی مرحلے پر کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے ورنہ عموماً میرے لہجے میں سختی نہیں ہوتی تھی۔ عثمانی اس سے بھی واقف تھا کہ اپنے لوگوں سے تمام تر خلوص اور محبت کے باوجود میں غلطی کی سزا ضرور دیتی ہوں۔

کچھ ہی دیر کے بعد کیپٹن شاد کمرے میں داخل ہوا اور مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سلام کا جواب دیا اور خلاف معمول اس سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ ”کیپٹن شاد!“ میں نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تم نے فوج میں ملازمت کی ہے اور میرے ہی ایما پر تمہیں وہاں سے سبکدوش کیا گیا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تمہیں کورٹ مارشل کا مطلب سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگے!“

”مگر میڈم میرا قصور؟“ اس کا چہرہ اتر گیا۔

”تمہارا قصور اور کافٹی ڈینس ہے!..... کچھ آیا سمجھ میں!..... اگر نہیں آیا سمجھ میں تو سنو کہ کرشن کمار کو کڈنیپ کر کے تم جس بندوین میں یہاں لے کر آئے تھے اس کا تعاقب کیا گیا تھا اور تم..... تم کیپٹن شاد اتنے احمق اور بے وقوف ہو کہ تمہیں اس کا احساس نہیں ہو سکا۔ تمہاری حماقت کے نتیجے میں یہ عمارت جسے تم لوگ اور میں خود ایک محفوظ قلعہ کہتی تھی اب محفوظ نہیں رہی۔

کہنا چاہتے ہو کہ اس عمارت کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں تو پھر وہ شخص یہاں کس طرح پہنچ گیا اور کیسے پولیس ہیڈ آفس تک تمہاری دین کا اس نے تعاقب کیا؟..... یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟“

”جی..... جی..... ہاں میڈم!“

جواب میں نے اسے کیپٹن شاد کی حماقت سے آگاہ کر دیا، پھر بولی ”کیپٹن شاد کو تم سے پہلے سزا دی جا چکی ہے اور اب تمہاری باری ہے!“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی ”اس ہال میں چلو جہاں گزشتہ روز تم نے مجھے اپنے تربیت یافتہ دو آدموں کا تماشا دکھایا تھا! میں لباس تبدیل کر کے وہیں آ رہی ہوں!“

میجر شہباز سر جھکائے کھڑا رہا۔

میں ایک دم بیچ اٹھی جاؤ اور تم بھی لباس تبدیل کر لو۔

”گٹ آؤٹ!“ تمہاری سزا یہی ہے کہ سیل کے ارکان کی موجودگی میں تمہارا سر پر غور جھکا دیا جائے مجھے معلوم ہے کہ تم بلیک بلیک حاصل کر چکے ہو مگر شاید تمہارے ذہن سے یہ بات نکل گئی ہے کہ بلیک بلیک ہی مارشل آرٹ کی معراج نہیں اس کے بعد بھی بہت سے درجات ہیں جن کا اندازہ تمہیں ابھی ہو جائے گا۔ تمہارے دماغ سے کیڑے جھاڑنا ضروری ہو گیا ہے۔“

سر جھکائے وہ میری ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا اور پھر میرے خاموش ہوتے ہی کمرے سے نکل گیا۔ میں نے عثمانی کو انٹرکام پر ہدایت دی کہ اس وقت آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں محافظوں کے علاوہ جتنے ارکان موجود ہیں وہ فوری طور پر اس ہال میں پہنچ جائیں جہاں جوڈو کرائے کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ عثمانی کو یہ ہدایت دے کر میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کمرے میں موجود الماری سے وہ مخصوص لباس نکال کر پہننے لگی جو ایسی مشقوں کے درمیان ضروری ہوتا ہے۔ سیل کے ابتدائی دنوں میں بہ شرط فرصت خود میں بھی سیل کے ارکان کو تربیت دیتی رہی تھی۔ خود میجر شہباز بھی کافی دن مجھ سے تربیت حاصل کرتا رہا تھا۔

لباس تبدیل کرتے ہی میں ننگے پاؤں ہال کی طرف روانہ ہو گئی۔ جوڈو کرائے کی تربیت خود میں نے ایک جاپانی ماہر فن سے حاصل کی تھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب میں کچھ عرصہ ٹوکیو میں رہی تھی۔ اس وقت میری عمر بمشکل بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ یہ فن میں نے محض اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر سیکھا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دست بہ دست لڑائی کا یہ خوف ناک فن زندگی کے کسی مرحلے پر میری ضرورت بن جائے گا۔ میرے جاپانی استاد کا میرے متعلق یہ خیال تھا کہ کم عمری کے باوجود اس کے تمام شاگردوں پر مجھے فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ بلیک بلیک حاصل کرنے کے بعد میں نے ذاتی طور پر بھی اس فن میں کچھ اختراعات کی تھیں جنہیں میرے استاد نے سراہا تھا۔ پھر بعد میں بھی میں مشق کرتی رہی تھی۔ عموماً جوڈو کرائے سے آشنا افراد کو خطرناک تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ کم از کم میرا تجربہ یہی ہے اور مجھے اپنے استاد سے یہی سبق ملا تھا۔ تحمل، قوت برداشت اور صبر اس فن کے بنیادی عناصر کہے جاسکتے ہیں۔ تربیت کے آخری مراحل میں یہی سبق دیا جاتا ہے۔ اس فن کا کوئی بھی بڑا فنکار بھی

میجر لوز نہیں کرتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فن میں کچھ داؤد انتہائی اذیت ناک ہیں نہ صرف اذیت ناک بلکہ جان لیوا بھی۔ یہ بھی بتانی چلوں کہ جوڈو اور کرائے دو الگ الگ فن ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی ایک شخص ان دونوں ہی پر عبور رکھتا ہو۔ ایسا ہی ایک شخص میرا بوڑھا جاپانی استاد بھی تھا۔

ابھی میں نے جوڈو کرائے کے بارے میں جو کچھ لکھا اس کا مقصد خود ستائی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ جوڈو کرائے ہی پر منحصر نہیں کسی بھی فن کو مثبت اور منفی دونوں ہی طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ فن سے ہٹ کر اس کی واضح اور بڑی مثال المیک انرجی ہے۔ المیک انرجی کو ایٹم بم بنانے کے کام میں بھی لایا جاسکتا ہے اور اس طرح انسان کی ہلاکت کے سامان کیے جاسکتے ہیں اور اسے تعمیری مقاصد کے لیے بھی پوز کیا جاسکتا ہے۔ جس سے انسان کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ میں کوئی عالم دین یا مبلغ نہیں ہوں مگر مجھے خیر و شر کا فرق ضرور معلوم ہے۔ میں اپنی آپ بیتی بیان کرتے کرتے کبھی کبھی جوڈو گر سے ہٹ کر باتیں کرنے لگتی ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پڑھنے والے مجھے اور میرے انداز فکر کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ میجر شہباز کو سزا کی دینے کا مقصد ایک تو وہی تھا جو میں بیان کر چکی ہوں دوم یہ کہ میں نے اس کے انداز و اطوار میں ایک نوع کا غور و سامحوس کیا تھا جو پہلے نہیں تھا۔ یہ غور خود اس کی شخصیت کو تباہ کر سکتا تھا۔ میں نے اسی لیے اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی اور اب عملی طور پر بروائی کے اس غلط احساس کو ختم کرنے جا رہی تھی۔ سیل کے ارکان کو وہاں اسی غرض سے جمع کیا گیا تھا۔

میں ہال میں پہنچی تو مجھے دیکھتے ہی سناٹا چھا گیا۔ وہاں خاصے افراد جمع تھے۔ ان میں سیل کے وہ ارکان بھی تھے جنہیں خود میجر شہباز نے جوڈو کرائے کی تربیت دی تھی۔ ہال کا فرش میں نے خاص طور پر بنوایا تھا۔ پختہ فرش کے اوپر ایک تہ خاص قسم کی لکڑی کی تھی۔ یہ لکڑی میں نے جاپان سے درآمد کی تھی۔ مشقوں کے دوران میں کسی نوبت کو زیادہ چوٹ نہ آ جائے اسی لیے میں نے اتنا پیسا خرچ کیا تھا اور یہ بھی میری ہی اختراع تھی۔

میجر شہباز جوڈو کرائے کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہال کی ایک جانب سر جھکائے کھڑا تھا۔ اسی کے قریب میں نے عثمانی کو کھڑے دیکھا۔ ڈیوٹی روم میں شاید وہ اپنی جگہ سیل کے کسی اور سینئر رکن کو بٹھا آیا تھا۔ ہال میں چاروں طرف قطار باندھے سیل کے ارکان کھڑے تھے۔ میں جلد ہی ہال کے درمیان میں پہنچ گئی اور میجر شہباز کو بھی اشارے سے وہاں آنے کے لیے کہا۔ وہ بوہل بوہل سے قدم اٹھاتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”ہا!“ میں نے زور سے نعرہ مار کر پینٹر بدلا۔

جواباً میجر شہباز کو بھی ایک دم مستعد ہو جانا پڑا۔

”دار کرو میجر!“ میں چند قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی اور بظاہر بے پروائی سے اپنی جگہ

کھڑی ہو گئی۔

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر ایک دم تیزی سے جست بھر کے کسی عقاب

”بزرگ تو ہوں میں تمہاری!..... اس سے انکار کیا تو مر غمنا دوں گی۔ یہ بتاؤ کھانا کھایا امی یا نہیں؟“

”نہیں کھایا ابھی اور نہ کھانے کا موڈ ہے۔“

”معلوم ہے آپ کو آج میں نے گیارہ بجے ناشتا کیا تھا؟“ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ ”یہی سوچ کر کہ شاید اب آپ لوٹ آئیں اب آ جاؤں!“

”کیا تمہیں کسی نے بتایا نہیں کہ میں ناشتہ کر کے نکلی تھی؟“ میں حیرت سے بولی۔

”معلوم تو ہو گیا تھا مگر یہ سوچ کر آپ کا انتظار کرتی رہی کہ چلیں چائے ہی ساتھ پی لیں گے۔ مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔ بس سارا موڈ چوٹ ہو گیا۔“

”اچھا چلو اب اٹھو ورنہ ٹھکانی لگا دوں گی جو بات صبح کرنے والی تھیں اب کھانا کھاتے ہوئے کر لیتا۔“

ہم دونوں کھانے کی میز پر آ گئے اور کھانا لگ گیا تو ذکیہ بولی ”یہ بات میں کل رات ہی آپ سے کرنے والی تھی پھر سوچا کہ چلو صبح ناشتے پر بات ہو جائے گی۔“ اس نے ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بات کرتے ہوئے کچھ بھجک رہی ہے۔ میں بھی اپنی پلیٹ میں سالن نکالنے لگی اور اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ ذرا توقف کے بعد اآخر اس نے وہ ”ضروری بات“ کہہ دی۔ ”بابی! میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔“

”تو اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے چلی جاؤ۔“

”وہ دراصل..... کل ملک دلاور کہہ رہا تھا کہ شاید آپ کی بابی اجازت نہیں دیں گی۔“ وہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

”کیا تم نے اس سے بھی تذکرہ کیا تھا کہ لاہور جا رہی ہو؟“

”بات یہ ہے کہ اسی کی تجویز بھی لاہور ڈاکٹروں نے اسے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا ہے۔“

”تم بات کو اتنا الجھا کیوں دیتی ہو! عجیب لڑکی ہو تم! سیدھے سیدھے یوں کیوں نہیں کہتی کہ تم ملک دلاور کے ساتھ لاہور جا رہی ہو!“

”جی..... جی ہاں میں یہی کہنا چاہتی تھی..... یوں بھی میں یہاں بہت بور ہو گئی ہوں۔“

”ملک دلاور بتا رہا تھا کہ وہاں گلبرگ کے علاقے میں اس کی کوٹھی.....“

”معلوم ہے مجھے!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی پھر بولی ”اگر تم لوگوں کا یہی

ہو گرام بن چکا تھا تو کل بھی مجھے بتا سکتے تھے! آخر اس راز داری کا کیا مطلب ہے!“

”اسی نے کہا تھا کہ آپ ہی بات کر لیجئے گا، اگر میں کہوں گا تو آپ کی بابی ہرگز نہیں

مانیں گی اور آپ کو میرے ساتھ لاہور نہیں جانے دیں گی۔“

”ذکیہ! میں سنجیدگی سے بولی۔ ”مجھے تمہارے لاہور یا کہیں بھی جانے پر کوئی اعتراض

نہیں، لیکن ملک دلاور کا معاملہ مختلف ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ تم سے اس حد تک فریب ہو جائے

کی طرح مجھ پر چھپنا۔ میں نے بائیں جانب لانگ جیب لگائی۔ نتیجتاً میجر شہباز کو زمین چائنا پڑی مگر وہ فوراً ہی سبھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں اسی دوران میں کسی پرندے کی طرح اڑتی ہوئی اس تک پہنچ چکی تھی۔ میری لاتیں اس کے مضبوط سینے پر پڑی تھیں اور وہ ایک بار پھر چنچا ہوا زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ فلائنگ کلک لگانے کے بعد میں خود اس طرح اس سے دور گر گئی تھی کہ پہلے اٹھنے میں کامیاب ہو جاؤں اور مجھے چوٹ بھی نہ آئے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی اور میجر شہباز سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے پہلے ہی کی طرح ایک بار پھر اسے وار کرنے کا موقع دیا ورنہ میں چاہتی تو وہ میرے قریب بھی نہیں آ سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا میں نے کرائے کا ایک خطرناک داؤ کیرات اس پر آزمایا۔ میرے ہاتھ کی ضرب اس کے سر پر پڑی تھی، لیکن میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ ضرب شدید اور بھرپور نہ ہو ورنہ اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے ہو جاتے۔ میرا مقصد محض اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کرنا تھا۔ ضرب پڑتے ہی وہ میرے قدموں میں آگرا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

میجر شہباز کو میں نے دائستہ جلدی زیر کیا تھا۔ میں اسے یہ موقع دینا نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے جسم کو چھو بھی سکے۔ عام حالات میں مشتق کراتے ہوئے میں نے کبھی کیرات کا داؤ استعمال نہیں کیا تھا، اور اپنے لوگوں پر اس داؤ کے آزمانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اگر اس وقت میجر شہباز کو سزا دینا مقصود نہ ہوتا تو میں ہرگز ایسا نہ کرتی۔ میرے اندازے کے مطابق اب نصف گھنٹے سے قبل اس کا ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے ایک جانب دیوار کے قریب کھڑے ہوئے عثمانی کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور پھر بلند آواز میں بولی۔

”عثمانی! اسے یہاں سے اٹھوا لینا، جلد ہی ہوش میں آ جائے گا، فکر کی کوئی بات نہیں۔“

یہ کہہ کر میں ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت میں نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ سیل کے کچھ ارکان مجھے خوف زدہ سی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میں خدا نخواستہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہوں۔ میں ان کے درمیان سے زیر لب مسکراتی ہوئی گزر آئی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے پھر لباس تبدیل کیا اور مزید وہاں رکے بغیر اپنا پرس اٹھائے باہر نکل آئی۔ کمرہ مقل کر کے جلد ہی میں اپنی کار میں آ بیٹھی۔ اس وقت پونے دو ہو رہے تھے۔

میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے کوٹھی پہنچی توقع کے مطابق مجھے ذکیہ کا منہ پھولا ہوا نظر آیا۔ ”کیوں کیا ہوا تمہیں.....؟ یہ منہ کیوں پھولا ہوا ہے تمہارا میں نے ہنستے ہوئے اس کی کمر پر دھت جما دی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے میں اس لیے سیدھی اسی کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

”چھوڑیں رہنے دیں بابی، میں کچھ کہوں گی تو آپ بزرگی کا مارجن لے کر ڈانٹ دیں گی مجھے! وہ سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

”آپ کی کوٹھی کے قریب ہی ایک جگہ سے میں فون کر رہا ہوں۔“
اس سے پہلے کہ سرفراز مزید کچھ کہتا میں بول اٹھی ”تم نے دوسرے نمبر پر رنگ کیوں نہیں کیا؟“

”سوری میڈم جلدی میں وہ نمبر میرے ذہن میں فوری طور پر نہیں آ سکا تھا۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ آپ کا رومی مہمان موشوروف اور جولین دونوں آپ کی کوٹھی کی طرف آ رہے ہیں ماننا وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ سرفراز مختاط انداز میں مجھے صورتحال سے آگاہ کر رہا تھا۔ ”آپ کو اطلاع دینا ضروری تھا ورنہ ہم لوگ ان کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔“

فون پر اچانک یہ اطلاع پا کر موشوروف اور اس کی محبوبہ جولین آندرے میری کوٹھی کی طرف بڑھ رہے ہیں میرے ذہن میں چھٹکا سا ہوا مگر میں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا اور سرفراز سے کہا ”تم لوگ میرے مہمانوں کی پذیرائی نہ کرو میں خود ان کا استقبال کروں گی انہیں آنے دو! لہذا تم میری بات اچھی طرح سمجھ چکے ہو؟“

”جی ہاں میڈم سرفراز نے جواب دیا۔“ ہم لوگ ان کا استقبال نہیں کریں گے اور آپ کی مزید ہدایات کے منتظر رہیں گے۔“

میں نے فون کا ریسیور رکھ کر ملازمہ سے پوچھا ”کیا ذکیہ اب تک سو رہی ہے؟“

”جی ہاں ان کے کمرے کا دروازہ بند ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم سب لوگ الرٹ ہو جاؤ! کسی بھی لمحے کوئی خطرناک صورتحال پیش آ سکتی ہے۔ ذکیہ کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دو! جاؤ۔“ یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

پھر غسل کر کے لباس تبدیل کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ موشوروف کس غرض سے میری کوٹھی کی طرف آ رہا تھا اور کیا نئی چال چلنے والا تھا میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ محدود قوت کا ایک جدید ٹراسمیٹر سیٹ میں نے اپنے پرس میں رکھ لیا جو بظاہر ایک فائوٹین پین معلوم ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے پستول اور دیگر ضروری اشیاء بھی اپنے پرس میں رکھ لیں اور پھر اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ڈرائنگ روم تک جاتے ہوئے مجھے ایک ملازم سے یہ خبر ملی کہ موشوروف کی کار میری کوٹھی کے گیٹ تک پہنچ چکی ہے۔ وہ لوگ وائرلیس پر باہر والوں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں آ کر میں نے فوری طور ایسا بندوبست کر دیا کہ اگر موشوروف پر امن فضا میں ہم سے گفتگو کرنے آیا ہو تو اس کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ ہو جائے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ارادہ ہنگامہ آرائی کا نہیں ہے۔

ڈرائنگ روم سے نکل کر میں نے کوٹھی میں موجود سیل کے ارکان کو کچھ ضروری ہدایات دیں پھر دوبارہ اپنی خواب گاہ کی طرف بھی گئی۔ اسی عرصے میں مجھے یہ بتایا جا چکا تھا کہ موشوروف مجھ سے ملنا چاہتا ہے میں نے ہدایت دی تھی کہ اسے اور جولین کو ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا جائے کہ میں اپنی خواب گاہ میں ہوں اور یہ کہ ابھی ہم اطلاع کرتے ہیں آپ لوگ انتظار کریں۔ اس

وہ میرا دوست ہے اور میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس دوستی کی بھی حدود مقرر ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ میرے ساتھ مخلص ہے اس کے باوجود میں تمہیں اس کے ساتھ لاہور جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تم کہیں بھی جاسکتی ہو بلکہ بہتر یہ ہے کہ تم امریکہ یا سٹریٹز لینڈ چلی جاؤ۔“

جواباً ذکیہ کچھ نہیں بولی میں بہر حال اس کی بڑی بہن تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں وہ نہیں لگی کہ اسے میری بات ناگوار ہوئی ہے مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی تھی اس لیے مزید اس سلسلے میں نے کوئی بات نہیں کی اور کھانا کھا کر اٹھ گئی۔ ذکیہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ چائے کے لیے میں نے ملازمہ سے کہہ دیا تھا کہ بیڈروم ہی میں پیوں گی۔

چائے پینے کے دوران میں مجھے ملک دلاور پر غصہ آنے لگا اس نے خواہ مخواہ میرے لیے ایک پرائیلم کرئٹ کر دیا تھا۔ اسے اگر لاہور جانا تھا تو چلا جاتا آخر ذکیہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی کیا تک تھی! اس کے اور میرے تعلقات بہر حال اس حد تک نہیں تھے کہ وہ میرے معاملات میں مداخلت کرنے لگتا۔ مجھے کچھ کچھ یہ شبہ بھی ہونے لگا تھا کہ ذکیہ اور ملک دلاور ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ قربت مستقبل میں کوئی اور شکل بھی اختیار کر سکتی تھی؟ مجھے بہر حال قبول نہیں تھی۔ ملک دلاور کو میں بس ایک مخلص دوست کی حیثیت سے قبول کر سکتی تھی کسی اور حیثیت میں اسے قبول کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ میں اب سمجھتا رہی تھی کہ تاح ذکیہ کو اس سے ملوایا مگر اب یہ سمجھتا وافضل ہی تھا میں اسی معاملے پر غور کرتی ہوئی کہ اسے کس طرح ٹیکل کیا جائے بستر پر دراز ہوئی۔ چائے کی خالی پیالی میں نے قریبی تینائی پر رکھ دی تھی ملک دلاور سے اس سلسلے میں کچھ کہنا لا حاصل تھا وہ مجھے باتوں میں اڑا دیتا ہاں ذکیہ کو میں سمجھتا تھی۔ فی الحال اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا اس لیے میں نے یہی سوچا کہ کوئی مناسب موقع مل دیکھ اس سے بات کروں گی۔ اسی ادھیڑ بن میں میری آنکھ لگ گئی۔

زیادہ سے زیادہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے سوئی ہوں گی کہ ایک ملازمہ نے مجھے آ کر جگاد وہ بھی سیل ہی کی ایک رکن تھی۔

”سرفراز سے فون پر بات کر لیجئے۔“ ملازمہ نے مجھ سے کہا۔

”سرفراز سے! میں حیرت سے بولی اور اٹھ کر بیٹھ گئی سرفراز بھی سیل کے ذہن ارکا میں سے ایک تھا۔ جو لوگ میری کوٹھی کی نگرانی پر مامور تھے سرفراز لن کا انچارج تھا۔

اسی دوران میں ملازمہ ٹیلی فون سیٹ اٹھا لائی سرفراز نے غالباً جلد بازی میں وہ فون نہ ملا لیا تھا جس کا ایکسٹینشن میری خواب گاہ کے علاوہ باہر بھی تھا مجھے اسی لیے ملازمہ نے فون اطلاع دی تھی۔ سونے سے قبل عموماً میں اس فون کا سوچ نکال دیتی تھی تاکہ کوئی اشد ضروری کام تو دوسرے فون پر مجھ سے بات کی جاسکے ورنہ نہیں۔ دوسرا فون نمبر آپریشن سیل کے ارکان۔ علاوہ صرف چند خاص لوگوں کے علم میں تھا۔

”ہاں سرفراز کہو کیا بات ہے؟..... اور کہاں سے بول رہے ہو تم؟“ میں نے سرفراز آواز پہچان کر کہا۔

اور جولین آندرے کی طرف تھا۔

جیسے ہی میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا موشوروف صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ”خوش آمدید مس عذرا خان!“ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا اس کی محبوبہ جولین نے بھی صوفے سے اٹھنے میں دیر نہیں کی تھی۔ وہ دونوں بہترین مغربی لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ موشوروف تھری پیس میں تھا اور جولین اسکرٹ اور سرخ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ ”میں بھی آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں عذرا خان!“ جولین بھی پرسکون اور خوشگوار لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ان دونوں کی اس حسین اداکاری پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور میں نے کہا ”آپ دونوں تشریف رکھیں! آپ تو مجھے اس طرح خوش آمدید کہہ رہے ہیں جیسے میں مہمان ہوں اور آپ میزبان۔“ یہ کہتے ہوئے ان کے مقابل ایک صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ ”ہم دونوں اسے اپنا ہی گھر سمجھ کر آئے تھے اسی لیے خود کو مہمان نہیں سمجھ رہے تھے۔“ جولین پھر بول اٹھی۔

”شکریہ! اگر آپ لوگ اسے اپنا گھر سمجھ رہے ہیں۔“ میں بولی اور اسی کے ساتھ میرے لہجے میں ہلکی سی جھبن آ گئی۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں قاہرہ میں آپ دونوں کی مہمان رہ چکی ہوں اور غالباً اب میزبانی کی باری میری ہے۔“ میرا لہجہ معنی خیز تھا۔ ”اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے مسٹر موشوروف؟“

”نیک خیال ہے۔“ یہ کہہ کر موشوروف مسکرانے لگا ”مگر ہماری میزبانی لوگوں کو عموماً مہنگی بھی پڑتی ہے اس لیے میں یہی عرض کروں گا کہ آپ میزبانی کا خیال اپنے ذہن میں نہ لائیں تو بہتر ہے آداب میزبانی بڑے ٹھن ہوتے ہیں۔“

”مسٹر موشوروف! اگر آپ برانہ نامیں تو ہم لوگ ذومعنی گفتگو کی بجائے صاف صاف الفاظ میں بات کریں تو زیادہ بہتر ہے کیا آپ یہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنا پسند کریں گے؟“ مجھے اس کے اطمینان و سکون سے الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

”کیوں نہیں!“ وہ برجستہ بولا۔ ”میں دراصل آپ سے اپنے گزشتہ روپے کی معافی مانگنے آیا تھا مجھے اس پر سخت ندامت ہے میں نہیں چاہتا کہ آپ میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار رہیں۔“

غلط فہمی!..... کیسی غلط فہمی؟..... مجھے تو آپ کی طرف سے کوئی غلط فہمی نہیں ہے آپ کھل کر اپنے اور اپنے مقاصد کے متعلق مجھ سے گفتگو کر چکے ہیں میں بھی غالباً واضح طور پر آپ کو یہ جواب دے چکی ہوں کہ میں آپ کے ملک کی آلہ کار نہیں بن سکتی اس میں کسی غلط فہمی کو کیا دخل ہے۔ مسٹر موشوروف؟ میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

”جہاں تک مجھے یاد ہے مس عذرا خان میں نے کبھی آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ وہ صاف مکر گیا۔

میں سمجھ گئی کہ موشوروف اس وقت پوری طرح چوکنا اور محتاط ہے وہ یقیناً کوئی ایسی بات

تمام کارروائی کا مقصد محض یہ تھا کہ موشوروف نے مجھے اپنی طرف سے قطعی غافل سمجھے میں نے اس لیے سرفراز اور اس کے ساتھیوں کو بھی کسی قسم کی مداخلت سے منع کر دیا تھا۔ موشوروف کا مجھ سے یوں براہ راست بلنا قطعی خلاف توقع تھا۔ اس نے مجھے یہ سن گن بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ قاہرہ سے کب کراچی پہنچ گیا! کراچی آنے کے بعد اس نے یقیناً میرے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں اسے یہ علم ہو گیا تھا کہ میں ان دنوں اپنی کوٹھی ہی میں سکونت پذیر ہوں۔ وہ بہر حال میرا حریف تھا اس کا یہ اقدام دلیرانہ ہی کہا جاسکتا تھا کہ میرے متعلق بہت کچھ جاننے کے باوجود وہ براہ راست ملنے آ پہنچا تھا۔ اس کے ذہن میں لازماً یہ بات بھی ہوگی کہ وہ مجھے اپنی قید میں رکھ چکا ہے اور یہ بھی کہ جواباً میں بھی کوئی ایسا ہی قدم اٹھا سکتی ہوں اسی لیے اس طرح اس کی آمد کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد مجھے یہ خبر بھی مل گئی کہ موشوروف اور جولین کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا جا چکا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی میں نے ٹراسمیٹر پر سرفراز سے رابطہ قائم کیا اور اسے ضروری احکام دیے اس کے بعد میں اطمینان سے ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔ سرفراز کو ضروری احکام دینے کے بعد اب میرا ذہن بڑی حد تک پرسکون ہو چکا تھا۔ اب ایسی ہیجانی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد میں نے سرفراز کو اپنی خواب گاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

آپ کے احکام کی تعمیل ہو چکی ہے وہ دونوں قطعی غیر مسلح تھے ان کی کار کی بھی تلاشی لی جا رہی ہے انہیں ڈرائنگ روم تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ڈرائنگ روم کی اطراف مسلح ارکان موجود ہیں ان دونوں کو بھی اس سے آگاہ کر دیا گیا ہے جب تک آپ تشریف نہ لائیں وہ صوفوں سے اٹھنے کی بھی کوشش نہ کریں ورنہ ان کے جسم گولیوں سے چھلنی گردیے جائیں گے۔“ سرفراز نے رپورٹ دی۔

”دیری گڈ! میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی“ گوا آن یور ڈیوٹی!“ میں نے سرفراز سے کہا اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ خواب گاہ سے باہر آ گئی۔

ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اس طرح خود ہی میرے جال میں پھنس جانے پر موشوروف کا رد عمل کیا ہوگا! مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ غیر معمولی ذہن کا مالک ہونے کے باوجود کراچی آنے کے بعد اس نے مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی؟ وہ ڈاکٹر رچرڈ کا ہم پلہ اور میرے خیال میں اس سے کہیں زیادہ خطرناک اور ذہین شخص تھا۔ کیا آگاہ چھپا سوچے بغیر وہ اس آسانی کے ساتھ میری گرفت میں آ سکتا ہے؟ کیا اس نے کوئی ایسا بندوبست نہیں کیا ہوگا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں فوری طور پر میری گرفت سے آزاد ہو جائے؟ ان سوالات نے مجھے کچھ مضطرب تو کیا مگر یہ سوچ کر میرا اضطراب مزید نہیں بڑھا کہ چاہے وہی طور پر سہی صورتحال پوری طرح میرے کنٹرول میں تھی۔

میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچی تو سیل کے دو مسلح ارکان نے مجھے اندر جانے کا راستہ دے دیا ان دونوں کے ہاتھوں میں سنیں نکلیں تھیں جن کا رخ اندر بیٹھے ہوئے موشوروف

نہیں کہنا چاہتا تھا جو پکڑ میں آ سکے۔ میں نے یہی محسوس کر کے خود وہ باتیں مختصر اُدھر اُدیں جو اس نے قاہرہ میں اس وقت مجھ سے کی تھیں جب اس نے زبردستی مجھے اپنا ”مہمان“ بنالیا تھا۔ وہ میری بات پوری ہوتے ہی زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ”آپ نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہو گا مس عذرا خان! ورنہ آپ نے جتنی باتیں کہیں ان میں سے کوئی تو مجھے یاد ہوئی!..... ہاں مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ جب آپ قاہرہ میں میری مہمان تھیں تو میں نے آپ سے انسان اور انسانیت کے نام پر ایک درخواست کی تھی۔ ہیومن کاز کے لیے تو ہم اپنے بدترین دشمنوں سے بھی گفتگو کرنے اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو تو ہم بہر حال اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ میں نے آپ سے صرف یہ درخواست کی تھی کہ آپ دنیا کے مظلوم عوام کی بھلائی کے لیے اگر ہماری آواز سے آواز ملا سکیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ وہ درخواست اب تک بدستور قائم ہے۔“ موشوروف نے ڈھکے چھپے لفظوں میں آخر اپنی بات کہہ دی میں اس کی بات کا اصل مقصد سمجھ رہی تھی۔ وہ اب بھی مجھے اپنے ملک کے مفادات کا غلام بن جانے کی دعوت دے رہا تھا۔

”مسٹر موشوروف! کیا آپ یہ بھی دانستہ بھول چکے ہیں کہ آپ نے مجھے قاہرہ میں اپنا مہمان نہیں بنایا تھا بلکہ ایک طرح سے غصے بے جا میں رکھا تھا؟ میں نے پھر چنگی لی۔“ خیال ہے آپ کا ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اگر ایسا ہی ہوتا تو آپ اب بھی وہیں قاہرہ میں ہوتیں اس کے باوجود اگر آپ نے واقعی ایسا سمجھا تھا تو میں معذرت خواہ ہوں۔“ اس کی گفتگو سے اب مجھے کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ میری کوشش میں اس کی آمد کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ اگر میں صحیح خطوط پر سوچ رہی تھی تو پھر اس نے یہاں سے بچ کر نکلنے کی بھی کوئی نہ کوئی راہ ضرور سوچ رکھی ہوگی۔ میں اب جلد از جلد کسی فیصلہ کن مرحلے تک پہنچ جانا چاہتی تھی میں نے اسی لیے براہ راست کسی تکلف کے بغیر گفتگو شروع کر دی۔ ”سنو موشوروف! یہ میرا گھر ہے اور تم اب تک یقیناً یہ اندازہ کر چکے ہو گے کہ اب تم اور جولین میری اجازت اور مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکو گے میں اتنی احمق بہر حال نہیں ہوں کہ تمہارے جھانسنے میں آ جاؤں اور واقعی وہی سمجھنے لگوں جو تم نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا ہے! مجھے بتاؤ موشوروف کہ حقیقتاً تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اگر تم نے اب بھی میرے سوال کو نہیں میں اڑانے کی کوشش کی تو میں بھی تمہیں اور جولین کو زبردستی اپنا مہمان بنانے سے گریز نہیں کروں گی تم شاید اسے دھمکی سمجھو مگر یہ حقیقت ہے کہ میرا ”مہمان خانہ“ خاصا وسیع اور کشادہ ہے اسے تم اپنے مہمان خانے سے بہر طور بہتر پاؤ گے۔ اس لیے کہ یہاں سے نکلنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہوگا۔“

”خاتون آپ شاید مجھ سے کچھ خفا معلوم ہوتی ہیں۔“ موشوروف اپنے پرسکون لہجے میں بولا۔ پھر جولین سے مخاطب ہوا ”ڈارلنگ! تمہیں انہیں کچھ سمجھاؤ کہ یہ اپنی خفگی ختم کر دیں ہم تو انہیں اپنوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے اور سمجھتے ہیں تمہارے ساتھ تو ان کی شطرنج کی بازیاں بھی جم چکی ہیں!“

اس سے پہلے کہ جولین کچھ کہتی، میں بول اٹھی ”موشوروف شاید خود کو اور اسٹیٹس کر رہے ہوں! اگر یہاں تم صرف اس غرض سے آئے ہو کہ کوئی کا اندر سے جائزہ لے سکو اور اس کے بعد مجھے زبردست لانے کی کوشش کرو تو تمہاری یہ حسرت دل ہی میں رہ جائے گی تم یہاں سے نہیں لکل پاؤ گے۔“

میں اسے دانستہ غصہ دلانا چاہ رہی تھی، مگر وہ نجانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس کے ہرے پر لچھ بھر کو بھی غصے کا تاثر نہ ابھرا۔ وہ بدستور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”خاتون! میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زبردستی کسی کو اپنا مہمان بنالینا اچھی بات نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ آدمی کو وہی بات کہنا چاہئے جس پر وہ پوری قدرت رکھتا ہو۔ مجھے یا جولین کو زبردستی روکنا آپ کو زیب نہیں دیتا اور نہ ایسا حقیقتاً ممکن ہے۔“

اس کی بجائے کہ میں غصہ دلانے میں کامیاب ہو جاتی، وہ ایسی باتیں کرنے لگا کہ مجھے فہم آ گیا۔ ”کیا ناممکن ہے؟..... کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ جو مسلح افراد اس کمرے کو اپنے گھرے میں لیے ہوئے ہیں ان کے ہاتھوں میں ہتھیاروں کی بجائے کھلونے ہیں؟“

”میرا خیال یہ ہے خاتون کہ ہتھیار جب تک استعمال نہ کیے جائیں ان کی حیثیت کھلونوں ہی کی سی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میری خواہش تھی کہ آپ سے بہتر فضا میں خوش گوار گفتگو ہو، مگر شاید آپ یہ نہیں چاہتیں! میں جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ہم دونوں کو زبردستی یہاں روکے رکھنا آپ کے امکان میں نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ کے اخلاق کو کیا ہو گیا ہے کہ اب تک آپ نے ہم سے چائے تک کو نہیں پوچھا!..... جیر پھر بھی سہی! موشوروف نے یہ کہہ کر جولین کی طرف دیکھا اور بولا۔

”اٹھو! خاتون کا موڈ آج کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا“ پھر بھی ملیں گے۔“ اسی کے ساتھ وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جولین بھی فوراً ہی گھڑی ہو گئی تھی۔

”بیٹھ جاؤ موشوروف!“ میں تقریباً چیخ اٹھی۔ ”ورنہ مجھے واقعی اس پر مجبور ہونا پڑے گا کہ..... ابھی میں اپنی بات پوری نہ کر سکی تھی کہ اچانک موشوروف نے اپنے دائیں ہاتھ کو جھکا لیا۔ میں صرف یہ دیکھ سکی کہ کوئی گول سی شے اس کی آستین سے نکل کر اس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ پھر چشم زدن میں ہر طرف گاڑھا دھواں سا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے نکتوں میں جلن سی محسوس کی اور سانس روک لیا، مگر میرا سر ایک دم چکرانے لگا تھا۔ وہ کوئی انتہائی تیز قسم کی نشہ آور میس تھی۔ اس گیس کے اثر سے بچنے کے لیے خود موشوروف اور جولین نے کیا کیا تھا میں صرف یہ قیاس کر سکتی تھی کیوں کہ ان دونوں کے وجود مجھے دھواں دھواں سے معلوم ہو رہے تھے۔ ان دونوں نے گیس سے بچنے کی خاطر یقیناً ماسک پہن لیے ہوں گے۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔ میں پھرتے ہوئے ذہن کے باوجود صوفے سے اٹھ کر ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ پرس اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ ڈارلنگ روم میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا اور اب اس دھواں میں کچھ بھی

نظر آ رہا تھا۔ میں اسی حالت میں سانس روکے سینے کے بل ریختی ہوئی اندازے سے ڈرائنگ روم کے اس دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی جو اندرونی سمت کھلتا تھا۔ وہ دروازہ ایک برآمدے میں کھلتا تھا جس سے گزر کر میں اپنی ”اسٹڈی“ تک پہنچ سکتی تھی۔ اس دروازے کے باہر بھی سیل کا ایک مسلح رکن متعین تھا اور دروازہ صرف بھڑا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھلنے کے بعد نشہ آور گیس برآمدے میں بھی پہنچ جاتی، مگر یہ خطرہ مجھے بہر حال مول لینا ہی تھا۔ اگر موشرورف میری کوشش سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کا یہ دعویٰ حقیقت کا روپ دھار لیتا کہ ہم دونوں کو زبردستی یہاں روک رکھنا آپ کے امکان میں نہیں ہے۔ یہ میری کھلی شکست ہوتی۔ اب بھی میری یہی شایہ خواہش تھی کہ اس دعوے کو حقیقت نہ بننے دوں حالانکہ حالات بڑی حد تک میرے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا اچانک اور خلاف توقع ہوا تھا۔ جب خود میں خطرے کا احساس نہ رکھی تھی تو سیل کے ارکان کیسے قبل از وقت اس کا اندازہ لگا لیتے۔ وہ بھلا نشہ آور گیس کی زد میں آنے سے کس طرح بچ سکتے تھے۔ وہ مسلح ہونے کے باوجود بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنے اندازے کے مطابق بالآخر میں کچھ ہی دیر بعد ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے تک پہنچ گئی، مگر اب سانس روکے رکھنے کے سبب میرا دم گھٹ رہا تھا اور آنکھوں میں بھی انتہائی جلن محسوس ہو رہی تھی۔ گیس میری آنکھوں پر بھی اثر انداز ہوئی جن سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی میں نے باہر جست لگائی اور پھر ادھر ادھر دیکھے بغیر دور تک برآمدے میں دوڑتی چلی گئی۔ میں جلد از جلد گیس کے حلقہ اثر سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر یہ شاید میری بھول تھی۔ وہ نشہ آور گیس میری توقع سے کہیں زیادہ زود اثر اور مہلک تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات دور دور تک پھیل گئے تھے۔ میں نے جیسے ہی رک کر سانس لیا، میری سانس کی نالی اور پیپھروں میں مرجھیں سی بھر گئیں۔ اسی کے ساتھ میرا سر اس قدر زور سے چکرایا کہ مجبوراً مجھے زمین پر بیٹھنا پڑا۔ میں نے اس زہریلی فضا میں دوبارہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسی عالم میں میری چٹمی حس نے مجھے ایک اور خطرے کا احساس دلایا۔ اس نشہ آور گیس کے سبب موشرورف کو مجھ پر برزی حاصل ہو گئی تھی اور وہ یہاں سے فرار ہونے کی بجائے اس صورتحال سے فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔ یہ تو میں پہلے ہی سوچ چکی تھی کہ گیس سے بچنے کے لیے موشرورف اور جو لین نے گیس ماسک استعمال کیے ہوں گے اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ان دونوں کو اس گیس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پھر بھلا موشرورف مجھے کیوں نہ تلاش کرتا؟ اس کے لیے یہ سمجھ لینا بعید از امکان نہیں تھا کہ میں ہم نوازہ آور گیس کا شکار ہو کر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو سکتی ہوں۔ اس نئے خطرے کے احساس میرے جسم میں برقی روسی دوڑا دی اور میں اپنے حواس جمع کر کے ایک دم کھڑی ہو گئی۔ پھر بیسوں مزید ایک بھی لمحے رکے بغیر بائیں جانب بھاگی۔ ساری کوشش میں موت کا سا سکوت طاری ہوا جیسے وہاں میرے سوا کوئی بھی ذی روح نہ ہو۔ یقیناً کوشش کے سارے کلین اس نشہ آور گیس کا شکار ہو کر بے ہوش ہو چکے تھے۔ موشرورف ڈرائنگ روم سے نکل آنے کے بعد بھی دوبارہ ضرورتاً نہ آور گیس استعمال کر سکتا تھا۔ غالباً اس نے ایسا ہی کیا تھا تا کہ کوشش میں موجود کوئی شخص ہوش میں

رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی جلدی وہاں سناٹا طاری نہ ہو جاتا اور دور دور تک فضا میں اس گیس کے اثرات نہ ہوتے۔

بھاگتے ہوئے میرا رخ کوشش کی عقبی سمت تھا۔ اس حالت میں اتنی دیر تک سانس روکے رکھنا میرے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب کسی بھی لمحے میری قوت برداشت جواب دے جائے گی اور میں ہائب کر گر پڑوں گی، لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں اپنی کوشش کی عقبی باؤنڈری وال تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر ایک ہی طویل جست میں باؤنڈری وال عبور کر کے میں کوشش کی حدود سے باہر نکل آئی۔

باہر پہنچتے ہی میں نے کئی گہرے سانس لیے اور پھر اپنے پھولے ہوئے سانس کو قابو میں کرنے کے بعد چند لمحوں میں کھڑی رہی۔ جب میرے حواس بحال ہو گئے اور میں نے اپنی آنکھوں سے بہتا ہوا پانی بھی صاف کر لیا تو ارد گرد کا جائزہ لیا۔ گلی میں اس وقت کوئی شخص نہیں تھا۔ سیل کے وہ ارکان جن کی ڈیوٹی یہاں تھی انہیں بھی یقیناً ہنگامی حالات کے پیش نظر سرفراز نے کوشش کے اندر بلا لیا تھا۔

خطرے کی حدود سے نکل آنے کے بعد میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا اور میں نے چند ہی لمحوں میں ایک فیصلہ کر لیا۔ میں اب ہاری ہوئی بازی جیتنا چاہتی تھی۔ حالات ایک بار پھر کسی نہ کسی حد تک میرے حق میں استوار ہو چکے تھے۔ اگر میرا یہ اندازہ درست تھا کہ موشرورف نے فوری طور پر راہ فرار اختیار نہیں کی ہوگی تو اب میں اسے گھیر سکتی تھی۔

پھر میں ایک لمبا چکر کاٹ کر تقریباً دوڑتی ہوئی اس سڑک پر نکل آئی جو میری کوشش کے سامنے سے گزرتی تھی۔ میری کوشش کا پیرونی گیٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، مگر اس قدر فریب بھی نہیں تھا کہ میں فوری طور پر پہنچ جاتی۔

ڈیفنس کا یہ اقامتی اور پرسکون علاقہ تھا اس لیے کبھی کبھار ہی کوئی کار وغیرہ ادھر سے گزرتی نظر آ جاتی تھی۔ اس وقت بھی سڑک پر مجھے کوئی سواری نظر نہیں آئی۔ میری کوشش کے گیٹ سے کچھ آگے مجھے ایک سائیکل سوار جاتا ضرور دکھائی دیا جو شاید کسی کوشش کا ملازم تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میری نگاہ اپنی کوشش کے پیرونی گیٹ ہی کی طرف تھی کہ اچانک میں نے گیٹ کھلتے دیکھا اور ایک سفید رنگ کی ڈائن کار باہر آ گئی اور بائیں جانب مڑ کر رک گئی۔ کار کا رخ میری مخالف سمت تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ میری کار نہیں تھی اور اس میں میرا حریف موشرورف ہی ہو سکتا تھا۔ وہ شاید میری تلاش میں ناکام ہونے کے بعد اب وہاں سے فرار اختیار کر رہا تھا۔ میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنے پرس سے ریوالور نکال لیا، لیکن ابھی موشرورف کی کار میرے ریوالور کی رینج سے باہر تھی۔ میں اب تیز تیز چلنے کی بجائے دوڑنے لگی۔ اسی لمحے میں نے جو لین کو دیکھا جو میری کوشش کا گیٹ بند کر کے کار میں اگلی نشست پر بیٹھ گئی تھی۔

معا مجھے اپنے عقب سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کار یا موٹر سائیکل اس طرف آ رہی ہو۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا خاصے فاصلے پر مجھے ایک موٹر سائیکل سوار دکھائی دیا جو

نیزی سے اسی طرف آ رہا تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ فیصلہ کن تھا میں رک گئی اور اپنا ریوالتور دوبارہ پرس میں رکھ لیا۔ اس وقت میں نے سفید ڈائن کو حرکت میں آتے دیکھا۔ میں اپنے حریف کو اطمینان کے ساتھ فرار ہوتے دیکھتی رہی۔ اس کا سکون و اطمینان اور خود اعتمادی حیرت انگیز تھی۔ اس نے فرار ہوتے وقت ذرا سی غلٹ یا بے احتیاطی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی محبوبہ اور دست راست جو لین نے میری کوٹھی کا گھٹ بھی بند کیا تھا۔ مگر ایسے افراد اتنے کول مائنڈ نہیں ہوتے۔

ایک آخری امید کے سہارے میں وہاں چند لمحے کھڑی رہی اور اس دوران میں وہ موٹرسائیکل سوار میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے ہاتھ اٹھا کر روک لیا تھا۔ وہ ایک نوجوان تھا جو مجھے اس علاقے میں نووارد ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ میرے قریب اپنی موٹرسائیکل روک کر سوالیہ نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس سے اپنا اصل مدعا بیان کر سکتی۔ موشوروف کی کاراب سیدھی سڑک پر خاصی دور تک پہنچ چکی تھی۔ ”سنو!“ میں اس نوجوان کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ”میں انتہائی مجبوری میں تمہارے ساتھ ایک ناروا سلوک کرنے والی ہوں مجھے معاف کر دینا، تمہاری موٹرسائیکل تمہارے گھر پہنچ جائے گی!“

”جی.....! آپ..... آپ کیا کہہ رہی ہیں میں سمجھا.....“

حیرت زدہ نوجوان کی بات پوری نہ ہو سکی۔ میرا چچا تلا ہاتھ اس کی کینٹی پر پڑا۔ پھر میں نے اسے اور موٹرسائیکل دونوں ہی کو سنبھال لیا۔ موٹرسائیکل اشارت ہی تھی میں نے اس نوجوان کو بے ہوش حالت میں اس طرح ایک کوٹھی کی دیوار کے نیچے لٹا دیا کہ وہ سڑک پر گزرنے والے ٹریفک کی زد میں نہ آ سکے۔ موٹرسائیکل میں نے سینڈ پر کھڑی کر دی تھی۔

پھر جب میں موٹرسائیکل پر سوار ہوئی اور سامنے نظر دوڑائی تو موشوروف کی کار میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے چشم زدن میں گیر بدلا اور پھر خطرناک حد تک تیز رفتاری سے موٹرسائیکل دوڑائی۔ میں موٹرسائیکل پر بیٹھی ہوئی ہوا کے کسی تند تیز جھٹکے کے مانند اپنی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے سے گزر گئی۔ اس کے باوجود میں اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ مجھے دیر ہو چکی ہے اب شاید میں اپنے طاقتور اور ذہین حریف کی گرد بھی نہیں پاسکوں گی۔ اس کے بعد یہی ہوا بھی! کچھ تو میں ڈیفنس ہی کے علاقے میں ادھر ادھر موٹرسائیکل اڑائے پھری کہ شاید موشوروف ابھی اسی علاقے میں ہو پھر ڈیفنس کی حدود سے نکل کر کالا پل تک جا کے لوٹ آئی۔ موشوروف کی سفید ڈائن کا کہیں دور دور تک کوئی سراغ نہیں تھا۔

اپنی کوٹھی کی طرف واپس آتے ہوئے اس مظلوم نوجوان کا خیال آیا جس کی موٹرسائیکل پر بہ مجبوری میں نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ واپسی میں مجھے تقریباً نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ نوجوان بے ہوشی کی حالت میں اب تک اسی جگہ پڑا ہوگا اور اس دوران میں کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی ہوگی۔ اس وقت شام کے پانچ بجنے والے تھے اور یہ علاقہ پرسکون ہونے کے

باوجود ایسا نہیں تھا کہ اس عرصے میں کوئی بھی ادھر سے نہ گزرتا۔ اسی خیال کے باوجود میں نے تصدیق ضروری تھی۔ وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ شاید کسی خدا ترس شخص نے اس نوجوان کو بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ ذرا آگے جا کر میں نے موٹرسائیکل موڑ لی۔ اب میں سیدھی اپنی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔

کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر میں نے موٹرسائیکل کھڑی کی اور آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے لمبا سانس کھینچ کر یہ دیکھا کہ مہلک گیس کے اثرات اب بھی فضا میں موجود ہیں یا نہیں؟ مجھے اس نشہ آور گیس کے اثرات محسوس نہیں ہوئے۔ موٹرسائیکل اندر لا کر میں نے گیٹ بند کر دیا۔ اسی کے ساتھ میں گیٹ کا ذیلی دروازہ بند کرنا نہیں بھولی تھی۔ سیل کا وہ رکن جو چوکیدار کی حیثیت سے وہاں متعین تھا، توقع کے مطابق بے ہوشی کی حالت میں مجھے ایک پیڑ کے نیچے پڑا ہوا دکھائی دیا۔ کوٹھی مجھے اب تک سناٹے میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ موٹرسائیکل کو گیراج میں کھڑا کر کے میں تقریباً دوڑتی ہوئی عمارت تک پہنچی۔

برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر میں عمارت کے صدر دروازے پر رکی جہاں سیل کا ایک مسلح رکن بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی گن قریب ہی پڑی تھی۔ میں صدر دروازے کے دونوں پٹ کھول کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھلتے ہی خفیف سا ناگوار بھپکا مجھے محسوس ہوا اس کا مطلب یہی تھی کہ عمارت کے اندر اس مہلک نشہ آور گیس کے ابھی اثرات باقی تھے۔ میں نے اسی لیے فوراً اندر داخل ہونے سے گریز کیا۔ چند لمحے باہر رک کر میں بالآخر راہداری میں داخل ہو گئی۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر ڈرائنگ روم تھا جس کے دروازے میں سیل کے وہ دونوں ارکان بے ہوش پڑے تھے جنہیں سرفراز نے وہاں متعین کیا تھا۔ خود سہراز بھی راہداری میں ایک طرف اونڈھا پڑا تھا۔

وہاں رے بغیر میں تیزی کے ساتھ اندرونی کمروں کی طرف بڑھ گئی۔ سیل کے ارکان کے ساتھ ہی ساتھ مجھے ذکیہ کی فکر بھی تھی۔ میں پہلے اسے ایک نظر دیکھ لیتا چاہتی تھی۔ کہ وہ کس حال میں ہے؟ سیل کے ارکان کو میں نے خاص طور پر یہ ہدایت دی تھی کہ وہ ذکیہ کا خیال رکھیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جائے۔

آگے بڑھتے ہوئے میں جدھر جدھر سے گزرتی تھی کھڑکیاں اور دروازے کھلتی جا رہی تھیں تاکہ وہاں سے تازہ ہوا کا زور ہو سکے اور گیس کے باقی ماندہ اثرات ختم ہو جائیں۔ ذکیہ کے کمرے کے دروازے پر بھی مجھے ایک مسلح رکن بے ہوش پڑا ہوا نظر آیا، مگر یہ دیکھ کر میرا ہاتھ ٹھک گیا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں یقیناً مضبوط اعصاب کی مالک ہوں لیکن اس وقت لمحہ بھر کو میرے اعصاب جھنجھٹا اٹھے تھے۔ میں بہ غلٹ کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ کمرے میں روشنی بھی میں نے انتہائی اضطراب کے عالم میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کمرہ خالی تھا اور ذکیہ غائب تھی۔

سیٹل ہو گئی اور آپ نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ گزشتہ دنوں کچھ ایسے غیر متوقع حالات پیش آئے کہ خود آپ کو قاہرہ آنا پڑا اور ایک بار پھر وقت نے ہمیں یک جا کر دیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ یک جا بنی ہوئی آپ نے قبول کی ہوگی۔ آپ کی ہدایات کے مطابق میں یہاں سے قاہرہ نہیں جا رہی بلکہ میرا ارادہ چند ماہ ہندوستان میں گزارنے کا ہے۔ دہلی میں اور کلکتہ میں بھی ہمارے کچھ عزیز ہیں۔ یہ آپ کو علم ہے۔ ابھی میں فیصلہ نہیں کر پائی کہ دہلی میں رہوں گی یا کلکتہ جاؤں گی لیکن یہ طے ہے کہ امریکہ یا سوئزر لینڈ نہیں جاؤں گی۔ یہ ساری باتیں آپ سے زبانی کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا اسی لئے تحریر کا سہارا لے رہی ہوں۔ میرے پاس ہندوستان تک پہنچنے کے لئے اخراجات سفر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں ہندوستان کے ایک بینک میں بھی خاصی رقم میرے نام سے جمع ہے۔ یہ میں نے صرف اس لئے لکھا ہے کہ آپ میری طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ جس وقت آپ کی نظر سے میری یہ تحریر گزر رہی ہو گی میں کراچی چھوڑ چکی ہوں گی۔ فوری طور پر کراچی چھوڑنے کا سبب محض یہ ہے کہ میں مزید آپ کے لئے پرانے بننا نہیں چاہتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ ملک دلاور کے سلسلے میں آپ کی غلط فہمی بھی دور کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے معمولات سے کسی حد تک مجھے آگہی ہے۔ اس وقت آپ غالباً چائے پی کر سونے کی تیاری کر رہی ہوں گی اور میں یہ پرچہ لکھ کر اپنا سامان پیک کر دوں گی۔ اس کے بعد خاموشی کے ساتھ نہ صرف آپ کی کوشش سے بلکہ عارضی طور پر آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ یہاں سے جاتے ہوئے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور دوپہر کا وقت اس کے لئے انتہائی مناسب ہے۔ آپ کے زیادہ تر ملازمین بھی اس وقت آرام کرتے ہیں۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہی رہنے دوں گی اور کھڑکی کے ذریعے باہر نکل کر باہر سے کھڑکی بھیر دوں گی تاکہ آپ کے ملازمین یہی سمجھتے رہیں کہ میں اندر کمرے میں موجود ہوں۔ یہ سب اس لئے لکھ رہی ہوں کہ آپ کسی الجھن میں نہ پڑیں۔ میں کوشش کے عقبی پھانک کی طرف سے نکلنے کی کوشش کروں گی۔ بہر حال آپ کی چھوٹی بہن ہوں، ممکن ہے اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں کہ کوئی مجھے یہاں سے جاتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ کسی کی نظر میں نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ کو فیس کرنا نہیں چاہتی۔ اگر کسی نے مجھے دیکھا لیا تو یقیناً آپ کو فوری طور پر مطلع کر دیا جائے گا کہ میں جا رہی ہوں اور یہی میں نہیں چاہتی۔ امید ہے کہ آپ میری اس گستاخی اور جسارت کو معاف کر دیں گی۔ خدا حافظ! آپ کی ذکیہ۔“

ذکیہ کے اس طرح اچانک بغیر طے چلے جانے پر مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا اور دوسری طرف یہ اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ وہ ہنگامہ آرائی سے قبل نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً اپنی تحریر کے مطابق میرے ملازمین کی نظر میں نہیں آئی تھی۔ کوشش کی عقبی سمت سیل کے جن ارکان کی ذیوقی نہیں ہنگامی طور پر کوشش کے اندر بلا لیا گیا تھا۔ شاید اسی سبب ان میں سے بھی کسی کی نظر میں ذکیہ نہیں آ سکی ورنہ وہ لوگ مجھے ضرور مطلع کرتے۔ میرے اندازے کے مطابق ذکیہ عین اس وقت کوشش کے عقبی پھانک تک پہنچی ہوگی جب سیل کے ارکان وہاں سے بٹے ہوئے گئے یا پھر ذکیہ نے ان کے وہاں سے بٹنے کا انتظار کیا ہوگا۔ بہر حال وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی تھی۔ اگر موشوروف کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو یقیناً ذکیہ کی کوشش رانگاں جانی۔

حیرت و اضطراب کے ابتدائی چند لمحات گزر جانے کے بعد مجھ صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ موشوروف کا وار خالی نہیں گیا۔ میرے بجائے وہ میری بہن ذکیہ کو یہاں بنا کر لے گیا تھا۔ میری حالت اس وقت چوٹ کھائی ہوئی کسی ناگن کی طرح تھی۔ موشوروف میرے سامنے ہوتا تو میں اس کے ٹکڑے اڑا دیتی۔ اس نے بھی بالا خر وہی گھٹیا حربہ استعمال کیا تھا جو ڈاکٹر رچرڈ آرمز چکا تھا۔ موشوروف کے بارے میں میری رائے ذرا مختلف تھی۔ پہلے میرا اندازہ تھا کہ وہ امریکی ایجنٹوں کی طرح اوچھے ہتھکنڈے نہیں آزمائے گا مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہو گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ذکیہ بھی وہاں بے ہوشی کی حالت میں موجود ہوتی۔

روی ایجنٹ موشوروف پر مجھے سخت غصہ آ رہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ غصے میں عقل خبط ہو جاتی ہے۔ ذکیہ کا خالی کمرہ دیکھ کر میرا دماغ قابو میں نہیں رہا تھا ورنہ مجھے ذکیہ کے بیڈ پر پڑا ہوا وہ پرچہ فوراً نظر آ گیا ہوتا جو اس نے میرے ہی نام لکھا تھا۔ اس پرچے پر میری نظر اس وقت پڑی جب میرا ذہن نسبتاً پرسکون ہو گیا تھا اور میں ذکیہ کے کمرے کی تلاشی لے رہی تھی۔ کمرے سے ذکیہ کا سامان بھی غائب تھا۔ اگر اسے موشوروف ہی اغوا کر کے لے گیا ہوتا تو اس کے استعمال میں رہنے والا ضروری ساز و سامان وہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہاں تک کہ ہاتھ روم میں اس کا ٹوتھ پیسٹ اور برش تک نہیں تھا۔ ذکیہ کا لکھا ہوا پرچہ پڑھنے سے پہلے ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے خود ہی گئی ہے مگر کب؟ کہاں؟ اور کیوں؟ ان سوالوں کا جواب مجھے پرچہ پڑھ کر ہی معلوم ہوا۔ ذکیہ نے لکھا تھا۔ ”بابی! آداب قبول کریں۔ ابھی کچھ دیر پہلے کھانا کھاتے ہوئے آپ نے مجھ سے جو کہا تھا وہ میری ساعت میں ابھی بھی تازہ ہے، خصوصاً یہ الفاظ کہ تم کہیں بھی جاسکتی ہو.....! ملک دلاور کے سلسلے میں آپ کے لہجے کی سنجیدگی کا مطلب سمجھ لیتا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ آپ غالباً میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہیں۔ میں واضح طور پر یہ بتا دیتا چاہتی ہوں کہ میں ملک دلاور میں قطعی انٹرنیڈ نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ لاہور نہیں جا رہی اور نہ اس سے اب ملوں گی۔ یہ تو خود آپ بھی ایکسیپٹ کر چکی ہیں کہ وہ ایک دلچسپ آدمی ہے۔ میری اس سے دلچسپی صرف اسی حد تک اور محض وقت گزاری کے لئے تھی۔ ملک دلاور کے معاملے سے قطع نظر میں نے آپ کے ساتھ رہتے ہوئے ایک اور بات شدت سے محسوس کی ہے کہ مجھے بہر حال آپ سے الگ رہنا چاہئے۔ جہاں تک میں سمجھ سکی ہوں آپ فیملی لائف ایفورڈ نہیں کر سکتیں۔ آپ کا طرز زندگی جداگانہ ہے۔ اس کا احساس مجھے کئی برس پہلے ہو گیا تھا اسی لئے میں قاہرہ میں

تلاش بھی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ دن دھاڑے میری کوشش میں گھس کر مجھے اغوا کرنے آیا تھا۔ پہلے اس نے اپنی پیش کش دہرائی اور جب میں نے یہ پیش کش ایک بار پھر واضح الفاظ میں مسترد کر دی تو اس نے دوسرا اور اپنی دانست میں انتہائی حربہ آزمایا۔ اس طرح نہ صرف وہ خود بخود کر ٹکل جانا چاہتا تھا بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا اس کا مقصد تھا۔

حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں اب ایک اور نیا پہلو سامنے آ گیا تھا۔ آئندہ اپنے ذہن حریف کے اس حربے سے بچنے کا بندوبست بھی ضروری ہو گیا تھا۔ اس تیز گیس کا اثر کتنی دیر تک رہے ہوش ہو جانے والوں پر رہتا اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں اسی لئے فوری طور پر ذکیہ کے کمرے سے نکل آئی اور فون پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

ڈیوٹی پر ابھی تک عثمانی ہی تھا کمانڈر نواز کے پہنچنے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مختصراً اسے پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کیا پھر چند ضروری احکام دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ مجھے انتظار کرنا پڑا۔ میڈیکل کور کا انچارج ڈاکٹر رشید اپنے دو معاونین اور سیل کے تقریباً ایک درجن مسلح افراد کے ساتھ میری کوئی پہنچ گیا۔ سرفراز اور اس کے ساتھیوں کی جگہ سیل کے دوسرے ارکان نے سنبھال لی۔ سیل کے بے ہوش ارکان کو کوشی کے مختلف حصوں سے اٹھا کر ایک بڑے کمرے میں لے آیا گیا اور ڈاکٹر رشید انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بھی اسی کے ساتھ تھی۔ عثمانی نے ڈاکٹر رشید کو بھی آگاہ کر دیا تھا کہ معاملہ کیا ہے!

”ڈاکٹر! آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ کس قسم کی گیس ہو سکتی ہے؟ اب تک ہمارے تجربے میں آنے والی بے ہوشی کی تیسرا اتنی زود اثر اور دیر پا ثابت نہیں ہوئی ہیں۔“ میں نے ڈاکٹر رشید کو مخاطب کیا جو سرفراز کو ایک انجکشن دے کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

”میڈم! انی الحال اس ضمن میں کچھ کہنے سے میں قاصر ہوں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جس گیس کا یہ لوگ شکار ہوئے ہیں وہ کوئی نئی قسم کی انتہائی زود اثر گیس ہے ورنہ بے ہوشی کا عرصہ اتنا طویل نہ ہوتا۔“ ڈاکٹر رشید نے محتاط انداز میں میرے سوال کا جواب دیا۔

”آپ نے ان سب کا معائنہ کر لیا ہے۔ یہ بتائیں کہ خدا نخواستہ ان کی صحت کو تو کوئی خطرہ نہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”میری امید یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد یہ نارمل ہو جائیں گے؟“ گیس کا اثر ان کے جسمانی نظام پر تو کوئی؟“ میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ڈاکٹر رشید کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”ممکن ہے ان لوگوں کو کچھ دن بیڈ ریست کی ضرورت پیش آئے۔ ان کے ہلس کی رفتار فی الحال اعتدال پر نہیں ہے لیکن اس کے باوجود کوئی تباہی ناک بات نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں انہیں اپنے ساتھ آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے جاؤں! وہاں ان کی نگہداشت بہتر طور پر ہو سکے گی۔“

”آپ انہیں یقیناً یہاں سے لے جا سکتے ہیں ڈاکٹر لیکن میں..... میں فکر مند رہوں گی۔“

مناسب یہ ہے کہ انہیں یہیں ہوش آ جائے۔“

”جو آپ فرمائیں۔“ ڈاکٹر رشید نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں بھی ذکیہ کی طرح جذباتی تھی مگر میں اس کے ساتھ ریشل بھی! میرے نزدیک دل ہی سب کچھ نہیں دماغ بھی بہت کچھ ہے بلکہ دماغ کو افضلیت حاصل ہے۔ دل سے کئے گئے فیصلے عموماً عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ صرف دل کی بات مان لینا یا ہر معاملے میں محض عقل کو رہنما ٹھہرانا دونوں ہی رویے میرے خیال میں زندگی کو متوازن نہیں رہنے دیتے۔ دل کے ساتھ پاسان عقل کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں کبھی کبھی اس تنہا چھوڑ دینا زندگی کی یکسانی توڑنے کے مترادف ضرور ہے۔ علامہ اقبال کے اس شعر سے مجھے کلیتہً اتفاق ہے:

اجھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

انسان کی شخصیت میں توازن اسی سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ساری باتیں عملی طور پر ذرا مشکل ہیں۔ زندگی اور اس جہان سے جو لوگ سرسری گزر جاتے ہیں وہ ہر جا جہان دیگر کی آشنائی سے نا آشنا رہتے ہیں۔ ہر چند کہ ذکیہ میری چھوٹی بہن تھی مگر اس نے زندگی کے اتنے نشیب و فراز نہیں دیکھے تھے جن سے میں گزر چکی تھی۔ زندگی کے ساتھ اس کا رویہ ابھی جذباتی سطح سے آگے نہیں بڑھا تھا اور یہ اس کی عمر اور تجربہ بات کا تقاضا بھی تھا۔ وقتی طور پر اس کے جذباتی فیصلے نے مجھے ہکا بکا سا دھچکا ضرور پہنچایا مگر جلد ہی میں سنبھل گئی۔

یہ بات میرے لئے تعجب خیز نہیں تھی کہ ذکیہ کے کمرے کا دروازہ مجھے کھلا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی کڑیاں جوڑنا میرے لئے مشکل نہ تھا۔ میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے سوئی تھی۔ اس دوران میں ذکیہ نے مجھے خط لکھا پھر اپنا سامان وغیرہ پیک کیا۔ اس میں اسے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا ہوگا۔ پھر وہ کمرے کی کھڑکی کے رستے عقبی بھانگ تک پہنچ گئی۔ اسی عرصے میں ملازمہ نے مجھے بیدار کیا اور میں نے سرفراز کو ضروری ہدایات دیں۔ عقبی بھانگ پر متعین سیل کے ارکان کو بھی کے اندر آ گئے اور ذکیہ ادھر سے نکل گئی۔ ادھر ذکیہ کا کمرہ اندر سے بند ہونے کے سبب یہ سمجھا گیا کہ وہ اپنے کمرے ہی میں ہے حالانکہ اس وقت کمرہ خالی تھا۔ میرے حکم پر باہر سے بھی کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا اور پھر وہاں سیل کا ایک مسلح رک رک بھی تعینات کر دیا گیا۔ موثر دف سے فوج کر میں کوشی سے نکل گئی اور اس دوران میں موثر دف نے مجھے کوشی کے اندر تلاش کیا۔ اسی تلاش میں وہ ذکیہ کے کمرے تک پہنچ گیا۔ موثر دف ایسے شخص کے لئے م معلوم کر لینا کہ بند کمرے میں کس طرح داخل ہوا جائے؟ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی کے ذریعے ہی کمرے میں گھسنے کی کوشش کی ہوگی۔ کھڑکی پہلے ہی سے کھلی ہوئی تھی۔ موثر دف اندر پہنچا اور پھر اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے کھول دیا۔ کمرے میں کسی کو بھی نہ پا کر وہ وہاں نہیں رکا ہوگا اور دروازہ کھلا چھوڑ گیا ہوگا۔ میرے ذہن نے جو کڑیاں جوڑی تھیں اس کا ثبوت کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی بھی تھی۔ ذکیہ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہی رہنے دوں گی اور کھڑکی کے ذریعے باہر نکل کر باہر سے کھڑکی بھڑ دوں گی تاکہ آپ کے ملازمین یہی سمجھتے رہیں کہ میں اندر کمرے میں موجود ہوں۔

اس واقعے سے یہ تصدیق بھی ہو گئی کہ میں بے ہوشی کی گیس پھیلنے کی بعد موثر دف کو میر

اسی وقت سیل کے ایک رکن نے مجھے اطلاع دی کہ میری ملازمہ خاص فاطمہ اور چند دیگر پرانے ذاتی ملازمین مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں اس ہنگامہ آرائی میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ آج شام ہی ان لوگوں کو بھی آنا تھا۔ کمانڈر نواز نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ آج شام یہ لوگ پہنچ جائیں گے۔

”کہاں ہیں وہ لوگ؟“ میں اپنے پر جوش لہجے پر پوری طرح قابو نہ پاسکی۔ مجھے اپنے ذاتی ملازمین سے کچھ ایسا ہی جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ برسوں سے میرے ساتھ تھے اور میں ایک طرح سے ان کی عادی ہو گئی تھی۔

”ہنگامی حالات کے پیش نظر انہیں کوٹھی کے گیٹ پر ہی روک دیا گیا تھا۔“ سیل کے رکن نے جواباً بتایا۔

”نہیں.....! انہیں اندر آنے دو.....! یہ گھرانہ ہی کا تو ہے اور گھر والوں کو اس طرح روکا نہیں کرتے۔“ میرا لہجہ جذباتی تھا۔

سیل کے اس رکن نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر اقرار میں سر ہلا کر واپس جانے کے لئے مڑا۔

”سنو.....! میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں ان سب کو وہیں بھیج دو۔“ یہ کہہ کر میں ڈاکٹر رشید سے مخاطب ہوئی۔ ”جب یہ لوگ ہوش میں آجائیں تو آپ مجھے مطلع کر دیجئے گا۔“ پھر میں نے قریبی ہی کھڑے ہوئے سیل کے ایک رکن سے کہا۔ ”کیرج میں ایک موٹر سائیکل کھڑی ہے اس کی چابی میں تمہیں دے رہی ہوں۔ تمہیں فی الحال یہ موٹر سائیکل یہاں سے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے جانا ہے۔“ پھر مختصر امین نے اسے بتا دیا کہ ضرورتاً وہ موٹر سائیکل مجھے بالآخر ایک نوجوان سے چھیننا پڑی تھی۔ ”اس کے نمبروں سے کل تمہیں یہ پتا لگتا ہے کہ اس کا مالک کون ہے! پھر یہ موٹر سائیکل اس کے گھر پہنچا دینا ہے۔ یہ خیال رہے کہ کسی بھی مرحلے پر تم سامنے نہیں آؤ گے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل کی چابی اپنے پرس سے نکال کر اس کے حوالے کر دی اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہاں سے میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا اور ایڑی چیئر پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد میری کوٹھی کا وہ حصہ آباد ہونے والا تھا جو مدت سے ویران پڑا تھا اور وہی حصہ کیا پوری کوٹھی ہی چند دن پہلے تک غیر آباد تھی۔ عارضی طور پر سروینٹ کوارٹرز میں سیل کے ان ارکان کا قیام تھا جو میرے ذاتی ملازمین کا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ بھی اک حسن اتفاق تھا کہ اب وہ لوگ کوٹھی چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نشہ آور گیس کے زیر اثر آنے کے بعد ان سبھی کو کچھ دن ہیڈ ریٹ کی ضرورت تھی۔ اس موقع پر میرے پرانے ذاتی ملازمین کی آمد ایک نیک فال ہی تھی۔ چونکہ ڈاکٹر ایور اور مالی کے علاوہ میرے ذاتی ملازمین میں فاطمہ سمیت کبھی عورتیں تھیں۔ ان سب کی حیثیت ایک خاندان کی سی تھی۔ آپس میں وہ سیل ملاپ سے رہتے تھے۔ میں نے کمانڈر نواز سے جو کچھ کہا تھا درست ثابت ہوا تھا۔ وہ سب اس عرصے میں جہاں جہاں ملازمت اختیار کر چکے تھے میری خاطر اسے چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ ان سب کے علاوہ میرے لئے بھی یہ ایک خوشی کا دن تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ سب فاطمہ کی رہنمائی میں میرے کمرے میں آئے تو میں نے کرسی سے اٹھ کر فاطمہ کو گلے سے لگا

ایا اور فاطمہ میرے گلے سے لگ کر یوں رونے لگی جیسے ایک مدت کے بعد کوئی لڑکی اپنے میکے واپس آتی ہے۔

”آسو پونچھ لو فاطمہ اور اپنا گھر سنبھال لو۔“ میں نے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس بقیہ ملازمین سے مخاطب ہوئی۔ ”کیا تم لوگ اپنا سامان لے آئے ہو؟“

”جی ہاں..... باہر لان میں ہمارا سامان رکھا ہے۔ نواز بابو نے ہمیں بتا دیا تھا کہ دوبارہ ہمیں یہاں رہنا ہے۔“ مالی نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے تم سب لوگ پہلے جس جس کوارٹر میں رہتے تھے اسی میں رہو گے۔ کل صبح تمہیں ایک مہینے کی تنخواہ بھی پیشگی مل جائے گی فاطمہ سے لے لینا۔ ابھی کچھ دیر بعد سروینٹ کوارٹرز خالی ہو جائیں گے۔ تم سب ان لوگوں کا سامان اٹھوانے میں مدد کرنا میں ابھی کہے دیتی ہوں۔ تم لوگوں کی غیر موجودگی میں مجھے وقتی طور پر کچھ لوگوں کو یہاں ملازمین کی حیثیت سے رکھنا پڑا تھا۔“ یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھی اور گھر کی چابیاں فاطمہ کے حوالے کر دیں۔ پھر سرفٹ کوارٹرز خالی کرانے کے لئے احکام دینے لگی۔

میرے ملازمین کمرے سے نکل کر پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

پھر تقریباً ایک گھنٹے میں تمام ضروری ”کارروائی“ مکمل ہو گئی۔ اس عرصے میں نشہ آور گیس کا ہمار ہونے والے تمام افراد کو ہوش آ گیا تھا۔ ڈاکٹر رشید کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ ابھی ان لوگوں کو طبی نگرانی کی ضرورت تھی۔ ان سبھی کو آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا گیا۔ اسی کے ساتھ سروینٹ کوارٹرز سے ان کا سامان بھی نکال کر ساتھ ہی بھیج دیا گیا۔ سروینٹ کوارٹرز میں اب میرے دیرینہ ملازمین آباد ہو چکے تھے۔ میری کوٹھی کی نگرانی اب سرفراز اور اس کے ساتھیوں کے بجائے سیل کے دوسرے ارکان کے سپرد کر دی گئی تھی۔

اپنے پرانے ملازمین کی واپسی کے سبب مجھے پہلی بار حقیقتاً یہ احساس ہوا کہ میں اپنی کوٹھی میں لٹ آئی ہوں اور سب کچھ وہی ہے جو پہلے تھا۔ رات کا کھانا کھانے سے قبل فون پر میں نے کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کیا۔ میرا حریف مشوروف کراچی پہنچ چکا تھا اور یہاں پہنچنے ہی اس نے پہل کر دی تھی۔ اب گویا میری باری تھی۔ عموماً میں اپنے کسی دشمن کو اتنا موقع نہیں دیتی تھی کہ پلٹ کر وہ دوبارہ مجھ پر وار کر لے۔ دوسرے وار سے پہلے ہی میں پیش قدمی شروع کر دیتی تھی۔ مشرقی پاکستان رواجی سے قبل مشوروف کو میں کم از کم اس ”دلیرانہ گستاخی“ کا جواب ضرور دینا چاہتی تھی۔ کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کرنے کا سبب یہی تھا۔ عثمانی سے اسے پیش آنے والے واقعے کا علم ہو چکا تھا۔

”کمانڈر! آج کی رات خالی نہیں جانا چاہیے!“ میں نے فون پر کمانڈر نواز سے کہا۔

”لیکن میڈم جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ کہاں ٹھہرا ہے ہم کیا کر سکتے ہیں!“ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”یہی تو تمہیں آج رات معلوم کرنا ہے! تمہارا کیا خیال ہے وہ کہاں ٹھہرا ہوگا؟“

”یہاں کے کسی بڑے ہوٹل میں وہ یقیناً نہیں ٹھہرا ہوگا۔“ کمانڈر نواز کے لہجے میں یقین کا

تاثر تھا۔

”یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟“

”اس شخص کی کیریکٹر ریڈنگ کے سبب!“ کماڈرنواز نے جواب دیا۔ پھر مزید بولا۔

”اس شخص کے حوالے سے اور اس کی بابت جو واقعات و حالات سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں شخص غیر معمولی ذہین ثابت ہوا ہے اور کسی بھی ذہین شخص سے اس قسم کی حماقت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ مطلب یہ کہ وہ کسی بڑے ہونٹ میں قیام کر کے خود کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ میرا خیال ہے کہ خود آ بھی میری بات سے اتفاق کریں گی۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم؟“ میں نے یہ کہتے ہوئے طویل سانس لیا۔ ”پھر کیا کیا جائے؟ اسے کہ کہاں تلاش کیا جاسکتا ہے؟“

”دوسرے درجے کے یا تیسرے درجے کے معمولی ہونٹوں میں!“ کماڈرنواز بولا۔

”اور ایسے ہونٹوں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔“

”اور ایسے ہونٹوں کی تعداد تمہارے خیال میں کتنی ہوگی؟“ جواب دیتے ہوئے اس بات خیال رکھنا کہ یہ کراچی شہر ہے! یہاں کسی کو تلاش کرنا بہر حال آسان نہیں۔“

”دوسرے اور تیسرے درجے کے ہونٹوں کی کل تعداد کا تو مجھے فی الحال علم نہیں لیکن ان فہرست مرتب کی جاسکتی ہے جو آئندہ بھی ہمارے کام آتی رہے گی۔ پھر بھی یہ ایک لمبا کام ہے جس کے لئے کئی دن درکار ہوں گے۔ بہر حال اگر آپ کا حکم ہو تو آج ہی رات سے یہ کام شروع کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے کام میں آسانی کی ایک صورت بہر حال ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے مطلوبہ افراد غیر ملکی ہیں۔ کسی دوسرے درجے کے ہونٹ میں یہ معلوم کر لینا وقت طلب نہیں ہوگا کہ وہاں کوئی غیر ملکی جوڑا قیام پذیر نہیں؟“

”یہ امکان بھی تو ہے کہ وہ دونوں الگ الگ ہونٹوں میں ٹھہرے ہوں۔“ میں بول اٹھی۔

”جی ہاں۔“ کماڈرنواز نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”ہم اس امکان کو مد نظر رکھیں گے۔“

”میرا مشورہ یہ ہے کہ کماڈرنواز بڑے ہونٹوں کو بھی تم ان لسٹ ہی رکھو۔! نہ سبھی آج ہی رات۔! تم ان دونوں کی تلاش شروع کر دو۔! میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آج کی رات خالی ہو جائے گی۔ میں اس سلسلے میں تم سے رابطہ قائم رکھوں گی۔ اوکے؟“

”اوکے میڈم!“

کماڈرنواز سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد مجھے ملک دلاور کا خیال آیا۔ اس کی ذرا سی حماد کے سبب ذکیہ مجھ سے تقریباً ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ اسے بھلا کیا مار پڑی تھی جو وہ ذکیہ کو اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتا تھا۔ اگر ڈاکٹروں نے اسے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا تھا تو وہ تنہا بھی لاہور یا کم اور جاسکتا تھا۔ پھر یہ کہ میرے علم میں کوئی بات لائے بغیر بالائی بالا اس نے ذکیہ کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ہر چند کہ اپنی تمام تر لاف و گزاف کے باوجود ملک دلاور میرے نزدیک لوز کر نہیں تھا اور نہ ہی ذکیہ کوئی بچی تھی۔ اس نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ اس کے باوجود ملک دلاور کی یہ حرکت

رات مجھے کچھ بھلی معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں اسے لتاڑنا چاہتی تھی۔ ذکیہ تو خیر جا ہی چکی تھی اس لئے میں اپنا سارا غصہ ملک دلاور ہی پر اتارنا چاہتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے اس کا نمبر ملا لیا۔

فون پر میری آواز سنتے ہی وہ حسب معمول جھپٹنے لگا اور جواباً میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”ملک دلاور! اپنی حد سے تجاوز کرنے کی کوشش تمہیں مہنگی بھی پڑسکتی ہے! اس وقت میں تم سے ایک سنجیدہ مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے بچپنا چھوڑ دو!“

”مگر وہ جو ایک عدد فامی گانا ہے بچپن کے دن بھلا نہ دینا! اس کے بارے میں آپ کا کیا حال ہے؟ کیا اس گیت نگار نے غلط بول کھسے ہیں؟“

”یہ بتاؤ کہ تم ذکیہ کے ساتھ لاہور کب جا رہے ہو؟“ میں نے اس کی بات اور اپنے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے نرمی سے سوال کیا۔

”تو کیا آپ نے محترمہ ذکیہ خان کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی؟“ اس کے لہجے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے! میں نے تم سے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دو!“

”آپ اس سے مجھے ایک عدد جوان جہان بہن کی بڑی بہن لگنے کے بجائے شہر کو توال بلکہ انہیں معلوم ہو رہی ہیں جو شہر کے اندیشے میں ڈب۔۔۔۔۔۔“

”کچھ اس بے وقوفی پر!“ میرا موڈ اکھڑ گیا۔ ”ہر وقت کی بک بک اچھی نہیں لگتی۔ اگر تم اب بھی ہمیں بات کرنے پر راضی نہیں ہوئے تو یہ تمہارے ہی حق میں برا ثابت ہوگا!“ میرے لہجے میں سختی بھی لاہور دھمکی بھی!

خدا! معلوم میرے لہجے کے سبب یا پھر کسی اور وجہ سے ملک دلاور راہ راست پر آ گیا اور بولا۔

”میں نے آپ کی بہن سے کہہ دیا تھا کہ جب تک آپ اجازت نہیں دے دیں گی میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ آپ سے اجازت لے لیں گی۔ کل رات کو میں ان دونوں کا انتظار کرتا رہا مگر ظاہر ہے وہ بھی تو آپ کی بہن ہیں۔ تو پانا شاید آپ کا خاندانی وتیرہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟“ اپنی بات ختم کرتے کرتے وہ پھر غیر سنجیدہ ہونے لگا۔

”اگر تم میرا ہی خیال معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو ملک دلاور تم انتہائی بے وقوف آدمی ہو! ذکیہ تمہیں بہت آسانی سے الو بنا دیا۔ اس کا پروگرام تو آج دوپہر کی ایک فلائٹ سے اٹھایا جانے کا تھا۔

انے اپنی روانگی سے قبل مجھے بتا دیا تھا کہ تم اس کے فون کا انتظار کر رہے ہو گے۔ تمہاری اطلاع کے مرض ہے کہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق دوپہر کو روانہ ہو چکی تھی۔ وہ تمہیں درباری مسخرے کا خطاب دے گئی ہے اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ تم اس جہان فانی میں ذرا لیت تشریف لائے ورنہ دو چار صدی پہلے اسے تو کسی دربار سرکار میں مسخرے ہوتے۔ وہ بہر حال ایک ذہین اور بالغ فکر لڑکی ہے اسی لئے میں اس کی رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ کیا خبر وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہو!“ یہ سب کچھ کہنے کا مقصد انتقامی روانی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری بات سن کر ملک دلاور کو غصہ آجائے گا اور ایسا ہی ہوا بھی!

”کیا آپ یہ سب کچھ سچ کہہ رہی ہیں؟“ اس کی آواز میں غصے کا تاثر تھا۔

اس کی جو چاہیں تعریف کریں میں نے اسے ایک ذہنی کیفیت کا نام دیا ہے جس میں انسانی دماغ کے کچھ ایسے خلیے بھی متحرک یا فعال ہو جاتے ہیں جو عام حالات میں غنودہ رہتے ہیں یا کام نہیں کرتے۔ یہ خالصہٴ سائنٹفک معاملہ ہے۔ اس کا کوئی تعلق کسی اسرار سے نہیں! تصوف کی ایک اصطلاح کشف کو بھی میں اسی طرح سمجھتی ہوں۔

عقائد کی رو سے وجدان و کشف کی مختلف توجہات کی جاتی رہیں لیکن میں بڑی صاف گوئی اور سچائی کے ساتھ یہ لکھ رہی ہوں کہ ان توجہات نے مجھے کبھی مطمئن نہیں کیا۔ ممکن ہے اس کا سبب وہ ذاتی تجربات ہوں جن سے میں اپنی زندگی میں دوچارہ ہوئی۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ ہر انسان کا دماغ کشف یا وجدان کا اہل نہیں ہوتا۔ سائنسی طور پر اس کا تجربہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر انسان کے دماغ کے خلیات (سینز) یکساں طور پر بیدار نہیں ہوتے۔ ان کی تعداد کم ہے اور کمزور ہو سکتی ہے۔ دانشوروں، فنکاروں، سائنس دانوں، بڑے سیاست دانوں اور خدا کے برگزیدہ بندوں کے دماغ کے خلیات نسبتاً زیادہ بیداری کی حالت میں ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ بھی قادر مطلق کسی فرد کے دماغ کے خوابیدہ خلیات کو متحرک کر سکتا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ یہاں اس لئے عرض کیا کہ میرے بعض قارئین سائنس سے آگاہ نہ ہونے کے سبب میری آپ بیتی کو بوج نہیں جانتے۔ وہ اسے کوئی برا سرِ عمل سمجھتے ہیں۔ کسی تخلیق کار پر تخلیقی لمحات میں سرشاری و لذت کی جو کیفیت گزرتی ہے اسے کم از کم کوئی فنکار نہیں جھٹلا سکتا۔ وہ بھی تو ایک وجدانی ہی لمحہ ہو گا جس میں ایک بڑے دماغ نے کششِ ثقل دریافت کی اور نہاتے ہوئے برہنگی کی حالت میں چپٹا ہوا ہوا گاکہ میں نے پالیا، پالیا! وجدانی کیفیت کی ایسی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ یہ سب سائنسی حقیقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ ایسی ہی ایک ذہنی کیفیت کا بیان کئی جگہ میری آپ بیتی میں بھی آچکا ہے جسے ابتدا میں خود میں بھی برا سرِ اسرار ہی سمجھتی تھی۔ جس شب کا میں ذکر کر رہی ہوں کہ اپنی کوشی کے لان میں ٹہل رہی تھی اور روسی ایجنٹ موشوروف کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اسی شب بھی اچانک میں ایک ایسے ہی تجربے سے گزری۔

ٹہلتے ٹہلتے میرے سارے وجود میں ایک لذت انگیز سنسنائی ہونے لگی۔ ایک سرشاری کی سی کیفیت میں مجھے اپنے دماغ میں روشنی کے جھماکے سے محسوس ہوئے۔ میں رک کر وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ کیف و بے خودی کی منزلوں سے گزرتے ہوئے میری پلکیں بوجھل ہوئی گئیں۔ پھر میری آنکھیں بند ہو گئیں اور ذہن بیدار ہو گیا۔ اسی عالم میں اپنے صفحہ ذہن پر میں نے دو دھندلی سی شبیں ابھرتے دیکھیں جو رفتہ رفتہ واضح ہو گئیں۔ ان میں سے ایک چہرہ موشوروف کا تھا اور دوسرا چہرہ اس کی فرانسسیسی محبوبہ جین آندرے کا پھر ان دونوں کے چہرے نسبتاً دور ہوتے گئے اور ارد گرد کا منظر بھی واضح ہونے لگا۔ وہ دونوں ایک قدیم طرز پر بنی ہوئی عمارت کا گیٹ کھول کر باہر آ رہے تھے۔ گیٹ کے باہر ایک کار کھڑی تھی۔ سفید رنگ کی ڈائن! وہ کار میں آ بیٹھے اور چند لمحے بعد کار اسٹارٹ ہو گئی۔ کار اس گلی سے نکل کر مین روڈ پر آ گئی۔ یہ کراچی ہی کا ایک علاقہ تھا۔ سفید ڈائن، سو لجر بازار سے گرومند کی طرف آنے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پھر میری چشم تصور اس سفید کار کا تعاقب کرتی رہی اور یہ تعاقب میری کوشی کے گیٹ پر ختم ہوا۔ اس کے بعد میں نے ان دونوں کو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے دیکھا۔ منظر کسی تیز رفتار فلم کی طرح جلدی

”ہاں بھئی بالکل سچ کہہ رہی ہوں اگر تمہیں میری بات پر یقین نہ ہو تو خود یہاں میری کوشی آ کر تصدیق کر سکتے ہو ذکیہ واقعی جا چکی ہے۔ اس نے تمہارے متعلق اور بہت سے گیمٹس دیئے تھے! میں صرف اس لئے نہیں بتا رہی کہ کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔“

”بتا دیں وہ بھی کوئی خرچ نہیں! میں برا نہیں مانوں گا۔ کم سے کم اس طرح مجھے اہل حیثیت کا اندازہ تو ہو جائے گا۔“

”چھوڑو بھی ملک دلاور! میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچے۔ یوں بھی تم آ، کل بیمار ہو۔“

”بیمار ضرور ہوں مگر کامل رحم نہیں سمجھ گئیں آپ!“

”تم کل کاہل کہہ رہے ہو یا کاہل!؟ میں سمجھی نہیں! ویسے کاہل افغانستان کا دارالکومر ہے۔ ہاں یاد آ ذکیہ کہہ رہی تھی کہ جس شخص کا تلفظ تک درست نہ ہو اسے بھلا کیسے گھاس ڈالی جاسکتی۔ گھاس ڈالنے کا مطلب تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو گے نا!“

”جی ہاں! اچھی طرح سمجھتا ہوں گھاس ڈالنے کا مطلب! اور..... اور آپ کو بھی اُم طرح سمجھتا ہوں! مجھے شاید اب آپ کے بارے میں اپنی رائے بدلنا پڑے گی۔ آپ انتہائی بے اور سفاک عورت ہیں! آپ کو..... آپ لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ..... کہ میں اس..... شہر..... تنہا اور..... اور بیمار ہوں۔ ڈاکٹروں نے مجھے آب و ہوا کی تبدیلی کا مشورہ دیا ہے..... مگر آپ..... آ، کی بہن اور آپ..... اس کی آواز بھرا گئی اور اسی کے ساتھ اس نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔“

یہ پہلا موقع تھا کہ ملک دلاور کے اندر..... مروی جاگ اٹھی تھی۔ وہ اس بھری دنیا میں واقعی تھا۔ مال و دولت اور عیش و آسائش ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اس کے خاندانی پس منظر کا علم تھا۔ اپنے والدین کی اگلوئی اولاد تھا اور والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے عزیز واقارب بہت سے تھے کوئی سگ نہ تھا۔ اس کے باپ نے خاصی دولت چھوڑی تھی اور جائیداد بھی! لاہور کے نواح میں ار خاصی زمین بھی تھی زیر کاشت زمین! مگر کافی عرصے پہلے اپنی تنہائی سے گھبرا کر اور اپنے لاپچی عزت و اقارب سے ابتر کر وہ کراچی میں آ بسا تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی ہنسی کے پیچھے کیا دکھ چھا ہے! ہر وقت ہنسنے، مسکرانے اور قہقہے لگانے والا شخص ملک دلاور اندر سے دھکی اور اکیلے پن کا شکار آدھی جب بیمار پڑ جاتا ہے تو کچھ زیادہ ہی حساس ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ملک دلاور کے ساتھ ہوا تھا۔ عام حالات میں وہ بھی اپنے دکھ کا اظہار نہ ہونے دیتا۔ باتوں میں ہی باتوں میں شخص ”انتقامی کارروائی کے طور پر ملک دلاور کے ساتھ زیادتی ہو گئی تھی۔ اسی کے تذکر کی خاطر میں نے فیصلہ کیا کہ آج اس کی عیادت کرنے ضرور جاؤں گی۔“

اس شب رات کو نوجب کے قریب میں نے کھانا کھایا اور پھر چہل قدمی کی غرض سے اپنی کے لان میں آ گئی۔ ٹہلتے ٹہلتے مجھے ایک بار پھر موشوروف کا خیال آ گیا اور میں سوچنے لگی کہ اس وقت جانے وہ کہاں ہو گا؟ میں نے شاعری کے باب میں ایک قسم کی وجدانی کیفیت کے متعلق پڑھا ہے ا بھی کہ وجدان کا تعلق شعور سے نہیں ہوتا۔ وجدان کے لغوی معنی کچھ بھی ہوں جو عام شعراء و ناقدین

ڈائن کا نمبر بھی لکھوا کر بولی۔ ”جنہیں فوری طور پر یہ معلومات حاصل کرنا ہے کہ یہ کوئی کس کی ملکیت ہے اور اس شخص سے موشرورف کا کیا تعلق ہے؟ دوم یہ کہ موشرورف کے پاس جو کار ہے اس کا مالک کون ہے۔ اس طرح ہم ان لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں جو یہاں ہمارے ملک میں روسی ایجنٹوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے میڈم مگر..... مگر کیا آپ آج ہی رات موشرورف پر ہاتھ ڈالنا چاہتی ہیں؟“
کمانڈر نواز نے کچھ چبھتے ہوئے سوال کیا۔
”ہاں بالکل..... لیکن میں وہاں اکیلی ہی جاؤں گی۔ آپریشن سیل کا کوئی بھی رکن میرے ساتھ نہیں ہوگا۔“

”کیا..... کیا میں تنہا جانے کی وجہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟“
”اس کا سبب تم میری انا تصور کر سکتے ہو!“ میں نے وہی کہہ دیا جو میرے دل میں تھا پھر مزید بولی۔ ”جب موشرورف یہ دلیرانہ قدم اٹھا سکتا ہے کہ میری کوئی میں کس کر یہ خیریت نکل جائے تو خدا خان میں اتنی ہمت و جرات نہیں کہ اس کا جواب دے سکے! میں سختی کے ساتھ تمہیں تاکید کرتی ہوں کہ تم یا سیل کا کوئی بھی رکن اس کوئی کے قریب نہیں آئے گا! اب تم میرا حکم بھی سمجھ سکتے ہو اور غالباً تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ حکم کی خلاف ورزی میں کئی صورت برداشت نہیں کرتی۔ اس سلسلے میں تمہیں جو کام سپرد کیا گیا ہے تم اس سے تجاوز نہیں کوو گے!“

”یقیناً ایسا ہی ہوگا میڈم!“ کمانڈر نواز نے مجھے یقین دلایا۔ ”آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ میں کچھ اور عرض کرنا چاہتا تھا۔“
”ہاں بولو! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”آپ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں خود یا سیل کا کوئی بھی رکن اس کوئی کے قریب نہیں آئے گا۔ یہ حکم ہے نا آپ کا؟“

”ہاں میں نے یہی کہا ہے..... مگر اس بات کو دہرانے اور تصدیق کرنے سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”وہی عرض کر رہا ہوں۔“ کمانڈر نواز نرمی سے بولا۔ ”آپ سے ایک درخواست ہے اگر آپ قبول فرمائیں۔ ہمیں اس علاقے کی ناکہ بندی کی اجازت دے دیں تاکہ کسی مرحلے پر موشرورف فوج کر فرار ہونے کی کوشش کرے تو اس کی یہ کوشش ناکام بنادی جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس درخواست کو آپ قبول کر لیں گی۔“

”کمانڈر! تم اگر وکالت کا پیشہ اختیار کر لیتے تو واقعی ایک کامیاب وکیل ثابت ہوتے۔“ یہ کہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”گھما پھرا کر آخر تم مجھ سے وہ بات منوالینا چاہتے ہو جو میں نہیں چاہتی۔ یہ بتاؤ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے کہ میں تمہارا اس سے منٹنے کی اہلی نہیں ہوں؟“

”کیوں نہیں میڈم!“ وہ پر جوش آواز میں کہنے لگا۔ ”آپ یقیناً اس کے لئے کافی ہیں۔“
”ہاں صرف امکانات کی کمی اور آپ نے ہمیں خود ہی یہ سبق دیا ہے کہ جذبات سے قطع نظر کسی بھی امکان

جلدی بدلنے لگے۔ جلد ہی وہ لمحہ آ گیا جب موشرورف ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ڈرائنگ روم میں دھواں ہی دھواں بھر گیا۔ موشرورف اور جن اس دھواں میں غائب ہو چکے تھے اور میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ عین اسی مرحلے پر میں نے گہرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور سارے جسم میں سنسناہٹ اب جمی موجود تھی۔ میں بدستور گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں میرا حالت اعتدال پر آ گئی اور پھر میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ میرے حیرت انگیز ذہن نے ایک معاملہ کر دیا تھا۔ میری چشم تصور نے موشرورف کے ذریعے گزرے ہوئے وقت کی ایک جھلک دکھائی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ میرا ذہن حریف اس شہر میں کہاں ٹھہرا ہوا ہے! خود میرے اور کمانڈر نواز کے قیاسات اس سلسلے میں قطعی غلط ثابت ہوئے تھے۔ موشرورف اور اس کی محبوبہ کا قیام کسی ہوٹل میں نہیں بلکہ ایک کوئی میں تھا۔ اس کوئی کے گیٹ کی بائیں جانب سنگ مرمر کے ایک چوکور ٹکڑے پر میں نے ”سکس مجید“ بھی لکھا دیکھا تھا اور کوئی کا نمبر بھی مجھے واضح طور پر نظر آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ سفید ڈائن کی نمبر پلیٹ پر بھی میری نظر پڑی تھی۔ اس کار کے نمبر بھی مجھے یاد تھے۔ وہ گلی بھی میرے ذہن میں محفوظ تھی جس کے ٹکڑ پر ایک شراب خانہ تھا۔ وہاں سے گرد و مندر زیادہ دور نہیں تھا۔

لان سے اٹھ کر میں تیزی کے ساتھ کوئی میں پہنچی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی سب سے پہلے میں نے کانڈ پر اس کوئی کا پتا لکھا پھر کار کا نمبر بھی لکھ دیا۔ وال کلاک پر میری نظر پڑی تو پونے دس بج رہے تھے۔ کمانڈر نواز سے فون پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا میری چھٹی حس بتاتی ہے کہ آج کی رات خالی نہیں جائے گی۔ اس وقت مجھے قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ حقیقتاً ایسا ممکن ہوگا مگر اب اس کے واضح امکانات پیدا ہو گئے تھے۔

وقت ضائع کئے بغیر میں نے فون پر فوراً ہی کمانڈر نواز سے رابطہ قائم کر لیا اور دوسری جانب سے اس کی آواز سننے ہی بڑے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”کمانڈر! بات بن گئی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ موشرورف کہاں ٹھہرا ہوا ہے!“

”جی.....؟ کمانڈر نواز کی آواز میں شدید حیرت تھی۔ ”ابھی چند گھنٹے پہلے تو آپ نے مجھے اس سلسلے میں احکام دیئے تھے!“

”ہاں.....! اور ابھی چند منٹ پہلے مجھے اس کے ٹھکانے کا علم ہوا ہے۔ تم فوری طور اپنے ان تمام آدمیوں کو واپس بلاؤ جنہیں موشرورف کی تلاش میں روانہ کیا ہے۔ وہ کسی بڑے یا چھوٹے ہوٹل میں نہیں ٹھہرا۔“

”پھر.....؟ پھر وہ کہاں ٹھہرا ہے؟“
”ڈرائیو سے کام لو میں ابھی تمہیں سب کچھ بتائے دیتی ہوں۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لینا۔ میں اس کوئی کا پتا تمہیں لکھوا رہی ہوں نوٹ کرو!“
”جی لکھوائیے!“ کمانڈر نواز چند لمحے بعد بولا۔
میں نے اس کوئی کا پورا پتا لکھوا کر کمانڈر نواز کو مکمل وقوع بھی سمجھا دیا اور اسی کے ساتھ سفید

کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ جو واقعہ ابھی رونما نہیں ہوا اس کے بارے میں میں قطعی طور پر کوئی حکم لگانا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک ہے کمانڈر.....! تم خود میرے ہی دلائل سے مجھے قائل کر رہے ہو۔ تمہیں اس علاقے کی ناکا بندی کرنے کی اجازت ہے اور کچھ؟“

”ٹھیک پویری مچ میڈم!“ کمانڈر نواز کے لہجے میں بے پایاں مسرت تھی۔

اس کے بعد کمانڈر نواز کو ”خدا حافظ“ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ میں نے اسے مصلحتاً یہ نہیں بتایا تھا کہ فوری طور پر میرا ارادہ روائگی کا ہے۔

اپنی کوٹھی سے روائگی میں بمشکل میں نے مزید نصف گھنٹا لیا۔ میں نے اس دوران میں موٹوروف سے نمٹنے کی کچھ تیاریاں کر لی تھیں۔ کچھ ایسے ”چٹکے“ تو بہر حال میرے پاس بھی تھے جو وقتی طور پر ہی سہی موٹوروف ایسے شخص کو بھی بدحواس کر دیتے۔ میں پوری تیاری کے ساتھ اپنی کوٹھی سے روانہ ہوئی تھی۔ سیل کے جوار کان میری کوٹھی کی گھرائی پر مامور تھے انہیں بھی میں نے ٹرانسمیٹر پر یہ حکم دے دیا تھا کہ وہ میرے پیچھے نہ آئیں۔

گرو مندر پر پہنچنے میں مجھے دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہاں سے میں سو لجر بازار جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے اپنی کار اس شراب خانے کے سامنے فٹ پاتھ کے قریب کھڑی کر دی جو مطلوبہ گلی کے کھڑ پر تھا۔

کار سے اترتے ہی مجھے ایک روزنامے کا صفحہ نظر آیا جو مجھے پہچانتا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شراب خانے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ غالباً وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ خدا خواستہ میں بھی اس کی طرح اسی شراب خانے میں جا رہی ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔ جواب میں نے بھی ہاتھ اٹھایا اور پھر اسے نظر انداز کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی گلی میں داخل ہو گئی۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ خواہ مخواہ ”کمبل“ ہونے کی کوشش کرے۔

آہستہ خرامی کے ساتھ میں اس گلی میں بڑھتی چلی گئی۔ اگر اس وقت کوئی مجھے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں کسی خاص مکان کی تلاش میں ہوں۔ میرے انداز و اطوار سے یہی ظاہر تھا۔ میں بغیر کسی ضرورت کے دونوں اطراف مکانوں اور کوٹھیوں کے نمبر بڑھتی ہوئی چل رہی تھی۔ اپنی کار میں نے دانستہ مین روڈ ہی پر چھوڑ دی تھی۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ روائگی سے قبل میں نے اپنے لباس پر بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ میرے پیروں میں فل بوٹ تھے جن کے سول ربر کے تھے تاکہ بھاگتے ہوئے زیادہ آواز نہ ہو۔ جوتے بہت ہلکے پھلکے تھے جیسے عموماً کھلاڑی پہنتے ہیں۔ ان کا رنگ گہرا نیلا تھا جو نیم تاریکی میں سیاہی مائل ہی معلوم ہو رہا تھا۔ نسبتاً چست پنٹ کا رنگ بھی سیاہ تھا جس کے ساتھ میں نے ڈھیلی ڈھالی سیاہ شرٹ پہن رکھی تھی۔ میری شرٹ اور پنٹ کی جیبوں میں بھی مختلف سامان تھا جو بہ وقت ضرورت میرے کام آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے ہاتھ میں سیاہ چڑیے کا ایک بیگ بھی تھا۔ اس بیگ میں بھی ضروری سامان تھا۔ میں اپنی کوٹھی سے پوری تیاری کے ساتھ چلی گئی کہ کسی بھی قسم کے متوقع حالات سے نمٹ سکوں۔

مجھے یقین تھا کہ وہ بھاری تن و توش والا صفحہ جو موٹے فریم کی عینک لگائے ہوئے تھا اور جس نے سلام بھی کیا تھا شراب خانے کے دروازے پر مزید کھڑا رہنا پسند نہیں کرے گا۔ شراب کی للک اسے وہاں نہیں رکھے دے گی۔ اپنے اندازے کی تصدیق کیلئے مطلوبہ کوٹھی سے کچھ پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میری توقع کے مطابق شراب خانے میں جا چکا تھا۔

وہ گلی تقریباً نیم تاریک تھی اور اس وقت وہاں میرے سوا کوئی تھا بھی نہیں۔ مطلوبہ کوٹھی کے سامنے مجھے سفید ڈائن کار کھڑی ہوئی نظر نہ آئی۔ اب میں اس کے گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں کار کھڑی نہ دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا مگر میں نے یہ سوچا کہ شاید اس وقت کار اندر پارک کر دی گئی ہو۔ گیٹ کی دوسری سمت مجھے گھنے درخت نظر آ رہے تھے اور کچھ فاصلے پر بائیں جانب عمارت میں روشنی تھی۔ عمارت میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود تھا۔ کوٹھی کا گیٹ بھی اس کی کہنکی کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ لکڑی کے اس گیٹ میں ذیلی دروازہ بھی تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر دیکھا وہ بھی اندر سے بند تھا۔

میں نے لکڑی کے اس گیٹ پر چڑھنے سے پہلے گلی میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اور پھر چشم زون میں اس پر چڑھ کر بچوں کے بل اندر کود گئی۔ میرے اندر کودنے سے بس ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔ میں انتہائی سرعت سے غراہٹ کی سمت چلی۔ خوف ناک شکل و صورت کا ایک بلند ہاؤنڈ کتا نہ جانے کدھر سے نکل کر مجھ پر جست لگا چکا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے کریہہ دہانے کا ہدف میری گردن تھی لیکن اس سے پہلے ہی فضا میں اسے میں نے سنبال لیا۔ میری انگلیاں اس کے زرخرے میں پوسٹ ہو گئیں۔ پھر چند ہی لمحوں میں اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں نے اسے آہستہ سے ایک طرف پھینک دیا۔ آواز نکالے بغیر وہ ملک عدم سدھار چکا تھا۔ اگر میں پوری طرح چوکنا نہ ہوتی یا مجھے اس کی طرف متوجہ ہونے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو وہ مجھے بھنبھوڑ کے رکھ دیتا۔ کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد اس پہلے خطرناک تجربے نے مجھے مزید محتاط کر دیا۔

کوٹھی کے اندر کا ماحول عجیب براسرار تھا تھا احاطے میں گھنے پھڑ گئے ہوئے تھے جن کے درمیان ایک پختہ پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ جودا میں بائیں بل کھاتی ہوئی عمارت تک چلی گئی تھی۔ اندر پہنچ کر میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہاں کار کھڑی کرنے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ کار کو اسی لئے گلی میں گیٹ کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہوگا۔ گلی میں کار کی غیر موجودگی سے یہ خیال بھی میرے ذہن میں آیا کہ شاید اس وقت موٹوروف کہیں گیا ہوا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی مجبوریہ جین آندرے بھی اسی کے ساتھ ہو۔ اگر میرا یہ خیال درست بھی تھا تو مجھے بہر حال ان کی واپسی کا انتظار کرنا تھا اور اس سے پہلے عمارت میں موجود افراد سے بھی نمٹنا تھا۔ یہی سوچ کر میں گیٹ سے ہٹ کر درختوں کے درمیان پہنچ گئی جہاں تقریباً اندھیرا تھا۔ وہاں میں نے چڑے کے بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے سیاہ لبادہ نکالا اور اسے اوپر سے اوڑھ لیا۔ اس سیاہ لبادے میں مرا جسم چھپ گیا۔ اس میں آستینیں بھی تھیں جن میں دونوں ہاتھ ڈال کر کمر کے گرد سلی ہوئی بیلٹ میں نے باندھ لی۔ آنکھوں کی جگہ اس لبادے میں دو سوراخ تھے جن سے میں دیکھ سکتی تھی۔ ہونٹوں اور ناک کا نچلا حصہ کھلا رکھنے کیلئے بھی اس میں جگہ تھی تاکہ بولنے اور سانس لینے میں دشواری نہ ہو۔ اس بیلٹ کڈائی میں دیکھ کر کوئی بھی شخص مجھے جرائم پیشہ ہی سمجھ سکتا تھا مگر جرائم کی بنیاد

کے لئے اکثر مجھے خود بھی وہی تمام حربے آزمانا پڑے ہیں جو عموماً جرائم پیشہ افراد کے لئے مخصوص ہیں۔ اس وقت بھی میں کسی ایسے منجھے ہوئے جرائم پیشہ شخص کا کردار ادا کر رہی تھی جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کسی بھی رکاوٹ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔

سیاہ لبادہ پہن لینے کے بعد پختہ پگڈنڈی پر چلنے کی بجائے میں درختوں کی آڑ لیتی ہوئی عمارت تک پہنچ گئی۔ عمارت کے سامنے ایک بڑا سا چوڑا بنا ہوا تھا جس کے درمیان اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اوپر ہی عمارت کے صدر دروازے پر ایک بلب روشن تھا۔ میں نے اپنی پینٹ کی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی نال پر سائیکلنر چڑھایا اور پھر بلب کو نشانہ بنا دیا۔ سائیکلنر کی وجہ سے گولی چلنے کی آواز تو نہیں ہوئی بلب ٹوٹنے کی آواز ضرور ہوئی اور ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ میں ایک درخت کی آڑ میں چھپی ہوئی صدر دروازے ہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دروازے کی دوسری جانب روشنی اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ دروازے کے اوپری حصے کے دونوں پٹوں میں مونٹے شیشے لگے ہوئے تھے۔ گہرے سکوت میں بلب ٹوٹنے کی آواز بھی خاصی تیز سنائی دی تھی۔ یہ آواز ممکن ہے عمارت کے مکینون نے بھی سنی ہو۔ یہ سوچ کر چند لمحے میں نے کسی رد عمل کا انتظار کیا مگر عمارت کا دروازہ کھول کر حقیقت حال جاننے کے لئے کوئی بھی باہر نہیں نکلا۔

کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد میں نے چڑے کے بیک سے ایک لمبی نال والی شے نکالی جو بظاہر گرن ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی نال کا اگلا حصہ کسی پچکاری سے مشابہ تھا۔ دستے کی جگہ مخیم تھی اور اندر سے کھول کر جس میں ایک سیال مادہ بھرا ہوا تھا۔ لمبی دبانے سے یہ سیال مادہ اپنے ہدف تک پہنچتا تھا۔ اس کی بھی ریخ مقرر تھی۔ عمارت کا صدر دروازہ اس کی ریخ سے باہر نہیں تھا۔ میں نے نیم تاریکی بلکہ تقریباً تاریکی میں صدر دروازے کی طرف نالی سیدی کی اور لمبی دبا دی۔ خطرناک سیال مادہ لمحوں میں صدر دروازے تک پہنچ گیا۔ اسی کے ساتھ دروازے میں آگ لگ گئی۔ وہ آتش گیر مادہ تھا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جلتے ہوئے دروازے کی روشنی میں اس کے اوپری حصوں کے شیشوں پر پے در پے دو فائر کئے۔ صدر دروازے کے قریب ہی دائیں بائیں دو دروازے اور بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کے عقب میں روشنی نہیں تھی۔

میرے نزدیک اتنا کافی تھا اگر اس عمارت میں کوئی موجود تھا تو اسے اب لازماً باہر آ جانا چاہئے تھا۔ پھر چند ہی لمحے بعد میرا توقع پوری ہو گئی۔ صدر دروازے کی دائیں جانب والے دروازے کے پیچھے مجھے روشنی نظر آئی۔ غالباً کسی نے اس کمرے کا بلب جلا یا تھا۔ ذرا دیر بعد میں نے اس کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلتے دیکھا مگر فوری طور پر کوئی باہر نہیں آیا۔ میری نظریں دروازے ہی پر مرکوز تھیں۔ وہ دروازہ تھوڑا سا اور کھلا اور مجھے ایک ریوالور کی نال باہر جھانکتی نظر آئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا ریخ تھا۔ غالباً وہ دروازے کی جبری سے پہلے باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے دروازہ کھول دیا اور میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ جین آندرے تھی۔ موشرورف کی فراہمی محبوبہ اور دست راست! دروازہ کھولتے ہی فوراً وہ باہر آ گئی اور کسی چوکنا ہرنی کی طرح اس نے انتہائی تیزی سے چاروں طرف دیکھا تھا۔ پھر جلتے ہوئے صدر دروازے کو حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

میں اندھیرے میں پیڑ کی آڑ لئے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اس وقت اس عمارت میں جین آندرے اکیلی ہے۔ اس کے سوا اندر کوئی اور نہیں ورنہ جین کی بجائے وہی باہر آتا۔ شب خواتی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں بھی اس کا حسن نمایاں تھا۔ اس کے سنہری پال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ قدموں کی چاپ نہ ابھرے اسی سبب دانستہ شاید وہ ننگے پاؤں باہر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا خوب صورت ریوالور تھا اور وہ ریوالور کی نال پر سائیکلنر چڑھانا بھی نہیں بھولی تھی۔

اپنے ہاتھ سے ریوالور رکھ کر میں نے دوبارہ آتش گیر مادہ پھینکنے والا ہتھیار اٹھالیا۔ اس بار میرا نشانہ صدر دروازے کی بائیں جانب والا دروازہ تھا۔ میں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ وہ خطرناک مادہ جین کے جسم کو کم نہ کر سکے کیونکہ وہ اس دروازے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میری توقع کے عین مطابق اس دروازے نے بھی فوراً آگ پکڑ لی۔ جین کی نگاہ جیسے ہی اس دروازے پر پڑی وہ تقریباً اچھل پڑی۔ شعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ تھما رہا تھا اور چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

ایسے حالات میں آہنی اعصاب رکھنے والے بھی وقتی طور پر حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ جین بھی یقیناً مضبوط اعصاب رکھتی تھی لیکن یہ معما اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ کس طرح ”خود بہ خود“ جلتے لگا؟ آتش گیر مادے کی پتلی سی دھار پر اس کی نظر یقیناً نہیں پڑ سکتی تھی۔

خوف و استعجاب کے ان لمحوں سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اچانک آواز بدل کر زور سے بولی۔ ”جین! جس طرح یہ دروازہ خود بہ خود شعلوں کی زد میں آ گیا ہے اسی طرح تمہارا وجود بھی شعلوں میں گھر سکتا ہے۔ اگر تم اس سے بچنا چاہتی ہو اور ابھی موت کو گلے لگانا نہیں چاہتی تو ریوالور پھینک کر چوڑے سے پیچھے ہٹ آؤ!“

جین ایک بار پھر اچھل پڑی مگر اس نے میرا حکم ماننے کی بجائے فوراً خود کو سنبھال لیا اور تیزی کے ساتھ مڑ کر میری طرف فائر کیا۔ اس کی پھرتی اور اتنی جلدی حواس پر قابو پالینا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ اس نے میری آواز سے اندازہ لگا کر کہ میں کہاں چھپی ہوئی ہوں حیرت انگیز حد تک صحیح نشانہ لیا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی اس درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی تھی۔ میں جس کی آڑ لئے ہوئے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ اس کا نشانہ بہت سچا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کر سکتی میرے ریوالور نے شعلہ اگل دیا اور جین کے ہاتھ سے ریوالور نکل کر جلتے ہوئے دروازے میں جا گرا۔ میں نے اس کے ریوالور ہی کا نشانہ لیا تھا۔

”اپنے دونوں ہاتھ اٹھا دو جین.....!“ میں نے اسے حکم دیا۔ ”ورنہ اس بار میری چلائی ہوئی گولی تمہارے سینے میں بھی پیوست ہو سکتی ہے۔“ یہ کہتے ہی میں نے ایک فائر اور کیا۔ گولی جین کے بائیں کان کے قریب سے گزر گئی۔

یہ عملی دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور جین نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنا ریوالور اور آتش گیر ہتھیار چڑے کے بیک میں رکھا اور اس کی زپ بند کر کے جتیں بھرتی ہوئی لمحوں میں جین کے قریب پہنچ گئی۔

اپنی کار کو اس کوشی کے پھانک تک لانے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ کار کو میں نے پھانک کے قریب کھڑا کیا تھا اور اس کا پچھلا دروازہ بھی کھول دیا تھا۔ کار کو میں نے اشارت ہی رہنے دیا اور اگلا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ اطراف میں نظر دوڑا کر میں پھر پھانک کا ذیلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ جین کا بے ہوش جسم بدستور اسی جگہ پڑا تھا جہاں میں چھوڑ کر گئی تھی۔ میں نے جبکہ کر اسے اٹھا لیا اور باہر لا کر اسے اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ کار کا پچھلا دروازہ بند کر کے میں نے کوشی کا ذیلی دروازہ بھیڑا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ دوسرے ہی لمحے میرے چیر کا دباؤ ایکسپلیرٹر پر پڑا اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اسی لمحے میری نگاہ عقبی آئینے پر پڑی۔ کافی فاصلے پر عقب سے ایک کار گلی میں داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ سفید ڈائن ہی تھی۔ میں نے صرف چند منٹ کے فرق سے بازی جیت لی تھی۔ اب موشروف کو جب تک صورت حال کی سنگینی کا علم ہوتا میں اس علاقے سے کافی دور نکل چکی ہوتی۔ اس سفید ڈائن میں آنے والا موشروف کے سوا بھلا اور کون ہو سکتا تھا!

کچھ فاصلہ تیزی سے عبور کر کے میں بائیں جانب ایک گلی میں مڑ گئی۔ پھر گلیوں ہی گلیوں
سولجر بازار اور اس کے بعد جماعت خانے کے سامنے سے گزرتی ہوئی گاڑوں سے لیبیل کی طرف جانے
والی روڈ پر نکل آئی۔ لیبیل سے ناظم آباد کی طرف جاتے ہوئے میں نے کار میں موجود ٹرانسمیٹر پر آپریشن
سیل ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا۔

”ہیلو..... ہیلو..... عذرا خان اسپیکنگ.....! اور!“
 ”یس میڈم.....! کمانڈر نواز آن دی لائن، اور۔“

”پروگرام کے مطابق کیا تمہارے آدمی اس علاقے کی ناکابندی کئے ہوئے ہیں؟ اور۔“

”جی ہاں!“ کانڈر نواز نے جواب دیا۔ ”ابھی کچھ دیر قبل ان کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ آپ اس علاقے سے نکل چکی ہیں مگر اسی کے ساتھ ایک اور اہم خبر ملی ہے کہ اسی دوران میں موشوروف اس گٹھی کی طرف گیا ہے۔ یقیناً وہ آپ کو اس گٹھی میں نہیں ملا ہوگا۔ کیا آپ اس اطلاع کے بعد دوبارہ اصرار جائیں گی؟ اور۔“

”نہیں!“ میں نے جتنی لہجے میں جواب دیا۔ ”میں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آ رہی ہوں۔ امید تو نہیں کہ موشوروف کو تمہارے آدمی گھبرائیں لیکن کوشش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ تمہارے آدمیوں کو جمل دے کر نکل جائے گا۔ ایسی صورت میں تمہارے آدمیوں کو اس کوشش کی اچھی طرح تلاشی لینا ہے۔ وہاں سے کاغذات کی صورت میں جو کچھ بھی ہاتھ لگے حاصل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ موشوروف کی محبوبہ چین کے استعمال میں آنے والی تمام ضروری اشیاء جن میں کپڑے وغیرہ بھی شامل ہیں وہاں سے لانا ہیں۔ تلاشی میں کسی بھی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی! تم اپنے آدمیوں کو پوری طرح تاکید کر دینا۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر اس دوران میں پولیس کی طرف سے مداخلت ہو تو تمہارے آدمیوں کو وہاں سے فرار ہو جانا ہے اور کسی کو کبھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا۔ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ اگر موشوروف توقع کے مطابق فرار ہو گیا تو فوری طور پر پولیس سے رابطہ قائم کرے گا کہ اس کی کوشش میں ڈاکو گھس گئے ہیں وغیرہ! اس لئے کوشش کی تلاشی میں انتہائی عجلت اور چوکنا رہنے کی

”میں تمہیں لینے آئی ہوں جین.....! ہم دونوں شطرنج کھیلیں گے۔“ میں نے اپنی اصل آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”تم.....تم.....عذرا.....عذرا خان؟“ وہ حیرت زدہ سی آواز میں بولی۔ اس نے مجھے میری آواز سے پہچان لیا تھا۔

”ہاں میں ہی ہوں!“ یہ کہتے ہوئے میں نے سیاہ لہادے کی پیلٹ کھول دی اور پھر اسے اتار کر بیگ میں رکھ دیا مگر اس دوران میں میری توجہ جین کی طرف رہی تھی۔ میں نے اس سے مزید کہا۔ ”مجھے افسوس ہے جین کہ اس وقت موشروف یہاں نہیں ہے ورنہ تمہارے ساتھ اسے بھی میں میزبانی کا شرف ضرور بخشی!“

چین کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ اس سے پہلے میرے ہاتھ کی ضرب اس کے سر پر پڑ چکی تھی۔ اس کا حسین جسم لہرایا اور میں نے فوراً ہی گرنے سے پہلے اسے سنبھال لیا۔

یہ اندازہ لگاتے ہی کہ کٹھی میں اس وقت صرف جین آندرے ہے موشوروف نہیں میں دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی اور اب اسی فیصلے پر عمل درآمد کر رہی تھی۔ موشوروف کو ترپانے زچ کرنے اور بہ طور جوابی کارروائی یہ بھی کوئی کم بات نہ ہوتی کہ اس کی محبوبہ اس کی دست راست کو غائب کر دیا جاتا۔ مجھے آخر اس سے اپنا پچھلا قرض بھی تو چکانا تھا! قاہرہ میں اس کی ”مہمان نوازی“ ابھی میں بھولی تو نہیں تھی! رہا موشوروف تو میرے قیاس کے مطابق جین کی جدائی وہ کی طور برداشت نہ کر پاتا۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا وہ شخص جین کی قربت کا عادی ہو چکا تھا۔ جین کی غیر موجودگی میں اس کی قوت کار نصف رہ جاتی۔ اگر جین آندرے اس کے لئے ناگزیر نہ ہوتی تو وہ ساری دنیا میں اسے ساتھ ساتھ لئے نہ پھرتا۔ جذباتی رشتے کسی بھی فرد کی کارکردگی پر ہر حال میں اثر انداز ہوتے ہیں جو لوگ نارمل حالات میں انتہائی ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں کسی قسم کا جذباتی دھچکا انہیں اندر سے توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ نتیجہ وہ عقل کو بالائے طاق رکھ کر جذباتی رو میں بہہ جاتے ہیں اور اس صورت حال سے ان کے ذہن خفاں نہیں بھر پور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ موشوروف کے کیس میں بھی میں یہی حکمت عملی اختیار کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح اس سے نمٹنا میرے لئے آسان ہو جاتا۔

جین کی بے ہوشی کے بعد اب میں اسے جلد از جلد وہاں سے لے کر نکل جانا چاہتی تھی۔ اس نازک سی لڑکی کو میں نے یہ آسانی اٹھایا اور پھر تیزی کے ساتھ کونٹھی کے چھانک تک پہنچ گئی۔ پھانک اب بھی اندر سے بند تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ مشوروف اس وقت کہاں گیا تھا اور کب تک اسے لوٹ کر آتا تھا۔ اس کی واپسی کسی بھی لمحے ہوسکتی تھی۔ پھر وہاں سے جین کو نکل لے جانا اتنا آسان نہ ہوتا۔ مجھے بہر حال رسک تو لینا ہی تھا۔ میں نے اسی لئے جین کے بے ہوش جسم کو پھانک کے قریب ایک پیڑ کے نیچے اندھیرے میں ڈال دیا اور پھر پھانک کا ذیلی دروازہ کھول کر نہایت پرسکون انداز میں باہر آ گئی۔ باہر آ کر ذیلی دروازہ میں نے بند کیا اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ گلی عبور کرنے لگی۔ اب میں جلد از جلد اپنی کار تک پہنچنا چاہتی تھی۔

”جی..... اس کوٹھی کا مالک صدر مملکت کا ایک قریبی مشیر شیخ مجید ہے جس سے خود آپ بھی ایک بار مل چکی ہیں۔“

”شیخ مجید!“ میں چونک اٹھی۔ ”وہی نا جسے شہر یار قتل کر دینا چاہتا تھا اور جس پر یہیں کراچی میں کئی قاتلانہ حملے بھی ہوئے تھے!“ میں جیسے خود کلائی میں جھٹلا رہی۔ ”جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا تعلق بائیں بازو کی ایک جماعت سے ہے!“

”صدر مملکت کا مشیر ہونے سے قبل خود شیخ مجید کی سکونت اس کوٹھی میں تھی۔“ کمانڈر نواز مزید بتانے لگا۔ ”مشیر ہونے کے بعد شیخ مجید اپنی ساری فیملی کے ساتھ اسلام آباد منتقل ہو گیا تھا۔ یہ کوٹھی عموماً خالی ہی پڑی رہتی ہے۔ اس کی حیثیت اب شیخ مجید کے مہمان خانے کی سی ہے۔ اب شیخ مجید اسلام آباد سے کراچی آتا ہے تو اپنے بہنوئی مشتاق احمد کے گھر ہاتھ آئی لینڈ میں ٹھہرتا ہے۔ مذکورہ کوٹھی پر مسکن مجید کا پتھر اسی لئے لگا ہوا ہے۔“

”تو گویا یہ معاملہ بھی اوپر تک گیا ہے۔ شہر یار کی طرح بائیں بازو کے افراد بھی اپنے مفادات حاصل کرنے کی خاطر کسی نہ کسی طور غیر ملکی ایجنٹوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوا کمانڈر کہ موشوروف کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں بھی انتہائی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جہاں تک شیخ مجید کے بارے میں میری ریڈنگ ہے وہ اپنے نظریات سے قطع نظر بہر حال ایک نڈر اور ذہین سیاست دان ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ شہر یار کی طرح گھنیا ذہنیت کا مالک بھی نہیں ہے۔ اگر اس سے معرکہ آرائی کی نوبت آئی جس کا امکان فی الحال نہیں تو وہ کبھی اوچھے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ روسی ایجنٹ موشوروف سے اس کا تعلق نظر پائی طور پر تو ہو سکتا ہے مگر اس تعلق کی قیمت ملک و قوم سے بے وفائی یا غداری کی صورت میں ادا نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود بہر حال یہ بات تشویش ناک ہے کہ اس نے ایک کنفرم غیر ملکی ایجنٹ کو اپنی کوٹھی میں مہمان بنا کر رکھا تھا۔ اس نے اور خود موشوروف نے اپنی بچت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور رکھا ہوگا کہ بات کھل جانے کی صورت میں کیا کہانی سنائی جائے! تم میری بات سمجھ رہے ہو؟“

”جی میڈم“ میں آپ کے خیالات کو فالو کر رہا ہوں۔“ کمانڈر نواز بولا۔

”شیخ مجید اور موشوروف کے تعلق کی وہ کہانی کیا ہے؟ ہمیں اس کا سراغ لگانا پڑے گا۔ عین ممکن ہے کہ تلاشی کے دوران میں کوئی ایسا کلیو ہمارے ہاتھ آ جائے۔ یہ ہاتھ بھی قابل غور ہے کہ موشوروف اور جین بظاہر کس حیثیت سے پاکستان آئے ہیں۔ ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جن کے جواب چنانہ ضروری ہیں۔ ہم اسی کے بعد موشوروف پر کوئی چارج لگا کر اسے قانون کے حوالے کر سکتے ہیں جو فی الحال ممکن نظر نہیں آ رہا۔ وہ شخص بلا کا ذہین اور چالاک ہے۔ اول تو اس کا ہاتھ آتا ہی مشکل ہے اور اگر وہ ہاتھ آ بھی گیا تو اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ہاں مجھے ایک امید ہے ضرور ہے کہ اپنی دست راست جین کی غیر موجودگی میں اس سے کوئی جذباتی حماقت سرزد ہو جائے اور ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔“

”جین آندرے کے بارے میں قاہرہ سے واپسی کے بعد مختصر آپ نے کچھ بتایا تھا۔ اس کی

ضرورت ہے۔ ارد گرد کی کوٹھیوں اور مکانات میں رہنے والے بھی اس کوٹھی میں پراسرار نقل و حرکت اور ہنگامہ آرائی محسوس کر کے پولیس کو مطلع کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ بتاؤ کہ تمہارے آدمیوں کے پاس گیس ماسک ہیں؟ اور۔“

”انہیں پوری تیاری کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ میڈم“ تاکہ وہ ہر قسم کی صورت حال سے نمٹ سکیں۔ اور۔“ کمانڈر نواز جواب بولا۔

”اور اینڈ آل!“ یہ کہتے ہی میں نے ٹرسمیٹر کا سوئچ آف کر دیا۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچنے تک جین بے ہوش نہ رہی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اسے آدھے پون گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ وہاں اسے میرے حکم پر اس کمرے میں رکھا گیا جہاں ایک طویل عرصے سے امیر کی باغی ایجنٹ جعفر ن کو رکھا گیا تھا جو اب پولیس کی تحویل میں تھا۔ میرے ”مہمان خانے“ کا یہ حصہ انتہائی محفوظ تھا۔ اس پر شب و روز مسلح محافظوں کی کڑی نظر رہتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ مجھے اب موشوروف کے بارے میں رپورٹ کا انتظار تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے کوٹھی فون کر دیا تھا کہ ممکن ہے آج شب میری واپسی نہ ہو۔ میرے دیرینہ ملازمین کیلئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یوں بھی میں کوٹھی سے رات کا کھانا کھا کر چلی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے والے تھے۔ رات آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں بھی گزاری جاسکتی تھی۔ اسی لئے احتیاطاً میں نے اپنی ملازمہ خاص فاطمہ کو اس سے مطلع کر دیا تھا تاکہ وہ فکرمند نہ ہو۔ جین کے ہوش میں آنے کے بعد ابھی مجھے اس سے بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں اور اس سے پہلے کمانڈر نواز سے بھی کچھ دریافت کرنا تھا۔

اپنی کوٹھی فون کرنے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر انٹر کام پر کمانڈر نواز سے بات کرنے لگی۔ پہلے میں نے اس سے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں پوچھا۔ ”کیا رہا کمانڈر؟ ادھر سے کوئی رپورٹ ملی؟“

”جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا اور پھر ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے بولا۔ ”موشوروف بچ کر نکل گیا۔ آپ کا اندازہ درست ثابت ہوا۔“

”مگر کس طرح؟ تفصیل سے بتاؤ!“

”اندازے کے مطابق موشوروف نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی غیر معمولی صورت حال کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ غالباً اسی لیے وہ وہاں نہیں رکا۔ کار بھی وہ وہیں کوٹھی کے سامنے کھڑی ہوئی چھوڑ گیا تھا۔ اسی کی وجہ سے سیل کے ارکان اس دھوکے میں آ گئے کہ موشوروف ابھی کوٹھی ہی میں ہے لیکن جب وہ کوٹھی میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی نہیں تھا حالانکہ اسے کار سے اتر کر کوٹھی کے اندر داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ غالب قیاس یہی ہے کہ وہ کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر فرار ہوا ہے۔ کوٹھی کے عقب میں ایک اور کوٹھی کا احاطہ تھا۔ اس میں کود کو شاید وہ وہاں رکے بغیر کوٹھی کا پھانک کھول کر نکل گیا تھا۔ برابر والی کوٹھی کا چوکیدار بے ہوش ہے۔ سیل کے ارکان ابھی تک کوٹھی کی تلاشی لے رہے ہیں۔“ کمانڈر نواز نے تفصیلی رپورٹ دی۔

”اس کوٹھی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کس کی ملکیت ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس کے علاوہ یہ کہ آج رات وہ پاک روس دوستی کی انجمن کی جانب سے ایک دعوت میں بھی شریک تھا۔ آج ہی کے اخبار میں یہ خبر بھی تھی۔“ کمانڈر نواز نے بتایا۔

میں کچھ سوچتے ہوئی بولی ”اور یہ دعوت یقیناً رات گئے تک چلی ہوگی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟“

میرا لہجہ معنی خیز تھا۔

”غالباً آپ اس مکان پر غور کر رہی ہیں کہ موشرورف اسی دعوت میں شرکت کرنے گیا ہوگا!“

کمانڈر نواز میری بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

”ہاں میں یہی سوچ رہی تھی۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”مگر اس دعوت میں وہ چین کو کیوں نہیں لے گیا یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی!“

”اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ موشرورف اسی دعوت میں شرکت کرنے گیا تھا تو چین کو ساتھ نہ لے جانے کی وجہ پر خود چین ہی روشنی ڈال سکتی ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ یقیناً رہی ہوگی۔“

”میں کوشش کروں گی کہ چین سے کچھ معلوم کر سکوں۔“ میں نے کہا پھر پوچھا۔ ”ان لوگوں کی طرف سے کیا خبر ملی جو مسکن مجید کی تلاشی لے رہے تھے؟ غالباً کچھ دیر پہلے ٹرانسمیٹر پر ممبر انہی کی طرف سے کوئی پیغام ملا ہے!“

”وہ لوگ ابھی کوٹھی کی تلاشی لے ہی رہے تھے کہ وہاں پولیس کے پہنچنے کی اطلاع مل گئی۔ پولیس کی وہاں آمد سے قبل ہی وہ وہاں سے نکل آئے اور اب آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر آ رہے ہیں۔“

”تلاشی کے دوران میں کچھ ملا بھی یا.....“ میں نے دانست اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”کہا تو ہے ان لوگوں نے کہ بہت سے کاغذات ہاتھ لگے ہیں مگر ابھی انہوں نے ان کاغذات کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا۔ کاغذات وہ ساتھ لا رہے ہیں۔“

”اور چین کے کپڑے اور دیگر استعمال کی ضروری اشیاء؟“

”وہ بھی!“

”ٹھیک ہے جب وہ لوگ پہنچ جائیں تو تم مجھے مطلع کرنا میں یہیں اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہوں۔ اب ان لوگوں کی آمد کے بعد ہی میں چین سے ملوں گی۔ تم وہ تمام کاغذات چین کا ضروری سامان اور اس کے کمرے کی چابی میرے پاس بھجوا دینا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہی ملے گا۔“

”جی بہتر ہے۔“ کمانڈر نواز نے کہا اور میں انٹر کام کا ریسپورر رکھ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ مہلت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھا کر میں کچھ دیر تک آرام کر لینا چاہتی تھی۔

بستر پر دراز ہوئے ابھی مجھے بہ مشکل چند منٹ ہوئے تھے کہ میں چونک اٹھی۔ میرے دماغ کو ہکا سا جھٹکا لگا اور اسی کے ساتھ ساعت میں ایک آشنا آواز گونجنے لگی۔ ”فریادی.....! فریادی!“ وہ آشنا آواز یقیناً موشرورف کی تھی مگر فوری طور پر حیرت اور غیر متوقع ذہنی رابطہ قائم کرنے کے سبب میری سمجھ میں وہ بات نہ آ سکی کہ وہ خود کو ”فریادی“ کیوں کہہ رہا ہے! یہ تو خود وہ بھی جانتا تھا کہ ایک عربی بل فریادی بلکہ پراسرار فریادی کا ڈھونڈ کھل چکا تھا۔ میرے لئے یہ عین ممکن تھا کہ میں اس سے ذہنی رابطہ استوار نہ ہونے دیتی مگر اب میں اس پر قادر ہو چکی تھی کہ وہ میرا ذہن نہ پڑھ سکے اور میں اسے ٹریپ بھی کر سکوں۔

روشنی میں میں یہ عرض کروں گا کہ وہ بھی آسانی سے زبان نہیں کھولے گی۔“ کمانڈر نواز نے کہا۔

”کیا فضول بات کر رہے ہو تم کمانڈر.....! اس لڑکی کو انٹر اسٹیٹ نہ کرو! زبان کھولنا کیا معنی! وہ تو چیز ہی اور ہے۔ موشرورف نے بے سبب اسے اپنا دست راست نہیں بنالیا!“ یہ کہہ کر میں نے مختصر آج رات پیش آنے والے واقعے سے کمانڈر نواز کو آگاہ کیا۔

”آپ کا خیال قطعی درست معلوم ہوتا ہے۔“ کمانڈر نواز میری پوری بات سن کر کہنے لگا۔

”چین بھی یقیناً غیر معمولی ذہن کی مالک ہے اور آہنی اعصاب رکھتی ہے۔ اس جگہ کوئی بھی لڑکی ہو تو آپ پر فائز کرنے کی بجائے بوکھلا کر پورا پورا پھینک دیتی۔“

آریشن سیل ہیڈ کوارٹر میں ایک ان ڈور گیمز روم بھی تھا جو عموماً ان دنوں بند ہی پڑا رہتا تھا۔ سیل کے ارکان کو اتنی فرصت ہی نہیں مل پاتی تھی کہ کسی کھیل میں حصہ لے سکیں۔ وہاں دیگر گیمز کے علاوہ شطرنج کی بساط اور مہرے بھی تھے۔ روسیوں کو اس قدم کھیل سے خصوصی دلچسپی ہے۔ موشرورف بھی روسی تھا اور اسے بھی اپنے ملک کے اس قومی کھیل سے لگاؤ تھا۔ اسی کی وجہ سے چین آندرے کو بھی یہ شوق لگ گیا تھا۔ میں قاہرہ میں چین کے ساتھ شطرنج کھیل چکی تھی۔ اس وقت میری حیثیت ایک قیدی کی تھی اور اب چین میری قید میں تھی۔ کچھ تو نفسیاتی حربے کے طور پر اور کچھ سابقہ حساب چکانے کی خاطر میں نے چین کے ساتھ اس وقت شطرنج کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اسے یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ صرف موشرورف ہی کو ”آداب میزبانی“ نہیں آتے بلکہ میں بھی ان سے واقف ہوں۔ اسی دوران میں چین کو کھیل میں لگا کر میں کچھ کام کی باتیں بھی معلوم کر لینا چاہتی تھی۔ میں نے اسی لئے اس وقت کمانڈر نواز سے کہا کہ چین کے کمرے میں شطرنج کی بساط اور مہرے پہنچا دو اور یہ بھی چیک کر لو کہ وہ ہوش میں آ چکی ہے یا نہیں!

”میں ابھی آپ کے حکم کی تعمیل کر آئے دیتا ہوں۔“ کمانڈر نواز جواب میں بولا۔

”سنو! یہ بھی معلوم کراؤ کہ.....“

”میڈم! ایکسکیوز می..... پلیز ہولڈ آن.....! ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا ہے میں ابھی آپ سے.....“

”نیو مائنڈ!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم بات کر لو اس کے بعد میں تمہیں ضروری ہدایات دے دوں گی۔ میں ریسپورر رکھ رہی ہوں“ یہ کہہ کر میں نے انٹر کام کا ریسپورر رکھ دیا۔

چند ہی منٹ بعد کمانڈر نواز نے خود ہی مجھ سے انٹر کام پر رابطہ قائم کر لیا اور بولا۔ ”جی فرمائیے آپ کیا کہہ رہی تھیں؟“

”تمہیں یہ معلوم کرانا ہے کہ ان دنوں شیخ مجید کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

”غالباً آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔ آج ہی اس کا ایک بیان چھپا ہے۔ کل شام کراچی ہی میں اس نے مزدور یونینوں کے رہنماؤں کے ایک نمائندہ اجلاس سے خطاب کیا ہے۔ وزیر محنت اور سماجی بہبود بھی اس جلسے میں شریک تھے۔ وزیر محنت نے اس جلسے کی صدارت کی تھی اور شیخ مجید مہمان خصوصی تھا۔“

”سوری کمانڈر میں آج کا اخبار نہیں دیکھ سکی۔ بہر حال یہ اچھا ہی ہے۔“

ہرگز نہیں! وہ پر یقین آواز میں بولا۔ میری اطلاعات کے مطابق آج کل ان کی توجہ کارکن مشرقی پاکستان ہے۔ وہ سب وہیں ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر چرڈ کا دست راست سولومن اہی ان دنوں ڈھاکہ میں ہے۔ مجھے علم ہو چکا ہے کہ آپ نے اسے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور اس کی جگہ یہاں تم نے سنبھال لی ہے! میں نے اس پر طنز کیا۔

یہ محض غلط فہمی ہے آپ کی!.....! میرا مشن محض آپ کی حد تک محدود تھا۔ میں نے آپ کے ملک میں آنے کے بعد اب تک کوئی غیر قانونی یا ایسا کام نہیں کیا جو آپ کے ملک کے مفادات یا اس کی اہمیت کے خلاف ہو۔ میرے ہاتھ صاف ہیں اور آپ کو شش کے باوجود میرے خلاف کوئی ایسا ثبوت مائل نہیں کر سکیں گی۔

مجھے تمہاری بات پر یقین ہے موشوروف! تم یقیناً امریکیوں سے زیادہ ذہین اور چالاک ہو۔ تم اپنے پیچھے کوئی ایسا سراغ نہیں چھوڑو گے کہ قانونی گرفت میں آسکو۔ بہر حال مجھے تم سے اور تمہاری لڑائی مجبوریہ جین سے ہمدردی ہے۔ میں تمہارے لئے دعا ہی کر سکتی ہوں کہ تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی محبوبہ واپس مل جائے لیکن تم اسے اپنے ساتھ تقریب میں کیوں نہیں لے گئے؟ میں نے اس سے دانستہ یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ جواب اس کے ذہن میں اس وقت وہ بات اور وجہ آجائے جس کی مجھے جستجو تھی لیکن مجھے اپنے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ موشوروف یقیناً میرا مقصد سمجھ گیا تھا اسی لئے اس نے فوری طور پر مجھ سے اہل رابطہ منقطع کر لیا تھا۔ خود اسی نے میرے ذہن کی خوابیدہ صلاحیتوں کو متحرک کیا تھا جو اس کے حق میں ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ جین کو اپنے ساتھ نہ لے جانے میں کوئی نہ کوئی اسرار ضرور تھا ورنہ موشوروف اسی طرح پر ذہنی رابطہ منقطع نہ کر لیتا۔ قاہرہ میں ڈاکٹر چرڈ کے دوسرے تجربے کے بعد میرے ذہن کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی کہ میں خود کسی کا ذہن پڑھ سکوں۔ اگر یہ صلاحیت اس وقت بھی برقرار ہوتی تو یہ معاملہ کرنا میرے لئے کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ جین کا ذہن پڑھ کر مجھے سب کچھ معلوم ہو جاتا مگر اب اس سے کچھ معلوم کرنے کیلئے مجھے خاصی محنت کرنا پڑتی۔

موشوروف ایک اچھا ٹیلی پیٹھ تھا اور یہ بات بھی میرے مد نظر تھی کہ وہ اپنی محبوبہ کا ذہن پڑھ کر اہی بہت سی باتیں معلوم کر سکتا ہے۔ جین کے باب میں اسی لئے میں انتہائی محتاط رویہ رکھنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جین سے میں جو باتیں بھی کرتی موشوروف کو معلوم ہو سکتی تھیں۔ جین کو یا آپریشن سیل کی اس عمارت میں موشوروف کی آنکھوں اور کانوں کا فرض انجام دے سکتی تھی۔ میں نے اسی لئے کمانڈر نواز کو بھی فوری طور پر اس بات سے آگاہ کر دیا کہ جین کو صرف اسی ایک کمرے تک محدود رکھا جائے اور پھر اس کی وجہ بھی ناپا۔

”مجھے خود بھی اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ تھا میڈم!“ کمانڈر نواز نے کہا۔ ”میں اسی سبب سیل کے لامحافظوں کو انتہائی چوکنا اور محتاط رہنے کی تاکید کر چکا ہوں۔ جین کو اب ہوش آ چکا ہے اس کمرے کی ہمت اور دیواروں میں لگے ہوئے خفیہ گینز کے ذریعے ڈیوٹی روم کے بی وی اسکرین پر اس وقت میں اسی کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ غالباً اس کمرے سے باہر نکلنے کے امکانات کا جائزہ لے رہی ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ ساؤنڈ سوئچ میں

قاہرہ میں اس کے ساتھ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ موشوروف نے اس کے بعد پھر مجھ سے ذہنی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ وہ یقیناً سمجھ چکا تھا اور خود بھی اس نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ میرا ذہن اس کے ذہن سے زیادہ غیر معمولی اور طاقتور ہے۔ اس کے باوجود اس وقت خود کو اس نے ”فریادی“ ظاہر کیا ہے یہ سوچ کر میں سا ذہنی رابطہ منقطع نہیں کیا اور اسے وہ سب کچھ کہنے دیا جو کہنا چاہتا تھا۔ عذرا خان! وہ کہہ رہا تھا ”آپ کو یاد ہوا کہ جب پہلی بار میں نے آپ سے ذہنی رابطہ پیدا کیا تھا تو خود کو فریادی ظاہر کیا تھا مگر بعد میں آپ میرا حقیقت کے واقف ہو گئی تھیں۔ میں اس وقت فریادی بن کر آپ سے ملنے کا آرزو مند تھا اور اسی لئے میں نے وہ سوانگ بچھا رکھا لیکن اب..... اب واقعی آپ نے مجھے فریادی بنا دیا ہے۔ میں آپ کے سامنے جین کا خاطر فریاد نکالوں۔ یقین کریں کہ میں جین کے بغیر ادھر رہ گیا ہوں۔“

موشوروف میرے ذہن نے اسے مخاطب کیا ”میرا خیال ہے کہ تم ٹین ایجرز میں سے نہیں ہو اور عمر کی اس منزل سے بہت آگے نکل چکے ہو جہاں ایسی جذباتی اور غیر منطقی باتیں کسی شخص کو زیب دیتی ہیں۔ اس سے قطع نظر تم نے یہ کس طرح فرض کر لیا کہ تمہاری محبوبہ دل نواز میرے پاس ہے۔ تم آخر اس طرح کیا ظاہر کرنا چاہتے ہو.....؟ کیا یہ کہ جین آندرے نہیں کہیں چھوڑ کر چلی گئی ہے؟ یا پھر تم اس طرہ ایک بار پھر میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہے ہو.....؟ تم تو شاید اس میں کامیاب نہ ہو سکو لیکن میں اس وقت تمہارا ذہن پڑھنے کی اہل ہوں۔ میں یہ بھی بتا سکتی ہوں کہ اس وقت تم نے کہاں پناہ لے رکھی ہے.....! اگر کہو تو بتا دوں؟“

اسے شاید میری بات پر یقین نہیں آیا حالانکہ میں نے اس سے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اسی لئے بولا ”اچھا تو پھر بتائیے کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟“

تم شیخ مجید کے پاس ہاتھ آئی لینڈ کی ایک کوشی میں ہو اور یہ کوشی شیخ مجید کے بہنوئی کی ہے۔ اب تمہیں میری بات پر یقین آیا؟

حیرت انگیز.....! انتہائی تعجب خیز! موشوروف کے لہجے میں واقعی حیرت تھی مگر..... مگر آپ مجھ سے سچ کیوں نہیں بول رہیں.....؟

کس سلسلے میں؟ میں دانستہ انجان بن گئی۔

اسی سلسلے میں کہ جین کو آپ ہی نے اغوا کیا ہے وہ بولا۔ آپ کے سوا کسی میں اتنی جرات و ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر سکے!

اور موشوروف تمہارے سوا بھی تو آج تک کسی نے اتنی ہمت نہیں کی کہ انتہائی دلیری کا ثبوت دیتے ہوئے میری کوشی میں کھس آیا ہو اور پھر مجھ سے سچ کر نکل گیا ہو.....! تم یہ کیوں بھول گئے؟

میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ میری غلطی تھی۔ میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی تھی لیکن اس غلطی کی آپ اتنی بڑی سزا کیوں دے رہی ہیں مجھے؟

میں نے تو تمہیں کوئی سزا نہیں دی۔ تمہیں آخر یقین کیوں نہیں آتا کہ اگر جین کو اغوا کر لیا گیا ہے تو اس میں میرا ہاتھ نہیں۔ تمہارے حریف، یعنی امریکی ایجنٹ بھی تو یہ ”کارنامہ“ انجام دے سکتے ہیں!

اس عرصے میں کمانڈر نواز بھی ریوالونگ چیئر سے اٹھ چکا تھا اور میں اس پر بیٹھ کر ٹی وی سوچ کر چکی تھی۔

میں نے ٹی وی اسکرین پر چین کا حیران و پریشان چہرہ دیکھا۔ وہ اس وقت ہاتھ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسی لمحے میں نے ٹی وی سیٹ کے قریب ہی رکھے بظاہر ایک ویڈیو سیٹ کا سوچ بھی آن کر دیا جس کے ایک حصے میں چھوٹا سا مالک اور اسپیکر بھی موجود تھا۔ ٹی وی اسکرین پر نظر جمائے ہوئے معا میں نے چین کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو چین!“ کہاں جا رہی ہو تم؟ وہ ہاتھ روم کا دروازہ ہے اور وہاں بھی تم کوئی راہ فرار تلاش نہیں کر پاؤ گی!“

مجھے معلوم تھا کہ اس کمرے میں چھپے ہوئے خفیہ اسپیکر کے ذریعے میری آواز چین تک پہنچ رہی ہوگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا کہ چین میری آواز سن کر ایک دم ٹھنک گئی اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

”تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو کہو میں تمہاری آواز سن سکتی ہوں۔۔۔۔۔ میرا مشورہ ہے کہ تم آرام سے کرسی پر بیٹھ جاؤ“ کمرے میں کئی کرسیاں موجود ہیں اور آرام دہ بستر بھی تمہارا منتظر ہے۔ پھر تم کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہو! یہ خیال اپنے ذہن سے بالکل نکال دو کہ تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے موشوروف سے بھی میری بات ہو چکی ہے۔ وہ تمہاری طرف سے بہت فکر مند تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ تم خیریت سے ہو اور میری مہمان ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اگر تمہیں نیند نہ آ رہی ہو تو میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ میں نے اسی لئے تمہارے کمرے میں شطرنج کی بسات اور مہرے بھی بچھوادیے ہیں۔ کیا خیال ہے کہ ایک آدھ بازی ہو جائے؟“

”عذر خان! مجھے اعتراف ہے کہ آپ موشوروف سے بھی زیادہ حیرت انگیز شخصیت کی مالک ہیں۔“ جین پہلی بار بولی اور پھر میرے مشورے کے مطابق اس میز کے قریب بیٹھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی جس کی دوسری سمت بھی ایک کرسی رکھی تھی اور میز پر شطرنج کی بسات نظر آ رہی تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے مزید کہا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان ایسے ملک میں بھی اتنا ماڈرن ایکویسٹ موجود ہوگا! اس کمرے میں یقیناً حساس مافکس، سپیکر اور ٹی وی کیمرالینسز موجود ہیں جن کے ذریعے آپ مجھے اس وقت کسی ٹی وی اسکرین پر دیکھ بھی رہی ہوں گی اور میری آواز بھی سن رہی ہوں گی۔ یہ سب کچھ ہر چند کہ میرے لئے نیا نہیں لیکن آپ کے ملک میں بھی یہ جدید تر اشیاء اتنی عام ہوں گی میرے لئے واقعی حیرت انگیز بات ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ میری اطلاعات کے مطابق آپ کا تعلق یہاں کی حکومت کے کسی سرکاری ادارے سے نہیں ہے۔ بہر حال آپ آجائے میں واقعی اکیلی بور ہو رہی ہوں۔ ہاں وہ موشوروف بھی کیا اسی عمارت کے کسی کمرے میں ہے۔۔۔۔۔؟ ویسے مجھے یہ امید تو نہیں کہ وہ بھی آپ کا مہمان بن چکا ہوگا!“

”میں آ رہی ہوں تمہارے پاس۔۔۔۔۔! اسی وقت شطرنج کھیلے ہوئے تم سے باتیں ہوتی رہیں گی۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں یہ بتاؤ کہ اس وقت تم چائے پینا پسند کرو گی یا کافی؟“

”آپ نے اتنی اپنائیت اور محبت سے پوچھا ہے کہ میں انکار نہیں کر سکتی۔ کافی چل جائے گی

نے آف کر رکھا ہے کیونکہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔ اس کی بے ہوشی ہی کے دوران میں شطرنج کی بسات اٹھ مہرے کمرے میں پہنچا دیئے گئے ہیں۔۔۔۔۔ ہاں وہ لوگ واپس آ چکے ہیں جو موشوروف کی کوٹھی کی تلاشی لے رہے تھے۔ وہاں سے ملنے والے کاغذات اور وہ سامان انہوں نے مجھے پہنچا دیا ہے۔ کہا کاغذات اور سامان میں آپ کے پاس بھیج۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔! میں خود تمہارے پاس آ رہی ہوں اور سنو! تمہارے لئے ایک نئی اطلاع موشوروف ابھی کچھ دیر پہلے تک ہاتھ آئی لینڈ کی اسی کوٹھی میں تھا جہاں شیخ مجید ٹھہرا ہوا ہے لیکن اب وہاں سے کہیں اور چلا گیا ہوگا۔ وہ اتنا بے وقوف بہر حال نہیں ہو سکتا کہ میرے علم میں یہ بات آ جانا کے بعد بھی وہیں رکا رہے!“

”میڈم! گستاخی معاف کیجئے گا“ آپ خبر رساں ایجنسی بھی حیرت انگیز ہے!“ کمانڈر نواز کے لہجے میں شگفتگی تھی۔ ”اگر آپریشن سیل کو اس خبر رساں ایجنسی کا تعاون حاصل نہ ہو تو عضو معطل ہو کر۔۔۔۔۔“

کمانڈر نواز کی بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر میں نے ہنستے ہوئے ہی انٹرکام کا ریسور رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈیوٹی روم میں پہنچ کر میں نے کمانڈر نواز سے وہ تمام کاغذات لے لئے جو موشوروف کی کوٹھی کی تلاشی کے دوران میں ملے تھے۔ ان میں دو انٹرنیشنل پاسپورٹ بھی تھے۔ ایک چین کا پاسپورٹ اور دوسرا موشوروف کا! وہ دونوں قانونی طور پر پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں پاسپورٹوں پر قاہرہ میں موجود پاکستانی سفارت خانے کا ویزا لگا ہوا تھا۔ دونوں ٹورسٹ پاسپورٹ تھے۔ ان کاغذات کی رو سے موشوروف اور چین کی حیثیت ایسے اسکالرز کی تھی جو مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں پر ریسرچ کر رہے تھے وہ دونوں پاسپورٹ روسی حکومت نے جاری کئے تھے۔ انہی کاغذات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چین کو دو ملکر شہریت حاصل تھی جن میں سے ایک فرانس تھا اور دوسرا روس۔ وہ دونوں ممالک میں سے کہیں بھی مستقل سکونت اختیار کر سکتی تھی۔ ان تمام کاغذات میں کوئی ایسا مسودہ یا کاغذ نہیں تھا جو موشوروف یا چین کو غیر ملکی ایجنٹ ثابت کر سکتا۔ قانونی طور پر ان دونوں سے کسی بھی قسم کی باز پرس نہیں کی جاسکتی تھی۔ کراچی آ۔۔۔۔۔ انہیں صرف دو دن ہوئے تھے۔ یہاں آ کر انہوں نے پولیس ہیڈ آفس اور متعلقہ تھانے میں باقاعدہ اندراجات کرائے تھے۔

”نہی از ہے ایکسٹرا آرڈری۔ انٹیلی جنٹ پرسن!“ میں نے وہ کاغذات دیکھنے کے بعد موشوروف کی غیر معمولی ذہانت کی تعریف میں کسی جمل سے کام نہیں لیا۔ میرا مخاطب کمانڈر نواز تھا جن نے ڈیوٹی روم میں میرے آتے ہی اپنی ریوالونگ چیئر کا رخ میری طرف کر لیا تھا اور اسی کے ساتھ ٹی وی کا سوچ آف کر دیا تھا جس کے اسکرین پر اس کمرے کا منظر نظر آ رہا تھا جہاں چین کو رکھا گیا تھا۔ مجھے کے توقف سے میں نے کمانڈر نواز کو پھر مخاطب کیا۔ کمانڈر! تم خود بھی ان کاغذات کو دیکھو ممکن۔ میری نظر سے کوئی چیز مس ہو گئی ہو! اس دوران میں تمہاری جگہ میں بیٹھ جاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے کرسی سے اٹھی اور آگے بڑھ کر وہ کاغذات کمانڈر نواز کے حوالے کر دیئے۔

ہین کا سوٹ کیس فرش پر رکھا اور کمرے کا قفل کھول دیا۔ قفل کھول کر چابی میں نے قفل ہی میں لگی رہنے دی پھر دروازے کے دونوں پٹ بھی کھول دیے۔ دروازہ کھلتے ہی عین نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ سوٹ کیس پر جمی ہوئی تھی۔ غالباً وہ اپنا سوٹ کیس پہچان گئی تھی۔

”جین!“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”میں نے تمہارے کپڑے وغیرہ ادا کر لئے، مگر استعمال کی ضروری اشیاء بھی منگوا لی ہیں تاکہ تمہیں یہاں کوئی پریشانی نہ ہو۔ تم اپنا ضروری سامان لے لو..... ادھر لکڑی کی الماری میں رکھ لینا۔ وہ الماری خالی ہے..... یہ سوٹ کیس فی الحال الماری کے پچلے خانے میں رکھ دو جب میں چلی جاؤں تو اپنا سامان سیٹ کر لینا۔“

وہ کچھ حیرت زدہ سی اپنی کرسی سے اٹھی اور آگے بڑھ کر سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولی۔ ”شکریہ مس خان!“

پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دائیں جانب رکھی ہوئی لکڑی کی الماری کے نچلے خانے میں اپنا سوٹ کیس رکھ دیا اور الماری بند کر کے دوبارہ کرسی پر آ بیٹھی۔

”آپ نے دروازہ بند نہیں کیا مس خان!“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں اس کے مقابل والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”یوں بھی ابھی ایک ملازم کو ہمارے لئے چائے اور بلیک کافی لے کر آتا ہے۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”یہ جگہ آپ کی کوشی کا کوئی حصہ تو نہیں گنتی۔ شاید کوئی اور عمارت ہے۔“ اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

جواب دیا۔ ”آج شام کو تم نے اور موشوروف نے جلد بازی میں شاید اس حصے پر توجہ نہیں دی۔ تم دونوں نے مجھے تلاش کیا تھا نا؟“

”جی ہاں!“ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ ”معلوم نہیں آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں!“

”میں اپنی کوشش کے اسی حصے میں آ گئی تھی جہاں تک تم لوگوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ دراصل

اسٹڈی کے پیچھے جو کئی کمرے تم نے ایک قطار میں دیکھے ہوں گے اور جو تم لوگوں کو باہر سے مقفل ملے ہوں گے یہ وہی کمرے ہیں۔ اسٹڈی ہی کے ایک خفیہ دروازے سے میں اس حصے میں آ گئی تھی اور تم

لوگ مجھے ساری کوشش میں ڈھونڈتے پھرے ہوئے! کیونکہ یہ حصہ تقریباً ایڑا ٹاٹ ہے۔ اس لئے گیس کا اثر یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ اسے تم میری خفیہ پناہ گاہ بھی کہہ سکتی ہو اور خاص مہمان خانہ بھی! جہاں عموماً

میں تم ایسے ہی مہمانوں کو رکھتی ہوں۔“ میں بڑی روانی سے بولے جا رہی تھی تاکہ جین میرے ٹریپ میں آ جائے۔ اس کے ذہن کو غلط خطوط پر لگانے سے میرا دھرم مقصد تھا۔ اول تو یہ کہ اس کے ذہن میں یہ بات

نہ اس کے کہ اسے آپریشن میل ہیڈ کوارٹر میں رکھا گیا ہے۔ دوم یہ کہ اگر موشوف اس کا ذہن پڑھے تو مٹی اور طرف سونے کی بجائے اس کی توجہ کامزمرہ کی لکھی ہو۔ ذرا توقف کے بعد میں نے میز پر رکھے

ہوئے سنگ مرمر کے مہرے پیچھے ہوئی بساط پر رکھنا شروع کر دیئے اور بولی ”جب تک چائے اور بلیک کافی آئے آؤ ہم بازی تو شروع کر دیں!“

مگر.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کا چہرہ اب قطعی پرسکون نظر آ رہا تھا۔

”مگر کیا.....؟ بولو نا! تکلف کی کوئی ضرورت نہیں.....! کیا بھوک بھی لگ رہی ہے؟“

”نہیں، بھوک نہیں لگ رہی کھانا کھا لیا تھا میں نے.....! اگر ممکن ہو تو بلیک کافی“

”کیوں ممکن نہیں.....! مل جائے گی مگر میں صرف چائے پیوں گی۔“
 ”بہت بہت شکریہ مس خان.....! میں انتظار کر رہی ہوں آپ کا!“

اسی کے ساتھ میں نے ساؤنڈ اور اسکرین دونوں کے سوچ آف کر دیے اور کمائڈر نواز کی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی جو اس دوران میں میرے قریب ہی آ کھڑا ہوا تھا۔

”شی از ویری چارمنگ ایند گریس فل لیدی۔“ کمانڈر نواز نے جین کے غیر معمولی پرکشش حسن کی تعریف کی۔ ایسے مواقع پر جب وہ کسی عورت کی تعریف کرتا تھا تو انگریزی ہی بولنے لگتا تھا۔

جین واقعی انتہائی خوبصورت لڑکی تھی اور کمانڈر نواز بہر حال بے بس نہیں تھا۔ اپنے لوگوں آزادانہ اظہار خیال کی اجازت میں نے ہی دی تھی۔ اس طرح لوگ باطل رہتے ہیں جس اور گھٹن کی فضا

نہیں رہتی۔ عموماً جب میں خود بھی یہ محسوس کر لیتی تھی کہ کسی سبب میل کا کوئی رکن اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بخل سے کام لے رہا ہے تو میں اسے دانستہ بولنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے باوجود کوئی بھی

حداد سے تجاوز کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ آپریشن میل ہیڈ کوارٹر میں اسی لئے بہترین نظم و ضبط کے باوجود ایک سرح کا فیملی، ہنسنا سفیر تھا۔ وہ لوگ ایک حد تک مجھ سے بے تکلف بھی تھے اور میرا ادب بھی کرتے

تھے۔ جین کی بابت کماٹرو نواز کے تمہرے پر میں اسی لئے مسکرا دی اور جواباً بولی۔ ”آفسر آل مین ازاے ویری ہیوئی فل گرل، ہٹ آل سواے ویری ڈیجرس! ڈونٹ فورگیٹ اٹ!“ میں نے بھی جواب میں انگریزی

ی بولی اور اسے یاد دلایا کہ جین خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک بھی ہے۔
کمانڈر نواز میری بات سے اتفاق کرتا ہوا میرے اشارے پر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے

مجھے جین کے کمرے کی چابی دے دی۔
جین کا سوٹ کسی بھی وہیں ڈیوٹی روم میں تھا۔ میں نے وہ بھی اٹھالیا اور کپاٹن رنواز سے کہا۔

”کمرے کا دروازہ میں کھلا ہی رکھوں گی تم میرے لئے جائے اور چین کے لئے بلیک کافی بھجوا دینا..... اور ہاں تم نے کاغذات دیکھے!..... کوئی خاص بات نوٹ کی؟“

”صرف یہ میڈم کہ ہم قانونی طور پر موشورف یا جین پر کوئی چارج نہیں لگا سکتے۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہی نتیجہ میں نے بھی اخذ کیا تھا۔ بہر حال جو بھی ہو..... ذہن سے ذہن آدمی بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی کر ہی جاتا ہے۔ میں اسی کی تلاش میں ہوں۔ ہاں اس ڈاکٹر کا کہ نمبر تو ہیں تا تمہارے

پاس.....! میرا اندازہ ہے کہ وہ شیخ مجید کی ملکیت ہوگی۔ اس کے باوجود تمہیں کار کے مالک کا سراغ لگانا ہے۔“ کہہ کھتی ہوئی میں ڈوٹوٹی روم سے نکل آئی۔ کانگنات میں نے کمائڈر نواز ہی کے پاس چھوڑ دیئے تھے۔

عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ کر میں نے مسلح محافظوں کو پوری طرح مستعد و چوکنا محسوس کیا۔ اس کمرے پر محافظوں کی کڑی نظر تھی جس میں جین کو رکھا گیا تھا۔ اس کمرے کے سامنے پہنچ کر میں نے

جین بھی بساط پر مہرے سجانے میں میری مدد کرنے لگی اور اسی کے ساتھ کہنے لگی۔ ”آپ کے انداز و اطوار سے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ طویل عرصے کے لئے مجھے یہاں قیدی بنا کر رکھنا چاہتی ہیں!“ اس کے لہجے میں ناگواری کی بجائے شگفتگی تھی۔

”فی الحال اس سلسلے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتی!“ میں بولی ”ویسے تمہارا یہ خیال غلط ہے جین کہ میری کوٹھی میں تمہاری حیثیت کسی قیدی کی ہے۔ تم میری مہمان ہو! میں موشرودف کے اس خیال کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے آداب میزبانی نہیں آتے یا میزبانی مجھے مہنگی پڑے گی۔ میں تمہیں کسی قسم کے دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ موشرودف ابھی میرا مہمان نہیں بن سکتا ہے لیکن مجھے توقع ہے کہ جلد ہی وہ بھی میری میزبانی قبول کر لے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے بساط پر اپنے پورے مہرے لگا دیئے۔ اسی دوران میں جین بھی اپنے مہرے لگا چکی تھی۔

”مس خان! پہلی موڈ (چال) میری ہوگی۔“ جین نے مسکرا کر کہا۔

”ٹھیک ہے پہلی چال تمہاری ہی سہی!“ میں مسکرا کر بولی۔

”مجھے اس گاؤں سے کچھ ابھرنی ہو رہی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں ہاتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کر لوں۔ پھر گاؤں پہن لوں گی۔ بیٹھے ہوئے ریشمی گاؤں بار بار میری ناگوںوں پر سے پھسل رہا ہے اور مجھے ٹیکڈنٹس کا سا احساس ہو رہا ہے۔ کھیلتے ہوئے میری انٹینشن بار بار ادھر ڈائیورٹ ہوگی اور آپ اس سے فائدہ اٹھا کر مجھے مات دے دیں گی جو میں نہیں چاہتی۔“ یہ کہتے ہوئے جین کے چہرے پر ایک سرخی سی دوڑ گئی اور وہ مزید حسین نظر آنے لگی۔

”تم اس وقت مجھے کسی مغربی لڑکی کی بجائے بالکل مشرقی لڑکی معلوم ہو رہی ہو.....! جاؤ تبدیل کر لو لباس!“

”تھینک یو مس خان!“ اس نے نرمی سے کہا اور اپنا ریشمی گاؤں سنبھالتی ہوئی اٹھ کر الماری کی طرف چلی گئی جو میرے عقب میں تھی۔

میں سوچنے لگی کہ بظاہر اتنی نرم و نازک اور بے ضرری لڑکی کو دیکھ کر کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ حقیقتاً یہ کتنی خطرناک ہوگی! پھر کچھ ہی دیر بعد عملی طور پر اس نے یہ ثبوت فراہم کر دیا کہ واقعی وہ میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک اور خطرناک تھی۔

سب کچھ کس چند ہی لمحوں میں ہو گیا تھا۔ مجھے اس وقت خطرے کا احساس ہوا تھا جب جین ”چال“ چل چکی تھی۔ میں نے کمرے کی ٹیوب لائٹ کو ایک زوردار چھٹاکے کے ساتھ ٹوٹ کر نیچے بکھرتے دیکھا تھا۔ کمر اتار کی میں ڈوب گیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے شدید قسم کی ناگوار بو محسوس ہوئی تھی اور میں نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ عین اسی لمحے عقب سے جین نے میری گردن کو اپنی کلائی کی گرفت میں لے کر دبانا شروع کر دیا تھا اور مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اچانک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا تھا؟ اپنے حواس کھوئے ہوئے میں صرف یہی سوچ سکی کہ جین شاید مجھے یرغمال بنا کر یہاں سے فرار ہو جانا چاہتی ہے اور غالباً وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائے گی۔

اچانک اور غیر متوقع طور پر پیش آنے والا واقعہ کسی ذہن سے ذہن شخص کو بھی بدحواس کر دیتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی اس وقت اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ سکی تھی۔ جب چند ہی لمحات میں جین مجھ پر حاوی آ گئی تھی۔ اس نے انتہائی تیزی اور مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اسی کے نتیجے میں چاہے وقتی طور پر سہی میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ حواس کھوتے ہوئے اسی سبب میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ جین شاید مجھے یرغمال بنا کر فرار ہونا چاہتی ہے حالانکہ آپریشن سیل سے کسی کا فرار تقریباً ناممکن بات تھی۔

بدحواسی اور مایوسی کے وہ چند لمحے گزرتے ہی میرے سارے جسم میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ میرے تاریک ہوتے ذہن میں روشنی سی ہو گئی۔ اسی کے ساتھ میں اپنی گردن جین کی گرفت میں ہونے کے باوجود ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جین کسی آنکھوں کی طرح مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ یقیناً کسی بھی قیمت پر میری گردن پر اپنی کلائی کا دباؤ برقرار رکھنا چاہتی تھی۔ جین اب تقریباً میری پشت پر سوار تھی۔ اندازے سے میں کرسی اور میز کے درمیان سے نکل آئی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے میں نے جین کے سر کے بالوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے جھک کر اسے فرش پر الٹ دیا۔ میری گردن اب اس کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی اور وہ غالباً کمرے کے فرش پر گر کر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمرائیوں کے تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اس لئے میں اندازہ ہی لگا سکتی تھی۔ ابھی تک میں نے اپنا سانس روکا ہوا تھا اور اس کا سبب وہ ناگوار بو تھی جو مجھے کچھ دیر پہلے محسوس ہوئی تھی۔ وہ بو یقیناً کسی گیس کی ہو سکتی تھی۔ ایسی ہی بو مجھے اس وقت اپنی کوٹھی میں محسوس ہوئی تھی جب موشرودف اور جین فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے اسی وجہ سے فوراً سانس روک لیا تھا لیکن یہ خطرناک گیس آپریشن سیل کے اس کمرے تک کیسے پہنچ گئی تھی؟ یہ سوال میرے لئے حیران کن ہی تھا۔

پیش آنے والے خلاف توقع واقعے کے حوالے سے میرے ذہن میں اور بھی بہت سے سوالات ابھر رہے تھے مگر جین کے فرش پر گرنے کے چند ہی لمحے بعد کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے کئی طاقت ور تارچوں کی روشنی بیک وقت کمرے میں در آئی۔ میری نگاہ دروازے کی طرف اٹھی۔ وہاں مجھے کمانڈر نواز اور کئی مسلح محافظ تارچیں لئے نظر آئے۔ میں ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر جست بھرتی ہوئی دروازے تک جا پہنچی اور پھر بلند آواز میں ان لوگوں سے پیچھے ہٹ جانے کو کہا۔

اس دوران میں کمانڈر نواز بھی یقیناً فضا میں گیس کی بو محسوس کر چکا تھا۔ اس نے فوراً میرے

حکم کی تعمیل میں اپنے ساتھیوں کو پیچھے ہٹا لیا۔
دروازے کے ذریعے چار چوں کی روشنی اب بھی کمرے کے اندر پڑ رہی تھی۔ روشنی کے دائرے جین کے جسم پر محیط تھے۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑی نظر آ رہی تھی۔ میرے قیاس کے مطابق فرش پر گرنے کے بعد وہ اپنا سانس روک رکھنے میں ناکام ہو گئی تھی اور اسی کے نتیجے میں خواب آور گیس نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

پھر میری ہدایت کے مطابق سیل کے دور کن گیس ماسک پہن کر اس کمرے میں داخل ہوئے اور کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ اس کے بعد میرے ہی حکم پر بے ہوش جین کو اسی کمرے کے برابر دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ بے ہوشی کے باوجود وہ محافظوں کی کڑی نگرانی میں تھی۔ اسی حالت میں اس کے جسم کو ریشمی ڈور یوں سے باندھ کر مسمیٰ پر ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اب وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں رہی تھی۔ اس کا اٹیچی کیس جو کھلا پڑا تھا وہ بھی دوسرے کمرے میں لے آیا گیا تھا۔ سیل کا ایک ڈاکٹر مہلک گیس کے اثرات ختم کرنے اور جین کو ہوش میں لانے کے لئے اسے انجکشن لگا چکا تھا۔

کمانڈر نواز سمیت سیل کے جوار کان اس وقت میرے ارد گرد موجود تھے سبھی کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ میں نے مختصر اُنہیں پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا، پھر بولی۔ ”کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی سرطلے پر ہم سے کوئی حماقت سرزد ضرور ہوئی ہے اور یقیناً وہ حماقت یہ ہے کہ اس اٹیچی کیس کو چپک نہیں کیا گیا!“ میرا مخاطب کمانڈر نواز تھا اور میں اس اٹیچی کیسی کی طرف اشارہ کر رہی تھی جو میری کرسی سے کچھ ہی فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔

”ایسا نہیں میڈم!“ کمانڈر نواز جواباً بولا۔ ”میں نے خود اس اٹیچی کیس کو چپک کیا تھا۔ اس میں کپڑوں اور میک اپ کے کچھ سامان وغیرہ کے سوا.....“

”ون اے منٹ بکمانڈر!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم نے اٹیچی کیس چپک کیا ہو گا مگر شاید سرسری طور پر.....! اگر ایسا نہیں تو پھر اس مہلک گیس کو تم کس خانے میں فٹ کرو گے.....؟ وہ کہاں سے آگئی.....؟ جین مجھ سے کپڑے تبدیل کرنے کی اجازت لے کر میرے عقب میں موجود کھڑکی کی الماری تک گئی تھی جس کے نچلے خانے میں اس نے میرے ہی حکم پر اپنا اٹیچی کیس رکھ دیا تھا جو واقعہ پیش آیا اسی اٹیچی کیس کے کھلنے کے بعد پیش آیا۔ جین نے ٹیوب لائٹ کو فیس پاؤڈر کے ڈبے سے نشانہ بنایا۔ یہ بات تو سمجھ میں آگئی کیوں کہ اس کمرے کے فرش پر ٹیوب لائٹ کی کرچیوں کے پاس پاؤڈر کا ڈبا بھی میں نے پڑا دیکھا تھا لیکن خواب آور گیس کہاں سے آئی.....؟ میرا خیال ہے کمانڈر تم ایک بار پھر اس اٹیچی کیس میں موجود تمام سامان چیک کرو.....! ممکن ہے ہمیں اپنے سوال کا جواب مل جائے۔“

”بہتر ہے۔“ یہ کہہ کر کمانڈر نواز اٹیچی کیس کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے اٹیچی کیس اٹھا کر میز پر رکھ لیا اور اسے کھول کر احتیاط سے ایک ایک چیز دیکھنے لگا۔

کپڑے اس نے نہ کھول کھول کر دیکھے اور انہیں ایک طرف ڈھیر کرتا گیا۔ دیگر ضروری اشیاء اور میک اپ کا سامان اس نے ایک طرف سرکا دیا اور اب وہ اٹیچی کیس میں کوئی خفیہ خانہ یا نہ تلاش کر رہا

تھا۔ میں بھی اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی اور پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال برقی رو کی طرح دوڑ گیا۔ دور سے ہی لمحے میں نے ہیرا سپرے کا گول بڑا ڈبا میک اپ کے دیگر سامان سے اٹھا لیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ ٹیوب لائٹ کے ٹوٹنے کا چھنا کا ہونے کے بعد ایک خفیف سی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اسپرے کی سی آواز! مگر اس پر میں توجہ نہیں دے سکی تھی کیونکہ جین نے مجھے اتنی مہلت نہیں دی تھی۔

ہیرا سپرے کی مخصوص خوشبو ہوتی ہے۔ میں نے اسے سونگھ کر دیکھا۔ اس کی تاب میرے ناک کے قریب تھی۔ خوشبو کی بجائے مجھے ناگوار بو محسوس ہوئی۔ وہ خواب آور مہلک گیس یقیناً اسی ہیرا سپرے کے ڈبے میں تھی۔ نادانستگی میں سیل کے ارکان اسے بھی میک اپ کے سامان کے ساتھ اٹیچی کیس میں رکھ کر لے آئے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اس ہیرا سپرے کے ڈبے میں گیس ہوگی۔

”رک جاؤ کمانڈر! اب مزید تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں۔“ میں بول اٹھی۔ پھر میں نے ہیرا سپرے کے کمانڈر نواز کی طرف بڑھا دیا۔ ”اسے سونگھ کر دیکھو تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے!“

کمانڈر نواز نے مجھ سے ہیرا سپرے لے لیا اور پھر اس نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں پہلے ہی اخذ کر چکی تھی۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”سوری میڈم!“
”کوئی بات نہیں کمانڈر کبھی بھی غلطی بھی ہو جاتی ہے اور یہ غلطی ایسی ہے جسے حالات کے پیش نظر معاف کیا جاسکتا ہے۔ سہواً اور نادانستگی میں تم سے اور تمہارے آدمیوں سے ایسا ہو گیا۔ اس میں تم لوگوں کی غفلت یا کوتاہی کو کوئی دخل نہیں۔ یہ ہیرا سپرے دانستہ دیگر سامان کے ساتھ نہیں لایا گیا اور نہ دانستہ تم نے اسے نظر انداز کیا۔“

اس کے بعد خود میں نے میک اپ کا دوسرا سامان اور دیگر ضروری اشیاء کا تفصیلی جائزہ لیا مگر کچھ اور نہیں ملا۔ اسی دوران میں کمانڈر نواز نے مجھے بتایا کہ ڈیوٹی روم میں وہ وی اسکرین پر اس کمرے کا منظر دیکھ رہا تھا کہ اچانک جین نے فیس پاؤڈر کا ڈبا ٹیوب لائٹ پر پہنچ مارا اور اسکرین تاریک ہو گیا۔ اس کے بعد ہی وہ فوراً حرکت میں آ گیا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یقیناً اب جین کوئی خطرناک حرکت کرنے والی ہے لیکن جب تک کمانڈر نواز اس کمرے تک پہنچا میں حالات پر قابو پا چکی تھی۔

ڈاکٹر رشید کا نائب ڈاکٹر قریشی بھی ابھی تک وہیں موجود تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”تمہارے خیال میں جین کو کب تک ہوش آ جائے گا۔“

”ابھی دس پندرہ منٹ اور لگیں گے۔“ ڈاکٹر قریشی نے جواب دیا۔
”ہوں!“ میں کچھ سوچتے ہوئے مزید بولی۔ ”ہوش میں آنے کے بعد گیس کے مہلک اثرات

کا اس کے جسم پر کیا رد عمل ہو سکتا ہے؟“
”وہی جو سیل کے ان ارکان پر ہو چکا ہے جو زیر علاج ہیں اور اس گیس کے زیر اثر آ چکے ہیں۔“ ڈاکٹر قریشی نے جواباً کہا۔ پھر تفصیل بیان کرنے لگا۔ ”اب تک اس گیس کے متعلق یہ بات تجربے میں آئی ہے کہ یہ سانس کے ذریعے پچھروں میں داخل ہو کر آدی کے خون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا

شرمندہ ہوں مس خان!“

”جین! اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری جگہ میں بھی ہوتی تو موقع ملنے پر جیو جیو ضرور کرتی۔ کیا میں نے قاہرہ میں ایسا نہیں کیا تھا؟ بس فرق یہ ہے کہ بالآخر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی تھی اور تم ناکام رہیں۔ خیر چھوڑو اس ذکر کو۔۔۔۔۔۔ تمہارے لئے میں نے بلیک کافی منگوا لی ہے پیو گی؟“

وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ اسے شاید مجھ سے گزرے ہوئے تلخ دانتے کے بعد یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں اس کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آؤں گی۔

”حیرت سے کیا دیکھ رہی ہو مجھے۔۔۔۔۔۔! بولو پیو گی کافی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پھر سوال کیا۔

جی۔۔۔۔۔۔ جی ہاں مگر میرے جسم میں اتنی طاقت نہیں کہ خود اٹھ کر بیٹھ سکوں۔“
”تو کیا ہوا۔۔۔۔۔۔! میں تمہیں سہارا دے کر بٹھا دوں گی اور پھر خود ہی کافی بھی پلا دوں گی۔“
”آپ انتہائی مہربان خاتون ہیں عذرا خان!“ اس کے لہجے میں اظہار تشکر تھا۔
میں نے کچھ کہے بغیر اس کے لئے کپ میں کافی بنائی اور پھر میز کو مسہری کے قریب کھسکا کر مسہری پر بیٹھ گئی۔ سہارا دے کر میں نے جین کو اٹھایا اور کافی پلانے لگی۔
کافی پلا کر میں نے اسے پھر بستر پر لٹا دیا۔

”مس خان! میں آپ کو ایک ٹیبلٹ کا نام بتا رہی ہوں۔ یہ ٹیبلٹ کسی بھی میڈیکل اسٹور سے مل جائے گی۔ عموماً اسے جسمانی درد اور تھکن دور کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے مگر یہی ٹیبلٹ خواب آور گیس کے اثرات ختم کرنے کیلئے تیر بہدف ہے۔ آپ مجھے یہ ٹیبلٹ منگوا دیں ورنہ میں دو تین روز تک آپ کے لئے اسی طرح مسئلہ بنی رہوں گی اور میرا جسم شل رہے گا۔“
”ضرور۔۔۔۔۔۔! بتاؤ تم! میں ابھی اپنے کسی ملازم کو بھیج کر یہ ٹیبلٹ کسی میڈیکل اسٹور سے منگوا لیتی ہوں۔ کچھ میڈیکل اسٹورز رات بھر کھلے رہتے ہیں۔“

جین نے اس ٹیبلٹ کا نام بتا دیا۔ وہ ایک عام قسم کی پین کلر ٹیبلٹ تھی۔
”میں ابھی آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر کمرے سے نکل آئی۔
کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی کیوں کہ جین بغیر کسی سہارے کے اٹھنے بیٹھنے کی اہل نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کمرے کے باہر سطح محافظ بھی موجود تھے۔

عمارت کے اس حصے سے نکل کر جلد ہی میں ڈاکٹر رشید کے کمرے تک پہنچ گئی۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ سیل کے جوار کان خواب آور گیس کا شکار ہونے کے بعد یہاں لے آئے گئے تھے اور ڈاکٹر رشید کے زیر علاج تھے وہ انہی کی نگہداشت اور اپنے ماتحتوں کو ضروری ہدایات دینے کی خاطر ابھی تک سویا نہیں تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹھے رہیں ڈاکٹر!“ میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے زیر علاج افراد کا کیا حال ہے؟“

شکار ہونے والا ہوش آ جانے کے باوجود کم از کم دو ایک روز تک کسی سہارے کے بغیر چل پھر نہیں سکے گا۔ اس کا جسم تقریباً شل رہے گا۔“

”تو پھر میرا خیال ہے کہ جین کے جسم کو ریشمی ڈوریوں کی گرفت میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کمانڈر؟“ میں کمانڈر نواز کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سچ کہہ رہی ہیں آپ میڈم۔۔۔۔۔۔! سرفراز اور سیل کے وہ ارکان جو اس گیس کا شکار ہو چکے ہیں ہوش میں ہیں مگر ابھی تک خود اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں ہو سکے ہیں۔“ کمانڈر نواز بولا۔

پھر میرے ایما پر جین کے جسم کو ریشمی ڈوریوں کی گرفت سے آزاد کر دیا گیا۔ اس کے جسم پر ابھی تک شب خرابی کا لباس ہی تھا۔ اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ لباس تبدیل کرنا محض بہانہ تھا تاکہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر راہ فرار اختیار کر سکے اور اس نے یہ کوشش بھی کی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

”کمانڈر! تم میری کوشش کی نگرانی کرنے والوں کو پوری طرح چوکنا رہنے کی ہدایت کر دو۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مشوروف ایک بار پھر آج ہی رات ادھر کا رخ کرے۔“ یہ کہتے ہوئے یہ بات میرے مد نظر تھی کہ میں نے جین کو یہی بتایا تھا وہ میری کوشش ہی کے ایک حصے میں ہے۔ اگر مشوروف نے اس سے کوئی رابطہ قائم کیا ہو گا یا کرنے والا ہو گا تو اسے یہی معلوم ہوگا۔

اس کے بعد میری ہدایت پر کمانڈر نواز اور سیل کے تمام ارکان وہاں سے چلے گئے۔ مسلح محافظوں نے کمرے کے باہر اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ اب مجھے جین کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ کمرے کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ جین کے کپڑے اور دیگر ضروری اشیاء انہی کیس میں رکھ دی گئی تھیں۔ البتہ وہ ہیرا سپرے کمانڈر نواز میرے ایما پر اپنے ساتھ لے گیا جس میں مہلک گیس بھری ہوئی تھی۔ انہی کیس کو میں نے کمرے میں موجود الماری کے اندر رکھ دیا تھا۔

پچن سے میں نے اپنے لئے چائے اور جین کیلئے بلیک کافی منگوائی تھی جواب اس کمرے میں سرد کر دی گئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے میری نگاہ جین کے معصوم سے چہرے پر ہی تھی۔ صنف مخالف کے لئے یقیناً اس میں بہت کشش تھی۔ مشوروف ایسا شخص یوں ہی اس کا دیوانہ نہیں ہو گیا تھا۔

چائے پینے کے بعد مجھے بس چند منٹ جین کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑا۔ میں مسہری کے قریب اس کے سر ہانے کرسی بچھائے بیٹھی تھی۔ ہوش آتے ہی اس نے پھٹی پھٹی سی حیرت زدہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں مجھ پر پڑیں۔

میں نے دانستہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی اور نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے جین؟“

اس کے ہونٹ تو ہلے مگر وہ فوری طور پر کچھ بولنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔
”مجھے افسوس ہے جین کہ میری مہمان بننے کے بعد تمہیں اس مشکل سے گزرنا پڑا مگر چندا اس کی ذمہ دار خود تہی ہو۔“

”معاف۔۔۔۔۔۔ کر دیں۔۔۔۔۔۔ مجھے!“ اس مرتبہ وہ بولنے میں کامیاب ہو گئی۔ ”میں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔“

جائیں گے۔ اس وقت سو جاتے ہیں۔“
 ”جیسے تمہاری مرضی!“ میں مسکرا دی پھر مطلب کی بات پر آ گئی۔ ”یہ بتاؤ جین کہ تم آج رات موشروف کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟ تم نے تنہا اس کو جی میں رہنا کیوں گوارا کیا؟“
 ”موشروف عموماً مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ عام طور پر تقریبات میں وہ مجھے ساتھ ہی لے جاتا ہے مگر معلوم نہیں آج کیوں اس نے مجھے کوٹھی ہی میں رہنے کی تاکید کر دی تھی۔“ جین نے کسی توقع کے بغیر میرے سوال کا جواب دیا تھا مگر میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کا جواب درست نہیں ہے۔ وہ یقیناً مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔
 ”شاید اس لئے جین کہ میں تمہیں اپنا مہمان بنا سکوں!“ میں نے ہنس کر کہا اور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کچھ جھجھکی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اسکے جواب سے میں مطمئن نہیں ہوئی۔
 ”مس خان! آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ مجھے کتنے دن اپنا مہمان بنا کر رکھنا چاہتی ہیں؟“ اس نے بات کا رخ بدل دیا۔
 ”آپ سوال تو کریں میں کوشش کروں گی کہ آپ کو اپنے جواب سے مطمئن کر سکوں۔“
 ”موشروف تمہارے بغیر کتنے دن رہ سکتا ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
 ”آج سے پہلے کبھی اس بات پر غور تو نہیں کیا لیکن..... ایک دفعہ..... کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ غالباً لندن کا ذکر ہے۔ موشروف کو کئی اہم کام سے تیار دو روز کے لئے لندن سے باہر جانا پڑا تھا کیونکہ میرا لندن میں ہی رہنا ضروری تھا۔ وہ دو دن وہ دورا میں کم از کم مجھ پر گراں گزری تھیں..... اور..... اور..... موشروف نے بھی بعد میں اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جہاں تک میرے احساسات و جذبات کا تعلق ہے ہم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ عرصے جدا نہیں رہ سکتے۔ ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں مس خان!“ یہ کہتے ہوئے وہ کچھ جذباتی سی ہو گئی۔ ”آپ نے اگر کسی سے محبت کی ہے تو شاید میرے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں۔“

”لیکن تم دونوں جس پیشے سے تعلق رکھتے ہو اسے دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ عجیب اور ناقابل یقین سی لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال تمہارے جواب سے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کم از کم تین چار دن وہ تمہاری جدائی برداشت کر سکتا ہے۔“
 ”چار دن بہت ہیں مس خان!“ وہ فوراً بول اٹھی۔
 ”اس کا اندازہ بھی جلد ہو جائے گا تم ابھی سے اتنی فکر مند کیوں ہو رہی ہو؟“ میں مسکرا کر بولی۔ ”میں دو دلوں کے درمیان زیادہ دیر دیوار نہیں بنوں گی۔“
 ”آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں مس خان کہ موشروف کے بغیر میں..... میں خود کو کتنا تنہا محسوس کرتی ہوں!“ اس کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔
 ”اچھا اب میں چلوں گی جین! مگر چلنے سے پہلے ایک بات ضرور پوچھوں گی کہ اب تو تم کوئی ایسی حرکت نہیں کرو گی کہ مجھے مجبوراً تمہارے ساتھ ختی کرنا پڑے؟“

”غالباً ڈاکٹر قریشی سے آپ رپورٹ لے چکی ہیں۔ فی الحال وہ لوگ خود.....“
 ”معلوم ہے مجھے!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی پھر جین نے جس گولی کا نام لیا تھا اس کے متعلق پوچھا۔ ”کیا یہ ٹیبلٹ آپ کے اسٹور میں ہے؟“
 ”جی ہاں۔“ اس نے اصرار میں سر ہلایا۔
 ”تو پھر آپ کے مریض بہت جلد خود چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ آپ انہیں یہ ٹیبلٹ دے دیں۔ اس سے گیس کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔“
 ”لیکن میڈم! یہ تو ایک عام قسم کی چین ٹیبلٹ ہے جو عموماً معمولی حرارت اور جسم میں درد کے لئے مریضوں کو دی جاتی ہے! گیس کے مہلک اثرات.....“
 ”یہ مجھے بھی معلوم ہے ڈاکٹر!“ میں نرمی سے بولی۔ ”آپ ایک ٹیبلٹ مجھے بھی دے دیں اور اپنے مریضوں کو بھی یہی استعمال کرائیں!“ پھر میں نے ڈاکٹر رشید کو بتا دیا کہ اس ٹیبلٹ کے بارے میں مجھے خود جین ہی نے بتایا ہے۔

”پھر تو یقیناً یہ سود مند ثابت ہو گی۔“ ڈاکٹر رشید بولا۔ ”آپ تشریف رکھیں میں حاضر ہوں ابھی!“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
 واپسی میں ڈاکٹر رشید کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں اس سے وہ ٹیبلٹ لے کر دوبارہ عمارت کے عقبی حصے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جین مجھے اسی طرح اور اسی حالت میں بستر پر دراز ملی جس طرح میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ میں نے اسے وہ ٹیبلٹ کھلا دی پھر پوچھا۔ ”یہ ٹیبلٹ کھانے کے کتنی دیر بعد تم ناول حالت میں لوٹ آؤ گی؟“
 ”زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے مگر کمزوری تھوڑی بہت ضرور رہے گی جو دو ایک دن میں ہی دور ہوگی۔“ اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

”صرف ایک گھنٹا.....! حیرت انگیز بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس ٹیبلٹ کے اجزاء خون میں شامل ہوتے ہی بہت جلد اپنا اثر دکھانے لگتے ہیں۔“

”جی ہاں اس خواب آور گیس کا یہی توڑ ہے جو روسی ڈاکٹروں نے دریافت کی ہے مگر آپ نے اتنی جلدی یہ ٹیبلٹ کہاں سے منگوائی؟“

”کہیں سے بھی نہیں! یہیں کوٹھی میں موجود تھی۔ تم نے اس کا نام لیا تو مجھے یاد آ گیا کہ شاید کوئی گولی کہیں پڑی ہے ڈھونڈنا تو مل گئی۔“ میں نے بات بنا دی پھر اس سے پوچھنے لگی۔ ”طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد تم سونا پسند کرو گی یا پروگرام کے مطابق شطرنج کھیلنے کا ارادہ ہے؟“

”کیوں کیا آپ کو نیند آ رہی ہے؟“ ارے ہاں میں پوچھتا تو بھول ہی گئی کہ..... کہ آپ کی گردن پر میری کلائی کی گرفت سے کہیں.....“

”نہیں بھی تم خواہ خواہ شرمندہ ہو رہی ہو!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ہاں تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا.....؟ مجھے تو ویسے نیند نہیں آ رہی ابھی!“

”تو کچھ دیر بیٹھی رہیں میرے پاس!“ وہ بھولپن سے بولی۔ ”ہاں شطرنج کی بازی صبح ہی

لے ہر جگہ مستعد و چونکا نظر آئے۔ اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے جب میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اپنے بستر پر دراز ہونے سے پہلے میں نے انٹر کام پر چین کے متعلق کمانڈر نواز کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ پھر یہ دریافت کیا کہ میری کوئی کی نگرانی اور حفاظت کرنے والوں کی جانب سے کیا کوئی نئی اطلاع موصول ہوئی؟

”جی نہیں میڈم!“ کمانڈر نواز نے جواب دیا۔ ”وہاں حالات پوری طرح پرسکون ہیں۔ ویسے آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے ان لوگوں کو چونکا رہنے کی تاکید کر دی ہے۔“

”میرے نزدیک اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ اب تک موشرورف اپنی محبوبہ چین سے ذہنی رابطہ قائم نہیں کر سکا، ممکن ہے اس دوران میں اس نے یہ کوشش کی ہو اور چین کی بے ہوشی کی وجہ سے اپنی کوشش میں ناکام رہا ہو۔ اگر چین سے اس کا ذہنی رابطہ قائم ہو جاتا تو وہ یقیناً نچلنا نہ بیٹھتا اور میری کوئی کا رخ ضرور کرتا۔“

”کیا خراب وہ یہ کوشش کرنے والا ہو۔“ کمانڈر نواز نے قیاس آرائی کی۔ ”مگر ابھی چین کے متعلق آپ نے جو ہدایات دی ہیں ان کی روشنی میں موشرورف کو ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔“

”کمانڈر! اب میں سونا چاہتی ہوں لیکن صبح تم اپنی ڈیوٹی آف ہونے سے پہلے مجھے جگا کر بات ضرور کر لینا!“

”بہتر ہے میڈم..... میں آپ کو رپورٹ دے کر ہی جاؤں گا۔“

”خدا حافظ!“ میں نے یہ کہہ کر انٹر کام کا ریسور رکھ دیا اور پھر بستر پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ ذہنی اور جسمانی طور پر میں اس وقت اتنی تھکن محسوس کر رہی تھی کہ لباس تبدیل کرنا بھی گراں محسوس ہو رہا تھا۔

آنکھیں موندے ابھی مجھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ یوں محسوس ہوا کسی خیال کی لہر میرے ذہن کی سطح سے ٹکرا رہی ہے۔ میں چونک اٹھی اور اسی کے ساتھ میرے ذہن کو خفیف سا جھٹکا محسوس ہوا۔ معاً اپنے ذہن میں مجھے موشرورف کی آواز گونجتی سی لگی۔ ابتدا میں اس کے الفاظ مبہم سے اور غیر واضح تھے۔ پھر آواز واضح طور پر آنے لگی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا۔ آپ میری آواز سن رہی ہیں.....؟ آپ تک میری آواز پہنچ رہی ہے نا.....؟ بتائیے عذرا خان! سن رہی ہیں آپ میرا آواز؟

ہاں موشرورف! تمہاری آواز مجھ تک پہنچ رہی ہے بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟

میں آپ سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں عذرا خان!

کیسا سودا؟

آپ میری چین کو رہا کر دیں! میں آپ کے ملک سے چلا جاؤں گا۔

کیا تم بھول گئے موشرورف کہ میں نے آج ہی رات تمہیں بتایا تھا کہ چین کو اگر اغوا کر لیا گیا ہے تو اس میں میرا ہاتھ نہیں۔ میں نے دانستہ اپنی بات دہرائی تھی۔

آپ غلط کہہ رہی ہیں عذرا خان! میری چین آپ ہی کی کوئی میں قید ہے!

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس سے ذہنی رابطہ قائم کر چکے ہو!

”حیرت ہے مس خان کہ آپ مجھ سے ایسی باتیں کہہ رہی ہیں!“

”کیوں! اس میں حیرت کی کیا بات ہے چین؟“

”آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے خود ہی تو میرے اظہارِ ندامت پر یہ کہا تھا کہ تمہاری جگہ میں بی ہوتی تو موقع ملنے پر جدوجہد ضرور کرنی! پر آپ مجھ سے یہ حق کیوں چھین رہی ہیں.....؟“

”اس لئے چین کہ تمہیں اب جدوجہد کا موقع نہیں ملے گا اور اس لئے بھی کہ میں تم پر کوئی کم کرنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں اپنی کوئی میں مہمان بنا کر ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ کسی اور حیثیت سے نہیں۔ پھر تم کیوں جدوجہد پر بضد ہو؟“

”مس خان! میں آپ کو مطمئن کرنے یا دھوکا دینے کے لئے یقیناً یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گی مگر ایسا کہنا جھوٹ ہوگا۔ یہ بات میری فطرت کے خلاف ہے کہ میں ہنسی خوشی اور رضامندی سے کسی کی بھی قیدی رہنا قبول کر لوں چاہے وہ آپ ہی جیسی کوئی نیک دل خاتون کیوں نہ ہو!“

”تو پھر ٹھیک ہے چین تمہیں جدوجہد کرنے اور کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھانے کی میری طرف سے اجازت ہے مگر اس کے ساتھ اپنے ذہن میں یہ بھی رکھنا کہ راہ فرار مسدود کرنے اور تمہاری جدوجہد ناکام بنانے کیلئے میں بھی کوئی قدم اٹھا سکتی ہوں۔ میری بات سمجھ رہی ہونا!“

”جی ہاں! اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ بالفاظِ دگر آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مجھے اپنے کئے کو سزا بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔“

”سزا کا لفظ ذرا زیادہ ہے اس کی جگہ تدارک زیادہ مناسب ہے۔ میں تمہیں کوئی سزا دینے کے بجائے تمہاری جانب سے کی جانے والی جدوجہد کا تدارک کروں گی۔“

”آپ اسے تدارک کا نام دے لیں مس خان میں سزا ہی کہوں گی۔“ وہ اپنی بات پُر اڑی رہی۔

”تم جو چاہے کہو اور جو چاہے سمجھو مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی ہوں۔ اچھا خدا حافظ چین!“ یہ کہتے ہی میں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی، پھر اس سے پوچھا۔ ”تم کہو تو ٹیوب لائٹ آف کر کے اس کمرے میں ہلکا نیلا بلب جلاؤ؟ یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تم خود ابھی اٹھنے قابل نہیں ہو۔“

”شکر یہ مس خان!“ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ”ٹیوب لائٹ بجھا کر نیلا بلب ہی جلا دیجئے۔ میں اب سو جانا چاہتی ہوں۔“

مجھے علم تھا کہ چین غلط کہہ رہی تھی۔ وہ سونے والی نہیں تھی۔ اسے یقیناً اس وقت کا انتظار تھا جب خواب آور گیس کا اثر ختم ہو جاتا۔ اسی کے بعد وہ اپنی دانست میں جدوجہد کے لئے کوئی قدم اٹھا سکتی تھی مگر جواب میں خاموش ہی رہی اور ٹیوب لائٹ بجھا کر کمرے میں ہلکا نیلا بلب جلا دیا۔ پھر میں وہاں مزید رکے بغیر باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی میں نے کمرے کا دروازہ مقفل کر دیا تھا اور چابی وہاں موجود ایک مسخ محافظ کو تھما دی تھی کہ وہ ڈیوٹی روم میں پہنچا دے۔

مہمان خانے کے اس حصے سے نکل کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔ سیل کے محافظ

الی اور پھر صبح ہوتے ہی بے چینی کا سبب معلوم ہو گیا۔ کمانڈر نواز سے مجھے رپورٹ ملی تھی کہ گزشتہ رات موشرورف نے میری کوٹھی پر زبردست یلغار کی تھی جس کے نتیجے میں سیل کے دو ارکان شدید زخمی ہو گئے تھے۔ دونوں جانب سے فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا مگر میرے آدمیوں نے موشرورف اور اس کے ساتھیوں کو لٹلی میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس معرکہ آرائی میں موشرورف کے کئی آدمی بھی زخمی ہو گئے تھے۔ اطلاعات کے مطابق خود موشرورف کو بھی گولی لگی تھی لیکن اس کے ساتھی اسے زخمی حالت میں اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ سیل کے جو دو ارکان شدید زخمی ہوئے تھے انہیں آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر لے آیا گیا تھا۔

چین کا ذہن پڑھنے کے بعد ہی موشرورف اس دھوکے میں آ گیا تھا کہ میں نے اپنی کوٹھی ہی میں اس کی مجبورہ کو قید کر رکھا ہے۔ اس نے اسی لئے میری کوٹھی پر بھرپور حملہ کیا تھا۔ ایک طرف تو وہ مجھ سے ذہنی رابطہ قائم کر کے مجھے یہ اطمینان دلا رہا تھا کہ سودے بازی اور انتظار پر آمادہ ہے دوسری جانب مل اقدام کی تیاری کر رہا تھا۔ موشرورف کی یہ حرکت مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اپنی دانست میں وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ گزشتہ شب میں کسی قدر تذبذب کا شکار ہو گئی تھی کہ اس کی پیشکش قبول کر لوں یا نہیں! لیکن اب اس کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ موشرورف کے قول و فعل پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی بھی بہانے اپنی دست راست اور مجبورہ چین کو میرے چنگل سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا اس کو کوئی اور مقصد نہیں تھا۔ یہ ساری باتیں اب جھوٹ ہی لگ رہی تھیں کہ وہ چین کی خاطر اپنا پیشہ ترک کر دے گا۔ ہرے راستے میں آئندہ نہیں آئے گا اور یہ کہ میرا ملک چھوڑ کر چلا جائے گا۔ میرے خیال میں وہ اپنے ملک اور اپنے نظریات سے مخلص تھا اور کسی طور پر بھی ان سے غداری کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ گزشتہ رات موشرورف نے جو حرکت کی تھی اس نے مجھے اس کی طرف سے برگشتہ کر دیا تھا۔ معرکہ آرائی میں پہلے اس کی طرف سے ہوئی تھی اور میرے نزدیک وہی اس کا ذمہ دار تھا۔ عملاً یہ اس سے میرا پہلا تصادم تھا۔ اسی تصادم کے نتیجے میں میں نے فیصلہ کیا کہ چین بدستور میری قید ہی میں رہے گی۔

ناشتا کرنے سے پہلے میں نے ان زخمیوں کی عیادت ضروری سمجھی جو موشرورف سے معرکہ آرائی کے نتیجے میں زخمی ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر رشید نے رات ہی کو انہیں طبی امداد فراہم کر دی تھی۔ ان اہل کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ گولیاں ان کے جسموں سے نکالی جا چکی تھیں۔ ڈاکٹر رشید ہی سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ چین کی بھائی ہوئی ٹیلیٹ استعمال کرانے کے بعد سرفراز اور اس کے ساتھیوں کی حالت معمول پر آ گئی ہے وہ کسی سہارے کے بغیر چل پھر سکتے ہیں البتہ کچھ جسمانی کمزوری ہے جو دو ایک دن میں دور ہو جائے گی۔ یہ خبر میرے لئے خوش گوار تھی۔

چین کو ”مہمان خانے“ کے جس کمرے میں رکھا گیا تھا اب وہاں سے بھی ایک اور کمرے میں ہری ہی ہدایت کے مطابق منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ نیا کمرہ اعتبار سے انتہائی محفوظ تھا۔ اس نئے کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور ہوا کے گزر کی خاطر کمرے کی اوچی چھت کے قریب صرف چند سوراخ تھے جو کچھ سے دیکھنے پر نظر نہیں آتے تھے۔ کمرے میں موجود ٹیوب لائٹ پر آہنی جالی چڑھی ہوئی تھی تاکہ اسے کوئی چیز پھینک کر توڑا نہ جاسکے۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی ایسی شے نہیں تھی جسے بہ وقت ضرورت

ہاں! اور مجھے اس سلسلے میں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ قید کے دوران میں وہ ایک بار اب تک فرار ہونے کی کوشش بھی کر چکی ہے۔ کیا اب بھی آپ اس سے انکار کریں گی کہ آپ کی قید میں نہیں ہے؟

موشرورف سے میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی کہ چین سے اس کا ذہنی رابطہ قائم ہو چکا ہے نہیں؟ اور مجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ آپ میرے سوال کا جواب دینے سے گریز کیوں کر رہی ہیں عذرا خان؟ بولیں آپ کو یہ سوا منظور ہے یا نہیں؟

اگر میں تمہاری پیشکش قبول بھی کر لوں تو تم اپنے بڑوں کو کیا جواب دو گے موشرورف؟ میر نے چھتا ہوا سوال کیا۔

شاید آپ کو یقین نہ آئے عذرا خان کہ اگر چین کی خاطر مجھے اپنا پیشہ بھی ترک کر دینا پڑا تو اس سے گریز نہیں کروں گا۔

مگر یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے موشرورف! تم مجھے بہلانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟

آپ کے سلسلے میں اپنے بڑوں کے سامنے جواب دہی سے میں کس طرح بچ سکتا ہوں؟ یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں کسی نہ کسی طرح انہیں مطمئن کر دوں گا اور اپنی جان چھڑا لوں گا یہ میرا شریفانہ وعدہ ہے کہ چین کی رہائی کے بعد آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔

مجھے اس سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ عورت کسی مرد کے لئے اتنی بڑی کمزوری بھی ثابت ہو سکتی ہے! موشرورف ایسا خطرناک ذہین اور چالاک شخص اپنی مجبورہ کے حصول کی خاطر اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتا تھا میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

موشرورف نے میرے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات پڑھ لئے تھے اسی لئے وہ کہہ رہا تھا کہ عذرا خان آپ ایک عورت ہیں اور عورت ہونے کے ناتے کسی مرد کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتیں لیکن آپ نے تاریخ کا مطالعہ ضرور کیا ہوگا۔ کیا عورتوں کی خاطر جنگیں نہیں ہوئیں؟ کیا مردوں نے عورتوں کے لئے اپنی سلطنتیں ختم نہیں کر دیں؟ اپنی جان سے نہیں گزر گئے وہ؟

یہ گئے گزرے زمانوں کی باتیں ہیں موشرورف! وہ زمانہ اور تھا یہ اور زمانہ ہے! تم اتنی آسانی سے مجھے اپنی بات کا قائل نہیں کر سکتے۔ بہر حال مجھے کچھ سوچنے کا وقت دو! کل تک انتظار کرو تمہیں تمہاری پیشکش کا جواب مل جائے گا۔

ٹھیک ہے عذرا خان میں کل تک انتظار کر لوں گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کا فیصلہ میرے حق ہی میں ہوگا۔ اچھا خدا حافظ! ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے خود ذہنی رابطہ منقطع کر لیا۔

موشرورف سے ذہنی رابطے کے بعد میری نیند اڑ گئی۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ پھر یہ بے چینی اس قدر بڑھی کہ میں بستر سے اٹھ کر کمرے میں ٹپلنے لگی۔ بظاہر اس بے چینی کا مجھے کوئی سبب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید موشرورف کا ناقابل فہم رویہ تھا۔ اس رات مجھے بڑی مشکل سے نیند

میری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ آگئی پھر وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”شکر ہے کہ میں آپ کو نظر تو آ رہا ہوں ورنہ آپ اس سے بھی انکار کر دیتیں تو میں کیا بگاڑ لیتا! ہاں یہ بتائیں کہ آپ کی ہمیشہ صاحبہ نے میرے بارے میں اور کیا کیا ریمارکس دیئے تھے؟ انہوں نے مجھے درباری مسخرے کا خطاب دیا، یہ بھی ان کی عنایت ہی ہے!“

”رات گئی، بات گئی!“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اب وہ ذکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ کب لاہور جا رہے ہو؟“

”یہاں بھی تنہائی ہے اور وہاں جا کر میں مزید تنہا ہو جاؤں گا۔ اس لئے میں نے لاہور جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

”یہ آخر تمہیں تنہائی کا روگ کب سے اور کہاں سے لگ گیا؟ میرے مشورے پر تم عمل کرتے تو نہیں! شادی بیاہ کرالو، گھر والی، گھر والی آ کر تمہاری ساری تنہائی ختم کر دے گی اور پھر دو چار سال میں جب تمہارے گھر کے صحن میں دو چار بچے بیٹ بال کھیلیں گے تو تمہیں تنہائی کا گلہ نہیں رہے گا بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ تم تنہائی کو ترسو گے۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ!“ یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لیا۔ یہ بات بھی اس کے مزاج کے خلاف تھی۔

میں بہت کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح وہ اپنی گزشتہ روش پر آ جائے اور چپکنے لگے مگر ابھی تک اس میں مجھے ناکامی ہی ہوئی تھی۔

”کیا پیسے گی آپ؟“ کافی یا چائے؟“ اس نے بدستور سنجیدہ لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ ”دوپے تو میں ابھی ناشتا کر کے آ رہی ہوں مگر چائے چل جائے گی لیکن ایک شرط پر!“ میں نے اس کے اداس چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”وہ شرط بھی بیان کر دیجئے!“

”شرط یہ ہے کہ تم دیو داس بننے کی بجائے ملک دلاور نظر آنے لگو۔! اب بہت ہو گئیں یہ ٹھنڈی میٹھی آہیں!..... میں زیادہ دیر یہ بوریت برداشت نہیں کر سکتی!“

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان نظروں میں شکوہ بھی تھا اور گہری اداسی بھی۔

”سنو ملک دلاور! اگر تمہیں ذکیہ کی یا میری کسی بات سے دکھ پہنچا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔“ میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ”میرا مقصد ہر گز تمہاری دل آزاری نہیں تھا۔ اب تو کھل کر مسکرا دو نا!“

معلوم نہیں میرے لہجے میں ایسی کیا بات تھی کہ ملک دلاور کے ہونٹوں پر زندہ سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ پھر وہ بولا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا خاتون کہ آپ بھی مجھے اداس دیکھ کر اداس ہو جائیں گی اور یہ بھی کہ میرے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہوں گی۔ کہیں میرے ستارے ایک بار پھر تو گردش میں نہیں آنے والے! میں تو صبر کر چکا تھا آپ کو۔ مگر لگتا ہے کہ آپ سے صبر نہیں ہو رہا ہے۔ وہ جو کسی

بطور ہتھیار استعمال کیا جاسکے۔ جین کو بحالت بے ہوشی اس بنے کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔ میرے ہی حکم پر رات کو اس کے کمرے میں بے ہوشی کی گیس چھوڑ دی گئی تھی۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد خود میٹر نے ہی کمائنڈر نواز کو یہ احکام دیئے تھے۔ ٹیلیٹ استعمال کرنے اور خواب آور گیس کا اثر ختم ہونے کے بعد جین کوئی بھی نئی پرابلم پیدا کر سکتی تھی۔ میں اسی لئے اسے بے ہوش ہی رکھنا چاہتی تھی۔

سیل کے ارکان کی عیادت کرنے کے بعد میں نے اپنے کمرے میں ناشتا کیا پھر چائے پیئے ہوئے انٹرکام کا ریسور اٹھا لیا۔ ڈیوٹی روم سے رابطہ قائم کر کے میں نے جین کے بارے میں معلوم کیا۔ کمائنڈر نواز عثمانی کو چارج دے کر جا چکا تھا۔ عثمانی سے مجھے معلوم ہوا کہ جین ابھی تک بے ہوش ہے۔ اندازے کے مطابق اسے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوش آ سکے گا۔

”عثمانی! جب اسے ہوش آ جائے تو تم اپنی نگرانی میں ناشتا وغیرہ کرا دینا۔! تمہیں کمائنڈر نواز سے یہ ہدایت مل چکی ہوگی کہ جین کو زیادہ دیر ہوش میں نہیں رکھنا!“

”جی ہاں میڈم! کمائنڈر نواز نے مجھے جین کے متعلق تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔“ عثمانی نے جوابا کہا۔

”میں فی الحال ناشتا کر کے یہاں سے جا رہی ہوں۔ ممکن ہے دوپہر کے بعد لوٹوں! اس دوران میں تم لوگوں کو جین کی طرف سے پوری طرح محتاط اور چوکنا رہنا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ گزشتہ روز فون پر ملک دلاور سے میری بات ہوئی تھی اور وہ مجھے کچھ ڈس ہارٹ معلوم ہوا تھا۔ میں اس وقت اسی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ بہر حال میرا ایک مخلص دوست تھا۔ نادانستگی میں اس کے ساتھ ج زیادتی ہو گئی تھی میں اس کا تذکرہ کرنا چاہتی تھی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے تقریباً نو بجے صبح میں اپنی کار میں سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں مجھے شیخ مجید کا خیال بھی آیا مگر ابھی میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ وہی پاکستان میں مشوروف کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ رات کو معرکہ آرائی کے لئے مشوروف کو کرائے کے غنڈے بھی یقیناً اسی نے فراہم کئے تھے۔ ورنہ اب تک مشوروف اور جین ہی مجھ سے نبرد آزما رہے تھے۔ اس وقت مشوروف کہاں ہو سکتا تھا اس سلسلے میں حتی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ محض میرا قیاس ہی تھا کہ وہ زخمی ہونے کے بعد ہاتھ آئی لینڈ میں شیخ مجید ہی کے پاس ہوگا۔ اس سے بہتر اس کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا علاج بھی وہاں بہتر طور پر اور راز داری کے ساتھ ممکن تھا۔ فی الحال مشوروف کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک کر میں ملک دلاور کے بارے میں سوچنے لگی جس کی کوشش اب قریب آتی جا رہی تھی۔ میری کار اب سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

اس روز ملک دلاور مجھے خلاف توقع سنجیدہ اور کچھ اداس سا نظر آیا۔ میں اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میرے مقابل کچھ فاصلے پر ایک صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بظاہر لائق سا بیٹھا تھا۔

”تم اس وقت مجھے ملک دلاور کی بجائے کسی فلم کے ایسے ہیرو نظر آ رہے ہو جو لن کے ہاتھوں پٹ کر تنہائی میں ٹھنڈی میٹھی آہیں بھر رہا ہو!“ میں نے ملک دلاور کو چھیڑا۔

کے درمیان ہوئی؟ اس سلسلے میں وہ اس وقت میرے ملازمین کے بیان لے رہی ہے کیونکہ علاقے کے لوگوں نے بیان دیا ہے کہ فائرنگ کی آوازیں میری کوشی کی جانب ہی سے سنائی دی تھیں۔

”یقیناً پولیس کو میری بھی تلاش ہوگی! اور۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ہوسکتا ہے میڈم مگر ابھی یہ بات سامنے نہیں آئی۔ اور۔“ عثمانی نے جواب دیا۔

”میں اس وقت اپنی کوشی ہی کی طرف جا رہی ہوں۔ تم نے اچھا کیا مجھے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا اور اینڈ آ!“ یہ کہہ کر میں نے کار میں لگے ہوئے چھوٹے سے ٹرانسمیٹر کا سوچ آف کر دیا پھر کار کو تیز رفتاری سے دوڑانے لگی۔ اب میں اپنی کوشی تک جلد از جلد پہنچ جانا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔

پھر جب میری کار اپنی کوشی کے گیٹ پر جا کر رکی تو میں نے دیکھا کہ گیٹ کھولتے ہوئے چوکیدار کچھ سہا ہوا سا تھا۔

”کیا بات ہے خان بابا؟ تم مجھے کچھ ہراساں اور خوف زدہ سے نظر آ رہے ہو۔“ میں نے اس کے قریب کار روکتے ہوئے پوچھا۔

چوکیدار نے جواباً بتایا کہ ابھی چند منٹ پہلے پولیس والے میری کوشی سے گئے ہیں اور وہ فاطمہ کے علاوہ میری دو اور ملازماؤں کو بھی ضروری پوچھ گچھ کے لئے تھانے لے گئے ہیں۔

یہ سن کر میرا پارا چڑھ گیا۔ پھر بھی میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے چوکیدار کو مطمئن کر دیا کہ فکر نہ کرو میں ابھی خود تھانے جا کر ان سب کو لے آئی ہوں۔ یہ کہتے ہی میں نے اپنی کار روپرس میں لی اور کوشی کے گیٹ سے باہر آ گئی۔ اس کے بعد میں نے تیزی سے اسٹیرنگ گھمایا اور علاقے کے تھانے کی طرف کار دوڑا دی۔ میری کوشی کی اطراف رات کو ہونے والی فائرنگ کے سلسلے میں میرے ملازمین کے بیانات لیما کافی تھا۔ پوچھ گچھ کے بہانے ان کو حراست میں رکھنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میرے ملازمین کے ساتھ پولیس کا یہ سلوک ناروا تھا اور مجھے اسی پر غصہ آیا تھا۔

جلد ہی میں علاقے کے تھانے تک پہنچ گئی۔ اپنی کار کو ایک جانب پارک کر کے میں تیزی سے اتری اور کار کا دروازہ متفعل کر کے بہ غلٹ تھانے کی عمارت کی طرف بڑھی۔ اس تھانے کا انچارج مجھے اچھی طرح جانتا تھا اسی سبب میں اور بھی غصے میں تھی۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس انچارج کا تبادلہ ہو چکا ہے اور اب ایک دوسرا شخص اس کی جگہ سنبھال چکا ہے۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں تھانہ انچارج کے کمرے کے باہر کھڑے ہوئے ایک سپاہی کے قریب پہنچی۔ اس نے مجھے تھانہ انچارج کے کمرے میں جانے سے روک دیا تھا۔

”صاحب کا حکم ہے کہ کسی کو بغیر ان کی اجازت کے اندر نہ جانے دیا جائے!“ سپاہی نے مجھ سے کہا تھا۔

”اپنے صاحب سے جا کر کہو کہ عذرا خان ان سے ملنا چاہتی ہے۔“ اسی کے ساتھ میں نے سابقہ تھانہ انچارج کا نام بھی لیا تھا۔

”ان کا تبادلہ ہو چکا ہے جی لیئر تھانے میں!“ سپاہی نے بتایا۔ ”اب تو۔۔۔۔۔“

شاعر نے کہا ہے کہ اداس دیکھ کر مجھ کو اداس بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔“

”اب اس قدر فری ہونے کی کوشش نہ کرو کہ شعر بھی پلانے لگو!“ میں بظاہر منہ بنا کر بولی۔

”تو چلیں چائے پلوا دیتا ہوں۔۔۔۔۔ شربت دیدار کے بدلے یہ سودا بھی مہنگا نہیں ہے۔“ بالآخر وہ اپنی سابقہ روش پر آئی گیا اور میں یہی چاہتی بھی تھی۔

پھر چائے پینے کے دوران میں بھی اسی طرح کی فقرے بازی ہوتی رہی۔ میں جب کچھ دیر بعد اس کے پاس سے اٹھ رہی تھی تو میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔

”اب کب پھیرا لگائیں گی؟“ میں اٹھ کھڑی ہوئی تو اس نے پوچھا۔

”جب بھی موقع ملا آ جاؤں گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم اپنے علاج کی طرف پوری توجہ دو! اور ڈاکٹر تہذیبی آب و ہوا کا مشورہ دے رہے ہیں تو مان لو ان کی بات! کیا حرج ہے کچھ دن کے لئے لاہور یا کہیں بھی چلے جاؤ!“

”سوچا تو میں نے بھی یہی تھا مگر آدمی کا سوچا پورا کب ہوا ہے۔ میں لاہور چلا تو جاؤں مگر آپ نہیں مانیں گی ہرگز!“

”میرے نہ ماننے کی اس میں کیا بات ہے! میں تو خود تم سے جانے کو کہہ رہی ہوں۔“

”ممکن ہے آپ میری جدائی برداشت کر لیں کہ خاصی کٹھور خاتون ہیں مگر میں کیسے جبر کے دن اور ہجر کی راتیں گزاریں گا آپ کے بغیر!“

”بس لگ گئی بیک کی۔۔۔۔۔ معلوم ہے مجھے کہ تم کتنے بڑے عاشق صادق ہو میرے۔۔۔۔۔! خدا حافظ۔“ یہ کہتی ہوئی میں ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”انہی اداؤں نے تو مار رکھا ہے خاتون!“ اس نے ہانک لگائی۔ ”کاش کبھی آپ میری آنکھوں کے راستے میرے دل میں جھانک کر دیکھ سکیں۔“

میں اس کی بات کو نظر انداز کرتی ہوں ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔

بہت دنوں سے میں نے اپنے دفتر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اپنی فرم کی میٹیر عارضہ سے ملے بھی مجھے خاصے دن گزر چکے تھے۔ میں نے ملک دلاور کی کوشی سے نکلتے ہوئے سوچا کہ کیوں نہ آج ادھر بھی ہو لیا جائے! ٹرس وغیرہ کو دیکھنے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ کاروبار کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ عارضہ پر مجھے پورا بھروسہ تھا۔ وہ کاروباری امور کو بہ حسن و خوبی نمٹانے کی اہل تھی۔ عارضہ ذہن بھی تھی اور ایمان دار بھی۔ ایسے افراد جن لوگوں کو مل جائیں وہ خوش قسمت ہی کہلاتے ہیں اور کم از کم اس معاملے میں واقعی میں خوش قسمت ہی تھی۔ میرے تمام ہی ساتھی ذہین با وفا اور دیانت دار تھے۔

میں اپنے دفتر پہنچی تو اتنے عرصے بعد مجھے دیکھ کر سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ میں نے دانستہ اپنا کمر نہیں کھلویا تھا کیونکہ وہاں زیادہ دیر رہنے کا پروگرام نہیں تھا۔ میں عارضہ ہی کے کیمین میں بیٹھی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹا میں نے اپنے دفتر میں گزارا اور پھر وہاں سے اپنی کوشی کی طرف روانہ ہو گئی۔

راستے میں ٹرانسمیٹر پر عثمانی سے مجھے معلوم ہوا کہ رات کو ہونے والی فائرنگ کے سلسلے میں علاقے کی پولیس میری کوشی تک پہنچ چکی ہے۔ پولیس یہ تفتیش کر رہی ہے کہ فائرنگ کیوں اور کن لوگوں

ملاتے ہوئے غصے میں پھکاری۔

”کیا.....؟ کیا کہتا ہوں مجھے!.....! حق آدمی!.....! اب میں تمہیں اندر کے بغیر نہیں چھوڑوں گا!“ وہ بھی غصے میں آ گیا۔ غصے ہی کی وجہ سے شاید اس نے میری پوری بات نہیں سنی تھی ورنہ یہ سن کر کہ میں آئی جی کو فون کر رہی تھی اسے کم از کم یہ تو ضرور چاہئے تھا مجھے فون کرنے سے روک دیتا۔ دوسری جانب سے جلد فون اٹھایا گیا اور میں فوراً بول اٹھی۔ ”میں عذرا خان بول رہی ہوں مجھے فوری طور پر آئی جی صاحب سے بات کرنا ہے۔“

”ہولڈ آن پلیز!“

پھر چند ہی لمحے بعد مجھے فون پر آئی جی کی آواز سنائی دی تو میں اپنا غصہ ضبط کرنے کے باوجود خود پر پوری طرح قابو نہ رکھ سکی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ نے اپنے تھانوں میں کن احقوں کو بٹھا رکھا ہے جنہیں خواتین سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں! اس بے وقوف آدمی نے میری غیر موجودگی میں میری تین ملازماؤں کو کوٹھی سے اٹھوایا ہے اور اب خود مجھے بھی اندر کرنے کی دھمکی دے رہا ہے!“

”آپ کس تھانے سے بول رہی ہیں؟“

”ڈیفنس سے!“

”کیا تھانہ انچارج اس وقت تھانے میں موجود ہے؟“

”جی ہاں! میرے سامنے ہی بیٹھا اپنی موٹھوں پر تاؤ دے رہا ہے!“ یہ کہتے ہوئے میں نے تھانہ انچارج کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اب فکر و پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

”آپ اسے فون دیں۔“

”یہ لو بات کرو اپنے بابا جان سے!“ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور تھانہ انچارج کی طرف بڑھا

دیا۔

”کک..... کیا فون پر آئی..... واقعی آئی جی صاحب ہیں؟“ اس کے لہجے میں خوف تھا اور آواز جیسے بھیک مانگ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس کی ساری اکڑ فون ختم ہو گئی تھی اور وہ بھگی بھگی ٹیلی فون پر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے مجھے سبھی سبھی نظروں سے دیکھتے ہوئے ریسیور میرے ہاتھ سے لے لیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ آئی جی نے اس سے کیا کہا! ہاں میں نے اسے ”لیس سر“ کہتے اور فون پر اپنا نام بتاتے ہوئے ضرور سنا۔ پھر میں نے اسے گھلیاتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ آئی جی کی منت سماجت کر رہا تھا کہ اس کا قصور معاف کر دیا جائے وغیرہ!

”بہتر..... بہتر ہے سر! میں..... میں ان سے معافی مانگ لوں گا..... ٹھیک ہے سر.....! جی..... جی وہ بات یہ تھی کہ ان کی کوٹھی کے آس پاس رات فارنگ ہوئی تھی اور اسی سلسلے میں تفتیش کی غرض سے ان کی ملازماؤں کو..... جی ہاں بالکل سر!..... میں ابھی محترمہ عذرا خان سے اپنے..... اپنی گستاخی کی معافی..... تھینک یوسر!..... ویری ویری تھینک یو!“ یہ کہہ کر اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ آئی جی سے فون پر بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ پسینے پسینے ہو گیا تھا۔

عین اسی وقت کمرے میں ایک باوردی پولیس افسر داخل ہوا اور اس نے تھانہ انچارج کو

اس کے بعد سپاہی نے کیا کہا میں نے نہیں سنا۔ غالباً سپاہی مجھے نئے تھانہ انچارج کا نام بتا رہا تھا مگر اسی دوران میں آگے بڑھ کر میں سپاہی کی پروا کئے بغیر تھانہ انچارج کے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ سپاہی کو میں نے اتنا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ اندر داخل ہونے سے مجھے روک سکے۔

مجھے یوں اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر تھانہ انچارج کی تیوریوں پر مل پڑ گئے۔ ”کون ہیں جی آپ؟ اور یوں بغیر اجازت منہ اٹھائے کیوں چلی آ رہی ہیں اندر؟“ اس نے پولیس والوں کی مخصوص زبان میں مجھے ڈانٹا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی باہر کھڑا ہوا سپاہی بھی دروازے پر پڑی ہوئی چٹ اٹھا کر اندر آ گیا اور بولا۔ ”صاحب جی! میں نے ان کو منع کیا تھا اندر جانے سے مگر یہ زبردستی روکنے کے باوجود.....“

”اوے بکواس نہ کر!.....! جا باہر جا کے کھڑا ہو!.....! بڑا تیس مار خان بنتا ہے اور ایک عورت کو اندر آنے سے نہیں روک سکتا!“ انچارج نے سپاہی کو اپنے کمرے سے ڈانٹ کر نکال دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ”ہاں جی بولو کیا بات ہے؟“ اس نے مجھ سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا تھا۔

”میرا نام عذرا خان ہے اور میں یہیں ڈیفنس میں رہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے اپنا پتا بتایا۔ پھر بولی۔ ”آپ کے سپاہی میری ملازماؤں کو اٹھالائے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ انہیں کس جرم میں.....“

”اچھا تو آپ ہیں عذرا خان!“ وہ جیسے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اچھا ہوا کہ آپ خود ہی تھانے چل کر آ گئیں ورنہ آپ کی برآمدگی کے لئے ہمیں جانے کہاں کہاں چھاپے مارنا پڑتے!“

”وہ کس خوبی میں.....؟ پوچھ سکتی ہوں!“ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

”ابھی معلوم ہوا جاتا ہے!“ وہ اپنی مٹی موٹھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا پھر بہ آواز بلند دروازے پر کھڑے ہوئے سپاہی کو پکارا۔ ”اوئے مد خان!“

”لیس سر جناب!“ سپاہی فوراً اندر آ گیا۔

”سب انسپکٹر منیر حسین کو بلاؤ!“ انچارج نے سپاہی کو حکم دیا۔

”بہتر جناب!“ سپاہی لیفٹ رائٹ کرتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

”آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں اپنے علاقے میں ہونے والی کسی بھی گڑبگ کو برداشت نہیں کرتا۔ آپ نے دفعہ ایک سو سات سترہ کا نام سنا ہے! یہ دفعہ نقص امن میں لگتی ہے۔ اپنے علاقے میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے میں آپ کو اور آپ کی تمام ملازمین کو اندر کر سکتا ہوں۔ اب آیا کچھ آپ کی سمجھ میں!“ وہ مجھے اس طرح گھوڑنے لگا جیسے مجھے دھمکا دیا جاتا ہو۔

میری قوت برداشت اب جواب دینے لگی تھی۔ میں کچھ کہے بغیر آگے بڑھی اور اس کی میز پر دائیں جانب رکھا ہوا فون اپنی جانب کھسکا لیا۔

”اچھا تو اب تڑی دینا چاہتی ہو مجھے!“ وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسا۔ ”گورنر صاحب کو فون کر رہی ہو یا صدر مملکت کو؟“

”تمہیں سبق دینے کے لئے صرف آئی جی بھی کافی ہے! حق آدمی!“ میں آئی جی کے نمبر

کا نمبر ٹیلی فون ڈائریکٹری میں نہیں تھا۔ میں جلدی جلدی لباس زیب تن کیا اور لپک کر فون کے قریب پہنچ گئی۔ ریسپونڈر اٹھانے میں میں نے دیر نہیں کی تھی۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی جو میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔

”آداب!“ میں نے فوراً آواز پہچانتے ہی کہا۔ ”حکم فرمائے میں عذرا بول رہی ہوں۔“

”تم ابھی تک کراچی ہی میں ہو..... ڈھاکہ روانہ نہیں ہوئیں؟“

”جی ہاں کچھ ایسی ہی پھنس گئی تھی یہاں..... مگر جلد ہی انشاء اللہ آپ کے حکم کی تعمیل کر دوں گی۔“

”یہ تم نے حکم حکم کی کیا رٹ لگا رکھی ہے!“ دوسری جانب سے بات کرنے والی محترم شخصیت

نے مجھے ڈانٹ دیا۔ پھر نرم لہجے میں پوچھا۔ ”تم نے آج کا اخبار دیکھا؟“

”جی میں نہیں دیکھ سکی..... کوئی خاص بات ہے کیا آج کے اخبار میں؟“

”ہاں کم از کم تمہارے لئے اسے خاص ہی کہا جاسکتا ہے۔ شہر یار کا نام صدر مملکت کے مشیروں

کی فہرست سے خارج کیا جا چکا ہے۔“

”اوہ وغیرہ!“ میں کوشش کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ یہ خبر واقعی میرے لئے

خوش خبری کی حیثیت رکھتی تھی۔

”اس کے علاوہ بھی آج کے اخبار میں بہت کچھ ہے۔ تم اخبار پر ایک نظر ڈال لیا کرو! مختصراً

میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں اب امریکی ایجنٹوں کی سرگرمیاں خاصی تیز ہو گئی ہیں۔

وہاں سے اچھی خبریں نہیں آرہی۔ تمہارا اب وہاں جلد از جلد پہنچنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ پڑوسی

ملک کے کچھ تخریب کار بھی وہاں ٹھس آئے ہیں۔ انتظامیہ ان سے بھی منٹ رہی ہے۔ امریکی ایجنٹ

سولومن کے بارے میں بھی تازہ خبر یہی ہے کہ وہ بھی ڈھاکہ ہی میں ہے۔ اس پر بھی ابھی تک ہاتھ نہیں

ڈالا جاسکا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بس آج کل ہی میں ڈھاکہ پہنچ جاؤ۔ مجھے تمہاری طرف سے صاف اور

واضح جواب چاہئے تاکہ مطمئن ہو سکوں۔“

آپ کی آواز فون پر سن کر میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ آپ غالباً اسلام آباد سے بات کر رہے

ہیں!“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں آج ہی کراچی سے یہاں پہنچا ہوں..... ہاں تم نے میری

بات کا جواب نہیں دیا۔“

”کیا آپ مجھے کل تک کی مہلت اور دے سکتے ہیں؟“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”بالکل کیوں نہیں.....! لیکن کل تم مجھے یہی اطلاع دو گی کہ ڈھاکہ روانہ ہو رہی ہو..... ٹھیک

ہے؟“

”جی بہتر ہے انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ آپ فون کریں گے یا میں خود.....“

”تم جو چاہو.....! تم کس وقت اپنی کوئی پروگرم؟ میں فون کر لوں گا۔“

”کل شام پانچ بجے تک میں یقیناً کسی فیصلے تک پہنچ جاؤں گی۔“

سیلٹ کیا۔

”اوئے منیر حسین! تم میری وردی ضرور اترواؤ گے.....! تمہیں کیا پڑی تھی جو تم ان معزز

خاتون کی ملازماؤں کو تھانے لے آئے.....؟ بولو!“

”سہجی! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ.....“

”بکواس نہ کرو زیادہ!“ تھانہ انچارج نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی۔ پھر اسے حکم دیا۔ ”ان

کی تینوں ملازماؤں کو فوراً چھوڑ دو.....! جاؤ جلدی کرو.....! بلکہ سنو تم خود پولیس جیپ میں کوٹھی تک چھوڑ

کر آؤ!“

تھانہ انچارج کا حکم سن کر سب انسپکٹر حیران حیران سا کرے سے نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے

ہی میں نے بھی دروازے کا رخ کیا کیونکہ اب وہاں میری موجودگی ضروری نہیں رہی تھی۔

”ذرا سنئے محترمہ خاتون! میری نوکری پر بن جائے گی..... میں..... میں آپ سے اپنی گستاخی

کی معافی چاہتا ہوں“ یہ کہتے ہوئے تھانہ انچارج اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں اس

کی آواز سننے ہی دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رگ گئی تھی۔

”معاف کر دیا میں نے تمہیں.....! بس.....! اب جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھو اور آئندہ کے لئے

یہ بات اپنی گرہ میں باندھ لو کہ ہر فرد کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا جاتا! خصوصاً خواتین کے سلسلے میں

تمہیں مہذب اور شائستہ ہونا چاہئے!“

”ٹھیک فرما رہی ہیں آپ.....! مگر آئی جی صاحب کو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ آپ نے مجھے

معاف کر دیا ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو خود فون پر اس کی تصدیق

ان سے کر دیں ورنہ خدا معلوم وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ آپ کا تو کچھ نہیں جانے گا محترم مگر میری

نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ کسی تھانے میں یہ میری پہلی پوسٹنگ ہے۔ اگر لائن حاضر ہو گیا تو پھر

..... اس کی آواز بھرانے لگی اور مجھے اس پر رحم آ گیا۔

”ملاؤ نمبر! میں کہے دیتی ہوں کہ معاف کر دیا تمہیں۔“ یہ کہہ کر میں میز کی طرف مڑ گئی۔

”آپ..... آپ تشریف رکھیں میں ابھی آئی جی صاحب کا نمبر ملاتا ہوں۔“

پھر اس نے میر ”جان بخشی“ اسی وقت کی جب میں نے فون پر آئی جی سے وہ سب کچھ کہہ دیا

جو اس کی خواہش تھی۔ اس نے مجھ سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی

جائے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا نادانستگی میں ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تھانہ انچارج مجھ سے کچھ رقم

انحصار چاہتا تھا اسی لئے وہ مجھے ڈرا دھمکا رہا تھا۔ میری ملازماؤں کے ساتھ پولیس کوئی زیادتی نہیں کر پائی

تھی کیونکہ میں بروقت تھانے پہنچ گئی تھی۔ تھانے سے کوٹھی پہنچنے کے بعد خود ملازماؤں سے بھی اس کی

تصدی ہو گئی۔

اب دوپہر ہونے والی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ دوپہر کا کھانا کھا کر اور کچھ دیر حسب معمول آرام

کرنے کے بعد ہی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا رخ کروں گی۔

میں اپنی خواب گاہ میں لباس تبدیل کر رہی تھی کہ معاف فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ وہی فون تھا جس

”ٹھیک ہے پھر خدا حافظ! میں کل شام تم سے بات کر لوں گا۔“ اسی کے ساتھ محترم وزیر داخلہ نے فون پر گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے فون کرنے والے وہی تھے۔

فون پر محترم وزیر داخلہ سے گفتگو کرنے کے بعد میں آنکھیں میں پر گئی۔ اگر موشوروف سے چھڑ چھاڑ شروع نہ ہو جاتی تو میں اسی وقت ڈھا کہ روانہ ہونے کا اقرار کر لیتی۔ موجودہ حالات پر غور و فکر کرتے ہوئے میں نے اس دن کے اخبارات بھی منگوا لئے۔ اخبارات کے مطالعے سے مجھے محترم وزیر داخلہ کی تشویش کے اسباب معلوم ہو گئے۔ مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) میں واقعی خاصی گڑبڑ معلوم ہو رہی تھی۔ خبروں سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔ شہریار کی بابت جو خبر شائع ہوئی تھی وہ بھی میری نظروں سے گزری۔ صدر مملکت کی مشاورتی کمیٹی سے بظاہر خود اس نے استعفیٰ دیا تھا لیکن میرے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا کہ اس سے استعفیٰ طلب کیا گیا ہوگا۔ میرے لئے یہ دن بہر حال خوشی کا تھا کیونکہ میرا ایک بڑا حریف مکمل طور پر پسپا ہو چکا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرتے ہوئے بھی میں غور و فکر میں ڈوبی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا قدم اٹھاؤں؟ موشوروف سے نئے بغیر میری ڈھا کہ روانگی نہ معلوم کیا گل کھلائی! خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ اس کی دست راست جین میری قید میں تھی۔

مجھے ابھی بستر پر دراز ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بس اچانک ہی میرے سارے جسم میں ایک آشنائیت انگیز سنسنی کی لہری دوڑنے لگی۔ یہ وہی جانی پہچانی کیفیت تھی جس سے میں پہلے بھی متعدد بار گزر چکی تھی۔ کیف و سرشاری کے عالم میں میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر چند لمحوں بعد خود اپنی ہی آواز مجھے اپنی سماعت میں گونجتی محسوس ہونے لگی۔ میرا حیرت انگیز ذہن میری رہنمائی کر رہا تھا۔ میں واضح طور پر خود اپنی آواز سن رہی تھی۔ عذرا خان! روسی سیکرٹ ایجنٹ نے تم سے جو کچھ کہا ہے قطعی درست ہے۔ جین کی خاطر وہ حقیقتاً اسی حد تک جاسکتا ہے کہ تمہارا ملک چھوڑ کر چلا جائے۔ اسے تمہارے معاملے میں پسپائی پر کسی کے سامنے جواب دہی نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ خود اسی نے اپنی حکومت کے کچھ اعلیٰ حکام کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ تمہارے حیرت انگیز ذہن پر روسی سائنس دان تجربات کریں۔ اس ضمن میں حکومت ہی کے ایک حلقے کی طرف سے اس کی مخالفت بھی ہوئی مگر اس مخالفت کو وقتی طور پر دبا دیا گیا تھا۔ موجودہ صورت حال میں اگر خود موشوروف تمہارے باب میں اپنی تجاویز واپس لے لیتا ہے تو پھر اس سے باز پرس نہیں کی جائے گی۔ خود روسی حکومت اس معاملے میں اب زیادہ سمجیدہ نہیں ہے۔ وقتی طور پر صرف امریکہ دشمنی کے سبب اسے یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ تمہیں کسی طرح اغوا کرے اور امریکی ایجنٹوں کے چنگل سے نکال کر ماسکو لے آئے۔ اس سے روسی حکومت کا مقصد امریکی مفادات کو نقصان پہنچانا بھی تھا لیکن اب روسی حکومت تک یہ اطلاعات پہنچ چکی ہیں کہ امریکی ایجنٹ تم میں دلچسپی نہیں لے رہے اور وہ تمہارے ذہن کو اپنے مفادات کا غلام بنانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ روسی حکومت کی طرف سے اب موشوروف پر یہ دباؤ پڑ رہا ہے کہ وہ جلد از جلد کسی نتیجے تک پہنچ جائے ورنہ اپنی تجاویز واپس لے لے۔ گزشتہ شب اس نے جو کچھ کیا اس میں اس کی جین سے جنونی محبت کو دخل تھا۔ اس وقت وہ زخمی حالت میں ہاتھ آئی لینڈ کی ایک کوشی میں پڑا ہوا اپنی محبوبہ کی یاد میں آنسو بہا رہا ہے۔ تم اگر اس حالت میں ار

کی محبوبہ کو اس تک پہنچا دو گی تو وہ تمہارا یہ احسان کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر وہ تمہارے ملک سے چلا جائے گا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع ہے کہ کسی نے اسے یوں بے دست و پا کر دیا ہے۔ جین یا موشوروف پر اس سے پہلے کبھی کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ تمہارے معاملے میں اس وقت موشوروف تذبذب کا شکار ہے کہ پسپائی قبول کرے یا نہیں؟ اس حالت میں اگر وہ تمہارا زیر بار احسان ہو گیا تو یقیناً تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا اور تم امریکی ایجنٹوں سے نمٹنے کے لئے ڈھا کہ روانہ ہو سکو گی۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی آواز آنا بند ہو گئی۔

پھر کچھ دیر میرے جسم پر وہی مانوس لذت انگیز کیفیت طاری رہی اور میں آنکھیں بند کئے بستر پر پڑی رہی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرا حالت اعتدال پر آ گئی۔ میں ایک انگڑائی لے کر بستر سے اٹھی اور خود کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کرنے لگی۔ میں نے فوری طور پر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا فون نمبر ملایا۔ عثمانی سے میں جین کی خیریت کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ عثمانی نے مجھے فون پر بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جین کو ہوش آیا ہے اور اس وقت اسے دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے کہا جا رہا ہے مگر وہ کسی طرح کھانا کھانے پر راضی نہیں ہو رہی۔ وہ بار بار آپ کے متعلق پوچھ رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ جب تک آپ سے نہیں مل لے گی کھانا..... نہیں کھائے گی۔ میں خود آپ سے اس سلسلے میں ہدایات لینا چاہتا تھا کہ کیا کیا جائے؟ اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا جائے یا آپ خود یہاں تشریف لا رہی ہیں؟

”اسے دوبارہ بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں میں پہنچ رہی ہوں وہاں! جین کو بھی تم یہ اطلاع دے سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ لباس تبدیل کر کے اپنی کوشی سے نکلنے میں مجھے آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ڈرائیور کو میں نے ساتھ نہیں لیا تھا اور خود ہی کار ڈرائیو کر رہی تھی۔

آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر پہنچ کر میں نے ڈیوٹی روم سے جین کے کمرے کی چابی لی اور پھر عمارت کے عقبی حصے کی طرف چل دی۔ عثمانی اس دوران میں مجھے بتا چکا تھا میرا فون آنے کے بعد اور یہ اطلاع ملنے پر کہ میں خود جین کے پاس پہنچ رہی ہوں جین نسبتاً پرسکون ہے۔ ڈیوٹی روم کے ٹی وی اسکرین پر میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس وقت عثمانی اسکرین پر جین کے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ جین سر جھکائے کسی سوچ میں بیٹھ پڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد جب میں جین کے کمرے کا قفل کھول کر اندر داخل ہوئی تو وہ مجھ پر نظر پڑتے ہی برس پڑی۔ وہ انتہائی غصے میں مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ”مس خان! آپ کیسی میزبان ہیں کہ اپنی مہمان کو مسلسل بے ہوشی کی حالت میں رکھے ہوئے ہیں! آخر اس سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ اور یہ کون سے آداب میزبان ہیں!“

”ایسا میں نے محض اس لئے کیا تھا جین کہ تم ناختم چھل کود کر کے خود کو نہ تھکاؤ اور آرام سے بستر پر لیٹی رہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اس کی طرف..... بڑھتے ہوئے مزید بولی۔ ”تم نے آخر کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا؟ بغیر کھائے پیئے تو تم کمزور ہو جاؤ گی اور پھر موشوروف سے میں کیا کہوں گی! وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے تمہیں دانستہ بھوکا رکھا ہے۔“

ہے۔ میں چاہوں تو تمہاری ہی طرح اسے بھی اپنا مہمان بنا سکتی ہوں لیکن اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ میں تو اب تمہیں بھی زبردستی اپنا مہمان بنا کر رکھنا نہیں چاہتی!“

”مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا مس خان..... کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں؟“ جین کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور بے یقینی کی کیفیت بھی۔

”سنو جین! کل مشوروف نے میرے ذہن سے رابطہ قائم کرنے کے بعد ایک سودا کرنے کی پیشکش کی تھی۔ میں نے اسے جواب دینے کے لئے آج تک کا وقت مانگا تھا مگر اس سے صبر نہ ہو سکا اور وہ رات ہی کو تمہیں رہائی دلانے کی خاطر میری کوشی پر چڑھ دوڑا۔ اسی کے نتیجے میں وہ زخمی بھی ہوا۔ مشوروف نے مجھ سے یہ سودا کرنا چاہتا تھا کہ اگر میں تمہیں رہا کر دوں تو وہ میرا پیچھا چھوڑ کر میرے ملک سے واپس چلا جائے گا۔ مجھے بتاؤ جین کہ کیا واقعی وہ تمہاری خاطر ایسا کر سکتا ہے؟“

جین نے مختاط الفاظ میں میرے سوال کا جواب دیا۔ ”اگر مشوروف نے ایسا کہا ہے تو یقیناً وہ یہ قدم اٹھانے کا اہل ہوگا۔ میں اس سلسلے میں حتی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتی کہ واقعی وہ میری رہائی کے بعد مزید یہاں نہیں رکے گا لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ مشوروف میری خاطر کوئی انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا ہے خواہ یہ انتہائی قدم اٹھانے کے لئے اسے اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔“

”مگر ابھی ذرا دیر پہلے تو تم اسے بے وفا کہہ رہی تھیں!“ میں ہنس کر بولی۔

”غلط فہمی ہو گئی تھی مجھے اور..... اور یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے رہائی دلانے کی خاطر زخمی بھی ہو چکا ہے!“ وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر بولی پھر اسے جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس طرح اچانک مجھے مخاطب کیا۔ ”سنئے مس خان! تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”کس بارے میں چندا؟“ میں جان کر انجان سی بن گئی۔

”مشروروف کی پیشکش کے سلسلے میں!“

”پہلے میں خود فون پر اس سے بات کرنا چاہتی ہوں اسی کے بعد کوئی فیصلہ کروں گی۔“

”آپ کو وہ فون نمبر معلوم ہے جہاں.....“

”ہاں معلوم ہے مجھے!“ میں اس کی بات کاٹ کر بولی اٹھی۔ ”تم اتنے میں کھانا کھاؤ میں

مشروروف سے فون پر بات کر کے آتی ہوں۔“

”کہیں یہ سارا چکر آپ نے مجھے کھانا کھلانے کے لئے تو نہیں چلا رہی؟“ وہ مشتبہ سے لہجے

میں مسکرا کر کہنے لگی۔

”اگر تم یہی سمجھ رہی ہو تو ایسا ہی کہی.....! ویسے اب یہاں سے تمہارے جانے میں زیادہ

وقت نہیں لگے گا اس لئے غیر ضروری اچھل کود سے گریز کرنا! سمجھ رہی ہونا!“

”جب میری خاطر اتنی بڑی سودے بازی ہو رہی ہے دو حریفوں کے درمیان تو پھر مجھے خواہ

خواہ ہاتھ پیر چلانے کی کیا ضرورت ہے!“

”تو پھر میں تمہارے لئے کھانا بھجوا دوں؟“ میں نے دریافت کیا۔ ”بھوک ہڑتال ختم کر رہی

ہونا!“

میری زبان سے مشوروف کا ذکر سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں اس کے قریب مسہری پر بیٹھ گئی۔

”ہاں بولو! اب کھانا کھا لوگی.....؟ میں دراصل ایک ضروری کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔ اب میں آ گئی ہوں کھانا کھا لو!“ میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”نہیں!“ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”میں کھانا نہیں کھاؤں گی!“

”اس کی کوئی وجہ؟“

”اے آپ میرا احتجاج سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے آپ کی میزبانی قبول نہیں ہے۔“ ”اگر واقعی ایسا

ہی ہے کہ تم میری مہمان بن کر مزید یہاں رہنا نہیں چاہتیں تو مشوروف کے پاس بھی پہنچا سکتی ہوں۔“

میں نے اپنی دانست میں اسے چونکا کر دیا۔

”اس کا نام نہ لیں میرے سامنے!“ وہ اداس سے لہجے میں بولی۔ ”اے میں اتنا بے وفائیں

سمجھتی تھی!“

”بے وفا!“ اسے چونکانے کی بجائے میں خود چونک اٹھی۔ ”مشروروف نے کیا بے وفائی کی

ہے تم سے؟ میں سمجھی نہیں!“

”میں کل رات سے آپ کی قید میں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں مشوروف یہ

معلوم کر چکا ہوگا میں کہاں قید ہوں! اس کے باوجود.....“

”لیکن کیسے جین..... کیا تمہارا ذہن پڑھ کر؟“ میں نے خود اسی سے اعتراف کرنا چاہا۔

”جی ہاں مس خان.....! آپ بھی یقیناً اس کے غیر معمولی ذہن سے واقف ہوں گی۔ وہ ایک

بہترین ٹیلی پیٹھ ہے میرا ذہن پڑھ کر اس سے کے لئے کیا یہ مشکل رہا ہوگا کہ مجھے آپ کی قید سے رہائی

دلا سکے!“

”اگر میں یہ کہوں جین کہ مشوروف نے یہ کوشش کی تھی اور اپنی کوشش کے نتیجے میں اسے

ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو؟“

”میں ہرگز اس بات پر یقین نہیں کروں گی!“ وہ پر یقین لہجے میں بولا۔ ”مشروروف اور

ناکامی یہ سوچنا بھی میرے لئے محال ہے۔“

”تم غلطی پر ہو جین!“ یہ کہہ کر میں نے گزشتہ شب ہونے والی معرکہ آرائی سے اسے آگاہ کر

دیا پھر بولی۔ ”تمہاری ہی جنونی محبت کے نتیجے میں مشوروف اس ہنگامہ آرائی میں زخمی ہو گیا ہے۔“

”نہیں!“ وہ ایک دم بے چین ہو گئی۔ ”کہہ دیجئے مس خان کہ یہ غلط ہے اور..... اور

مشروروف زخمی نہیں ہوا۔“ اس کی آواز جذبات کی شدت سے مرتعش تھی۔

”آج ہی تم خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لو گی پھر تمہیں میری بات پر یقین آ جائے گا۔“

”تو..... تو کیا زخمی ہو کر وہ..... وہ..... مشوروف بھی آپ کا قیدی بن چکا ہے؟“

”نہیں جین!“ میں نے اسے بتایا۔ ”وہ اس وقت اپنے ایک پشت پناہ کی کوشی میں زیر علاج

”بالکل ختم!“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اس کے پاس سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”بہر حال ابھی تم میری مہمان ہو اس لئے آداب میزبانی پر برانہ ماننا“ کھانا آنے تک دروازہ مقفل ہی رہے گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں کمرے سے نکل آئی اور باہر آتے ہی دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ مقفل کر کے میں نے چابی ایک مسلح محافظ کے حوالے کر دیا اور اسی سے جین کے لئے کھانا منگوانے کے لئے بھی کہہ دیا۔

”مہمان خانے کی حدود سے نکل کر میں اپنے کمرے میں آگئی اور انٹر کام پر عثمانی کو تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اس سے شیخ مجید کے بہنوئی مشتاق احمد کا ٹیلی فون نمبر معلوم کیا۔ شیخ مجید کا قیام اپنے بہنوئی کی کوشی ہی میں تھا۔

یہ محض ایک حسن اتفاق ہی تھا کہ جب میں نے ٹیلی فون نمبر ملایا تو دوسری جانب سے خود شیخ مجید نے ریسپور اٹھایا۔ غالباً اسے کسی کے فون کا انتظار رہا ہو گا اسی لئے اس نے فوراً ریسپور اٹھالیا۔ ”شیخ مجید اسپیکنگ۔“

”میں عذرا خان بول رہی ہوں شیخ صاحب!“ میں بول اٹھی۔ ”آپ نے پہچانا مجھے؟“

”جی..... جی ہاں.....! غالباً ایک بار آپ سے ملاقات بھی ہو چکی ہے۔“

”غالباً نہیں بلکہ یقیناً.....! مجھے ایک مبارکباد بھی دینا تھی آپ کو!“

”وہ کس سلسلے میں خاتون؟“ اس نے چونک کر کہا۔

”آپ کا حریف شہریار مشاورتی کمیٹی سے استعفیٰ دے چکا ہے کیا یہ بات آپ کے لئے قابل

مبارکباد نہیں؟“

”یقیناً ہے.....! شکریہ خاتون.....! لیکن آپ نے صرف اسی لئے مجھے فون کیا تھا؟“

”جی نہیں ایک چھوٹی سی زحمت اور دینا بھی آپ کو!“

”فرمائیے! میں آپ کی بات توجہ سے سن رہا ہوں۔“

”دراصل مجھے آپ کے ایک غیر ملکی مہمان سے فون پر کچھ ضروری اور اہم گفتگو کرنا ہے اگر

آپ کو زحمت نہ ہو تو اسے فون پر بلوا دیں۔“ میں نے دانستہ فوری طور پر موشوروف کا نام نہیں لیا۔

”غیر ملکی مہمان.....! میں سمجھا نہیں.....! میں تو خود یہاں اپنے بہنوئی کا مہمان ہوں۔ آپ

کس غیر ملکی مہمان کی بات کر رہی ہیں؟“

”وہی جو گزشتہ رات ایک معرکے میں زخمی چکا ہے!“ میں معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”آپ

فرمائیں تو میں اس کا نام بھی بتا دوں! پاکستان میں اسے آپ ہی کی پشت پناہی تو حاصل ہے! زخمی ہونے

کے بعد بھلا وہ اور کہاں پناہ لیتا۔“

”معلوم نہیں یہ آپ کیا باتیں کر رہی ہیں! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟“

”شہریار کے استعفیٰ کے بعد تو آپ کی سمجھ میں بہت کچھ آ جاتا چاہئے شیخ صاحب!“ میرے

لہجے میں چھین تھی۔ ”بیرونی بڑی طاقتوں سے ساز باز کا نتیجہ بالآخر یہی ہوتا ہے۔“

”آپ کے اس طنز کا مطلب بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں.....؟“

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میرے ذہن پر آپ کا اچھا تاثر تھا مگر اس وقت خود آپ فضول اور بے

معنی باتیں کر کے یہ تاثر خراب کر رہی ہیں!“

”مجھے علم ہے شیخ صاحب کہ آپ میری بات کی تہ تک پہنچ چکے ہیں اور جو کچھ ڈھکے چھپے

لفظوں میں شہریار کے حوالے سے کہہ چکی ہوں اس بھی خوب سمجھ گئے ہیں.....! خیر یہ باتیں پھر بھی سہی

اگر آپ کسی سبب یہ اقرار نہیں کرنا چاہتے کہ کوئی غیر ملکی آپ کا مہمان ہے تو اس تک میرا ایک پیغام ضرور

پہنچا دیجئے گا کہ میں اس کی مجوبہ جین کی رہائی کے سلسلے میں اس کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔ وہ

فون پر مجھ سے بات کر لے۔ زحمت تو ہوگی آپ کو ذرا میرا فون نمبر لکھ لیجئے!“ پھر میں نے ذرا توقف

سے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کا فون نمبر بتا دیا۔ اس کے بعد مزید کوئی بات کے بغیر میں نے ریسپور رکھ دیا۔

توقع بھی مجھے یہی تھی کہ شیخ مجید موشوروف کی میزبانی کا اقرار نہیں کرے گا مگر میں نے اپنے

ذہن میں پہلے ہی سے اس کا حل سوچ رکھا تھا۔ موشوروف کے فون کا انتظار مجھے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں

کرنا پڑا۔ اس کی آواز سے نقابت کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے اس کی آواز پہچانتے ہی پوچھا۔ ”اب تم کیسے ہو موشوروف؟“

”پہلے سے بہتر ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو شیخ مجید نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا.....! وہ تو سرے ہی سے انکاری تھا کہ کوئی غیر ملکی

اس کا مہمان ہے۔“

”آپ تو جانتی ہیں عذرا خان کہ ایسے معاملات میں یہی ہوتا ہے۔ بہر حال میں آپ کا انتہائی

شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری پیشکش قبول کر لی۔“

”تم نے ناحق بے صبری سے کام لیا.....! جب تمہارے میرے درمیان گفتگو ہو چکی تھی تو

تمہیں کم از کم ایک دن تو انتظار کرنا ہی چاہئے تھا!“

”میں جلد بازی پر واقعی شرمندہ ہوں عذرا خان.....! لیکن اس کا سبب یہ تھا کہ مجھے آپ کی

بات پر یقین نہیں آیا تھا۔“

”اور اسی بے یقینی کے نتیجے میں تمہیں خواہ مخواہ زخمی ہونا پڑا۔ خراب یہ بتاؤ کہ میں جین کو کہاں

بھجواؤں.....؟ کیا تمہارے پاس براہ راست شیخ مجید کے بہنوئی کی کوشی پر یا پھر کہیں اور؟ تم جو کہو میں

کرنے کو تیار ہوں۔“

دوسری جانب چند لمبے خاموشی رہی پھر موشوروف نے کی آواز سنائی دی۔ ”معلوم نہیں اب

بھی مجھے کیوں یقین سنا نہیں آ رہا کہ میری جین بخیریت مجھ تک پہنچ جائے گی۔ آپ نے اچانک اس کی

رہائی کا فیصلہ کیسے کر لیا.....؟ گزشتہ رات کی معرکہ آرائی کے بعد تو مجھے قطعی امید نہ رہی تھی کہ آپ میر

درخواست قبول کر لیں گی۔“

گزشتہ رات کی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر معافی کا خواستگار ہوں۔“
 ”نیور مائنڈ.....! وٹس یو گنڈ لک!“ یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اپنے کمرے سے نکل کر میں نے ڈیوٹی روم کا رخ کیا۔ ٹی وی اسکرین پر چین کے کمرے کا منظر تھا اور عثمانی کی نگاہ اسکرین ہی پر تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ میری طرف مڑا۔ میں نے ٹی وی بند کرنے کا اشارہ کیا۔ اس نے فوراً ٹیلی ویژن بند کر دیا۔ میں اسکرین پر دیکھ چکی تھی کہ چین کھانا کھا کر پانی پی رہی تھی۔

میں نے مختصر عثمانی کو اپنے اور موشروف کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور بولی۔ ”زندگی میں پہلی بار اپنے کسی حریف سے میں نے اس طرح کا معاہدہ کیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اس بارے میں؟ کیا میرا یہ اقدام درست ہے؟ اور کیا واقعی موشروف اپنے عہد پر قائم رہے گا؟“
 ”حالات و واقعات کے پیش نظر یہ معاملہ عجیب تو ضرور ہے مگر آپ کے اقدام کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔“ عثمانی نے اپنی رائے دی۔

”عثمانی! تم اپنی جگہ یہاں سیل کے کسی اور سینئر رکن کو بٹھا کر خود چین کو اس کوٹھی تک پہنچاؤ گے!“ میں نے اسے ہدایت دی۔ ”تم چاہو تو اپنی معاونت کے لئے سیل کے کسی اور رکن کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہو۔ تیاری کے لئے میں تمہیں صرف پندرہ منٹ دوں گی۔ پندرہ منٹ بعد تم چین کے کمرے میں آ جاؤ گے۔ وہ تمہیں بے ہوشی کی حالت میں ملے گی۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ جس حالت میں اسے یہاں لایا گیا تھا اسی میں یہاں سے لے جایا جائے! میں اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی.....! اور ہاں چین اور موشروف کے پاسپورٹ کے علاوہ جوان کے دیگر ضروری کاغذات ہیں وہ بھی میرے حوالے کر دو۔ وہ پاسپورٹ اور کاغذات بھی چین کے سپرد کر دوں گی کہ وہ انہیں بھی اپنے اٹیچی کیس میں رکھ لے۔“

پھر عثمانی سیل کے ریکارڈ روم سے وہ کاغذات اور پاسپورٹ لے آیا اور میرے سپرد کر دیئے۔ اس کے بعد وہ بولا۔ ”چین کے کمرے کی چابی وہیں متین مخافتوں کے پاس ہے۔“
 میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈیوٹی روم سے نکل آئی۔

جب کچھ دیر بعد میں چین کے کمرے میں پہنچی تو وہ کافی کی چسکیاں لے رہی تھی۔
 ”جلدی سے کافی پی کر لباس تبدیل کر لو چین.....! تمہیں مبارک ہو کہ تم اب سے کچھ دیر بعد اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاؤ گی۔“

اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ مزید حسین نظر آنے لگی۔ ”کیا موشروف سے آپ کی بات ہو گئی مس خان؟“

”ہاں چین.....! اس نے کھلے دل سے میرے مقابل اپنی شکست قبول کر لی۔ صحت یاب ہونے کے بعد تمہیں وہ یہاں سے لے کر چلا جائے گا۔“ میں نے اسے بتایا پھر پاسپورٹ اور کاغذات

”اتنا سمجھ لو موشروف کہ میں نے یہ فیصلہ تم سے دب کر یا خوف زدہ ہو کر نہیں کیا۔ تمہیں شاید علم ہو کہ میں بھی تمہاری طرح غیر معمولی ذہن کی مالک ہوں اور یہ کہ میری معلومات کے ذرائع بھی حیرت انگیز ہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اب تم صرف اپنی انا کی خاطر میری شکست چاہتے تھے اور تمہاری حکومت کو مجھ میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔“

”حیرت انگیز.....! واقعی حیرت انگیز! اس لئے کہ ان باتوں کا علم تو میرے سوا چین کو بھی نہیں تھا پر یہ کس طرح آپ کو معلوم ہو گئی! یہ واقعی میرے لئے تعجب خیز بات ہے۔“ موشروف کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

”خیر اب یہ بتاؤ کہ تم دھوکا تو نہیں دو گے مجھے؟“ میں بول اٹھی۔

”دھوکا.....! کیسا دھوکا عذرا خان؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ اپنے وعدے کے مطابق چین کی رہائی کے بعد میرے معاملے سے ہاتھ کھینچ لو گے نا؟“

”آپ کو تو خود ہی سب کچھ معلوم ہو چکا ہے کہ اس معاملے میں اب میری حکومت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں۔ ہاں یہ دباؤ ضرور ڈالا جا رہا ہے کہ اس معاملے کو پرو لاگ نہ کیا جائے! میں نے کچھ مہلت چاہی تھی جو مل گئی تھی لیکن اب میں کھلے دل سے آپ کے مقابل اپنی پسپائی تسلیم کرتا ہوں۔ شاید میری زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع ہو کہ میں نے خود شکست قبول کر لی ہو۔“

”کبھی بھی دل کے ہاتھوں آدمی اتنا ہی مجبور ہو جاتا ہے موشروف! تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ عورت کی خاطر سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ تمہیں تمہارا عشق مبارک ہو! بولو چین کو میں کہاں بھیجوں؟“

”آپ اسے جہاں سے لائی تھیں وہیں پہنچا دیں.....! خود میں بھی اب یہاں سے وہیں جاؤں گا۔ اسی کے ساتھ آپ سے میں چند دن کی اور مہلت چاہوں گا! جب تک میں مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتا یہاں آپ کے ملک سے نہیں جا سکوں گا۔ کیا آپ مجھے چند دن کی یہ مہلت دے سکتی ہیں؟“ موشروف عاجزانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”کیوں نہیں موشروف.....! دراصل مجھے تمہارے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ اجازت اور مہلت تمہیں اسی صورت میں دی جا رہی ہے کہ تم میرے یا میرے ملک کے خلاف کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤ.....! اگر اب بھی تم نے ایسا کیا تو اس کی تمام تر ذمہ داری خود تمہی پر ہوگی!“

”یقین کریں عذرا خان کہ آپ کو میری طرف سے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ دیکھیں گی کہ موشروف محسن کش نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ زندگی کے کسی اور موڑ پر ہماری ملاقات ہو ایسی صورت میں آپ موشروف کو اپنا مخلص دوست اور وفادار ہی پائیں گی!“ اس کی آواز میں خلوص تھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے موشروف.....! اب سے ایک گھنٹے کے بعد یا ایک گھنٹے کے اندر اندر چین کو اسی کوٹھی میں پہنچا دیا جائے گا جہاں سے میں اسے لے کر آئی تھی اور کچھ؟“

”جی نہیں! میرے لئے یہی سب کچھ ہے۔ ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور

کوئی اعتراض تو نہیں! کیا خبر پھر کبھی تم سے ملاقات ہو یا نہ ہو!

میر بات سن کر وہ فوراً گرم جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے قریب آ گئی۔

میں نے اس کی روشن اور حسین پیشانی پر بوسہ دیا پھر آہستہ سے بولی۔ ”اس آخری بوسے اور

آخری جسارت کے لئے مجھے معاف کر دینا جین کہ یہ میری مجبوری تھی!“ اسی کے ساتھ میرا ایک نیا سلاہتہ جین کی دائیں کپٹنی پر پڑا اور وہ حیران حیران سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔ میں نے دراصل پیشانی پر بوسہ دینے ہی کے بہانے اسے اپنے قریب بلایا تھا ورنہ وہ کھٹک جاتی اور میں اسے اتنی آسانی سے بے ہوش نہ کر پاتی۔ میں نے جین کے بے ہوش جسم کو مسہری پر ڈال دیا۔

جین کے کمرے میں آئے ہوئے مجھے اب تقریباً پندرہ منٹ ہونے والے تھے۔ میں نے عثمانی کو پندرہ منٹ ہی کا وقت دیا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد عثمانی کمرے میں داخل ہوا اور پھر اس نے میرے اشارے پر جین کے بے ہوش جسم کو مسہری سے اٹھا لیا۔ اس کے ساتھ سیل کا ایک اور رکن بھی تھا۔

کچھ ہی دیر میں ایک سیاہ بندوین آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہو گئی۔ عثمانی احتیاطاً وین کے عقبی حصے میں جین کے ساتھ تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سیل کا دوسرا رکن تھا۔

جین کو رخصت کر کے میں اپنے کمرے میں آ گئی اور پی آئی اے انکوائری کا ٹیلی فون نمبر ملا یا۔ انکوائری سے مجھے معلوم ہوا کہ آئندہ شب ڈھاکہ کے لئے روانہ ہونے والی ایک فلائٹ میں مجھے سیٹ مل سکتی ہے۔ عثمانی جب جین کو چھوڑ کر آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ گیا تو میں نے کل رات کی فلائٹ سے سیٹ کی بکنگ کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے آکر بتایا کہ وہ کوٹھی ویران ہی پڑی تھی جب وہ جین کو لے کر وہاں پہنچا۔ جین کو وہ بے ہوشی کی حالت ہی میں اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت تک یا تو موٹوروف وہاں نہیں پہنچ سکا تھا یا اگر وہاں پہنچ چکا تھا تو اس نے سامنے آنے سے گریز کیا تھا۔

دوسرے دن شام ٹھیک پانچ بجے میں اپنی کوٹھی میں محترم وزیر داخلہ کے فون کی منتظر تھی۔ وقت مقررہ پر فون کی کھنٹی بج اٹھی اور میں نے جلدی سے ریسپور اٹھا لیا۔ دوسری جانب میری متوقع شخصیت ہی تھی۔ سلام لینے اور دعا دینے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

”میں آج ہی رات کی ایک فلائٹ سے ڈھاکہ روانہ ہو رہی ہوں۔“ میں جواباً بولی۔ ”آپ کا حکم بھلا میں کس طرح نال سکتی ہوں!“

”ویری گڈ!“ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ”مجھے تم سے یہی امید تھی۔ وہاں پہنچ کر تم صوبائی ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے پہلے ملنا تاکہ تمہیں یہ علم ہو سکے کہ اب تک پولیس انٹیلی جنس اور حکومت کے دوسرے اداروں نے امریکی تخریب کاروں سے شہنشاہ کے لئے کیا کیا کارروائیاں کی ہیں اور یہ کہ وہ مشرقی پاکستان کے کون سے علاقے میں زیادہ سرگرم عمل ہیں! اس سے یقیناً تمہیں آگے بڑھنے میں آسانی ہوگی۔ حکومت کے تمام ادارے تمہارے ساتھ ہر مرحلے پر پورا تعاون کریں گے بشرطیکہ تم یہ

اس کی طرف بڑھا دیئے۔“ یہ بھی تم اپنے ساتھ لے جاؤ! یہ تمہارے اور موٹوروف کے پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات ہیں۔ انہیں سنبھال کر احتیاط سے اپنے اٹیچی کیس میں رکھ لو! میں نہیں چاہتی کہ پاکستان سے روانگی میں تم لوگوں کو کسی قسم کی تاخیر یا دشواری ہو!“

”ٹھیک یوسوچ مس عذرا خان!“ اس نے مجھ سے پاسپورٹ اور کاغذات لے لئے پھر کافی کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”شاید میں زندگی بھر آپ کو نہیں بھول سکوں گی مس خان! آپ جیسی کوئی خاتون پہلے کبھی میری نظر سے نہیں گزری۔“

”اور جین تم بھی مجھے یاد رہو گی تم جیسی بظاہر معصوم لیکن انتہائی خطرناک لڑکی بھی اس سے پہلے

میں نے نہیں دیکھی۔“

جواباً وہ صرف مسکرا دی اور پھر الماری سے اپنا اٹیچی کیس نکال کر اس میں پاسپورٹ اور کاغذات رکھنے لگی۔ اس کے بعد وہ اٹیچی کیس سے اپنا ایک جوڑا نکال کر ہاتھ روم کی طرف چلی گئی۔ میں اس کے انتظار میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

جلد ہی لباس تبدیل کر کے جین ہاتھ روم سے باہر آ گئی۔ ریشمی گاؤن اس کے ایک ہاتھ پر لٹکا ہوا تھا جو وہ اس سے پہلے پہنے ہوئے تھی۔

”ایک افسوس بہر حال رہے گا۔“ جین اپنے اٹیچی کیس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی جو اس نے الماری سے نکال کر میز پر رکھ دیا تھا۔

”کس بات کا افسوس؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”موٹوروف کو محض میری وجہ سے شکست قبول کرنا پڑی۔“ وہ اٹیچی کیس میں اپنا ریشمی گاؤن

رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”صرف تمہاری ہی وجہ سے نہیں میری وجہ سے بھی جین!“ میں ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں اس

کے قابو میں آنے والی شے نہیں تھی۔“

”ہاں یہی ہے!“ وہ بھی ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ ”کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی؟ موٹوروف

نے مجھے کہاں پہنچانے کو کہا ہے؟“

”تمہارے ساتھ میرا جانا کچھ ایسا ضروری نہیں!..... پھر کیا خبر مجھے قریب دیکھ کر موٹوروف کا

ارادہ بدل جائے!..... اور وہ پھر مجھے زیر دام لانے کی خواہش کرنے لگے اس لئے تمہارے ساتھ میرا نہ

جانا ہی بہتر ہے۔ تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ تمہیں میں جہاں سے لائی تھی وہیں پہنچنا دول

گی۔ اس سلسلے میں موٹوروف سے میری بات ہو چکی ہے۔ خود موٹوروف بھی ہاتھ آئی لینڈ سے۔ اسی کوٹھی میں منتقل ہو رہا ہے ممکن ہے کہ جب تم وہاں پہنچو تو وہ تمہیں اپنا منتظر ملے۔“

جین اس دوران میں اپنا تمام سامان اٹیچی کیس میں رکھ چکی تھی اور اپنی دانست میں چلنے کے لئے بالکل تیار تھی۔

”جین! تمہیں رخصت کرنے سے پہلے میں تمہاری پیشانی پر آخری بوسہ دینا چاہتی ہوں تمہیں

تعاون قبول کرو!“

”بہتر ہے..... میں ڈھا کہ پہنچ کر آپ کی ہدایت کے مطابق پہلے صوبائی ہوم سیکرٹری ہی سے ملوں گی۔ میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے گا!“

”ضرور! تم جس مشن پر اور جس نیک مقصد کے تحت یہاں سے جا رہی ہو وہ قابل ستائش ہے۔ خدا اپنے ایسے نیک بندوں کی مدد ضرور کرتا ہے۔ میں آج ہی مشرقی پاکستان کی انتظامیہ کے نام احکام جاری کر دوں گا اور فون پر چودھری سے بھی بات کر لوں گا کہ وہ تم سے ہر ممکن تعاون کرے۔“

”شکر یہ محترم!“ میں نے کہا۔ ”اور کوئی حکم۔“

”بس یہی حکم ہے کہ آئندہ تم یہ لفظ حکم استعمال نہیں کرو گی! خدا حافظ!“ ان الفاظ کے ساتھ ہی ٹیلی فون لائن بے جان ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اطلاعات کے مطابق میرے حریف سولوں کو ڈھا کہ میں دیکھا گیا تھا مگر قانون نافذ کرنے والے ادارے اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ سولوں اور اس کے ساتھی امریکی ایجنٹوں کے عزائم نہ مجھ سے ڈھکے چھپے تھے نہ حکومت وقت سے۔ مغربی پاکستان میں میرے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سولوں اب مشرقی پاکستان کو اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ میرے ملک کا یہ حصہ اپنے کل وقوع، سیاسی حالات اور غربت کے سبب اس کے لئے خاصا سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔

میرے لیے مشرقی پاکستان نیا نہیں تھا۔ پہلے بھی میں متعدد بار یہاں آ چکی تھی۔ چائنگام سے جیسور تک یہاں کے سارے ہی اہم شہر میرے دیکھے بھالے تھے۔ یہاں مجھے اپنے حریفوں سے نبرد آزما ہونے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اب سے تین سال پہلے جب میں ڈھا کہ آئی تھی تو سوچا تھا کہ یہاں بھی آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر کی ایک شاخ قائم کر دوں مگر مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ہاں اس ضمن میں کچھ لوگوں سے میری ابتدائی گفتگو ضرور ہو گئی تھی۔ انہی لوگوں میں سے ایک پر جوش نوجوان بابر تھا۔ وہ ایک محبت وطن اور مہم جو قسم کا نوجوان تھا۔ اس نے ڈھا کہ میں اپنے طور پر ایک چھوٹی تنظیم کی داغ بیل ڈالی تھی جس کے ارکان اس کے دوست احباب تھے۔ اس تنظیم کا مقصد بھی علم و پیش وہی تھا جس کیلئے میں نے آپریشن سیل ہیڈ کوارٹر قائم کیا تھا۔ وسائل نہ ہونے کے سبب بابر ناکام رہا تھا۔ اس ناکامی کی بڑی وجہ وہ سماج دشمن عناصر بھی تھے جن کے خلاف بابر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ بابر یوپی کے شہر بریلی کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا خاندان بریلی سے ہجرت کر کے ڈھا کہ میں آیا تھا۔ اس خاندان نے ڈھا کہ میں بھی عزت و شہرت حاصل کر لی تھی۔ بابر کے والد کا شمار ڈھا کہ کے بڑے کاروباری لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بابر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کاروبار میں ان کا ہاتھ بنائے مگر بابر کے دل و دماغ میں کچھ اور ہی سائی ہوئی تھی۔ بابر کے والد مشیر احمد خاں سے میرے تجارتی مراسم تھے۔ انہی کے ذریعے بابر سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ ڈھا کہ کے دوران قیام میں بابر اپنے نظریات و خیالات کے سبب مجھ سے خاصا قریب ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر زندگی نے کبھی مہلت دی تو اس کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں اس کی مدد ضرور کروں گی۔ ایک طویل عرصے کے بعد اب میں پھر ڈھا کہ جا رہی تھی تو مجھے بابر یاد آ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے ایک آدھ خط بھی لکھا تھا، مگر میں اپنی مصروفیت کے سبب جواب نہیں دے سکی تھی۔ بابر اب بھی ویسا ہی تھا، یا اس کے نظریات بدل گئے تھے، میں لاعلم تھی۔

ڈھا کہ پہنچ کر میں اس سے بہر حال ملنا ضرور چاہتی تھی۔

طور پر ٹیکسی ڈرائیور پہلے ہی سے کسی ایسی صورت حال کیلئے تیار تھا اس لئے اس نے فوراً بریک لگا دیئے اور ٹیکسی رگ گئی۔

ٹیکسی رکتے ہی وہ تینوں کار سے اتر آئے تھے اور اب ٹیکسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان تینوں ہی کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

ان میں سے وہی جو کار ڈرائیور کر رہا تھا، ٹیکسی والے سے قریب آ کر مخاطب ہوا۔ ”ان محترمہ کا سامان ہماری کار میں رکھ دوئے ہماری مہمان ہیں۔ کرایہ ہم سے لے لو۔“ پھر وہ ذرا سا جھک کر میری طرف متوجہ ہوا۔ ”محترمہ! آپ خود اس ٹیکسی سے اتر کر کار میں بیٹھ جائیں گی یا پھر یہ خدمت مجھے انجام دینا پڑے گی؟“ لفظ ”خدمت“ پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔

”تم لوگوں کو زحمت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ ”میں خود ہی تم لوگوں کی خدمت کرنے پر راضی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ میں نے ان کے چہروں پر حیرت کے آثار دیکھے تھے۔ شاید انہیں مجھ سے یہ توقع ہوگی کہ میں اپنی جاں بخشی کیلئے ان سے التجا میں کروں گی۔

مجھے ٹیکسی سے اتر کر اور ان لوگوں کے مقابل آتے دیکھ کر یقیناً ٹیکسی ڈرائیور کا حوصلہ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ بھی اسی لیے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا، مگر وہ جرات اسے مہنگی پڑی۔ چشمے والے نے اچھل کر اس کے پیٹ پر لات ماری اور وہ چیختے ہوئے اپنا پیٹ پکڑ کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

ان کی طرف سے پہل ہو چکی تھی اس لیے میں نے مزید دیر نہیں کی۔ پہلے میں نے چشمے والے ہی کو سبق دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ میری طرف ہاتھ اٹھا کر اپنے ساتھیوں کو حکم دے رہا تھا۔ ”اسے اٹھا کر کار میں ڈال لو۔“

اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ آگے بڑھ کر میں نے اس کے منہ پر بچ مارا اور اس کا منہ دوسری طرف پھر گیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اس کا اوپری ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون بہنے لگا۔ اپنے سر براہ کو زخمی دیکھ کر بقیہ دونوں افراد اچانک مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے ایک کی کپٹی پر میرا گھونسا پڑا اور وہ لہرا کر زمین یوں ہو گیا، دوسرے کے پیٹ پر میرے گھٹنے کی ضرب پڑی اور وہ بھی چیخا ہوا جھٹکے لگا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر چشمے والے نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میں تیزی کے ساتھ دائیں جانب ہٹ گئی۔ وہ اپنے ہی زور میں منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ پھر میں نے ان تینوں ہی کو لاتوں پر رکھ لیا۔ میں انہیں ایسا سبق دینا چاہتی تھی کہ آئندہ وہ کسی ایسی عورت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ اس دوران ٹیکسی والا اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں دنیا کا آنکھواں عجوبہ ہوں۔ اس نے شاید اپنی زندگی میں پہلی بار ایک عورت کو تین مردوں پر یوں حاوی آتے دیکھا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ تینوں اس قابل نہیں رہے تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے۔ ان میں سے ایک شاید بیہوش ہو چکا تھا۔ لڑائی بھڑائی کے دوران میں انہی میں سے کسی کا پرس سڑک کے کنارے گر گیا تھا اور شاید اسی پرس میں سے وہ تصویر بھی نکل کر باہر گر گئی تھی جس نے مجھے چونک اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ تصویر میری تھی۔

زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اس شب بابر کے علاوہ بھی اور بہت سے چہرے بہت سے منظر میری چشم تصور میں ابھرتے رہے پھر انہی چہروں اور انہی منظروں کی دھوپ چھاؤں میں سفر تمام ہو گیا۔ میں جہاز کی سیڑھیوں سے اتر رہی تھی تو صبح کا اجالا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ بنگال کی فرحت بخش ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی میں بس میں آ بیٹھی۔

جلد ہی ضروری کارروائی سے فارغ ہو کر میں باہر نکل آئی۔ میرے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک ایر بیگ تھا جو میں نے شانے سے لٹکا رکھا تھا، اس کے علاوہ ایک سوٹ کیس تھا جو ایک پورٹر نے اٹھا رکھا تھا۔ میرا ارادہ ایئر پورٹ روڈ ہی کے ایک ہوٹل میں قیام کا تھا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد اس ہوٹل کی جگہ ایک ہسپتال بنا دیا گیا ہے۔ ایئر پورٹ سے اس ہوٹل کا فاصلہ تقریباً دو میل تھا۔ ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر قدم رکھتے ہی کئی ٹیکسی والے میری طرف لپکے۔ پھر انہی میں سے ایک نے پورٹر سے میرا سوٹ کیس لے لیا۔ بقیہ ٹیکسی والے دوسرے مسافروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میرے اشارے پر پورٹر نے سوٹ کیس اس ٹیکسی ڈرائیور کے حوالے کر دیا تھا۔ اپنا ایر بیگ بھی میں نے ٹیکسی والے کے سپرد کر دیا۔ اس نے ٹیکسی کی ڈکی کھول کر سوٹ کیس اور ایر بیگ رکھ دیا۔ اسی دوران میں اسے میں نے بتا دیا کہ کہاں چلنا ہے اور پورٹر کو بھی پیسے دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد میں ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ڈکی لاک کر کے ٹیکسی ڈرائیور بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور پھر دوسرے ہی لمحے ٹیکسی شارٹ ہو گئی۔

ٹیکسی کے آگے بڑھتے ہی میں نے یوں ہی سرسری طور پر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ٹیکسیوں کے علاوہ ادھر ادھر پر انیویٹ کاریں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک نیلے رنگ کی کار میری ٹیکسی کے ساتھ ساتھ ہی شارٹ ہوئی۔ اسے ایک متوسط عمر کا شخص ڈرائیور کر رہا تھا۔ اس شخص پر یوں بھی میری نگاہ پڑی کہ وہ میری ہی طرف متوجہ تھا۔ کار میں اس کے علاوہ پچھلی سیٹ پر دو افراد اور بھی تھے۔ کار ڈرائیور کرنے والے کی آنکھوں پر سیاہ شیشوں کا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں کوئی نوٹس نہ لیتی۔ اپنے حلقے اور انداز و اطوار سے وہ اچھے لوگ معلوم نہیں ہو رہے تھے۔

ڈرائیور دیر کے بعد مجھے یہ احساس ہو گیا کہ نیلی کار میری ٹیکسی کا تعاقب کر رہی ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی غالباً سمجھ گیا کہ ٹیکسی کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ بار بار عقبی آئینے پر نگاہ ڈال رہا تھا۔

میری منزل شاہ باغ ہوٹل ابھی دور تھی کہ اچانک پیچھے آنے والی کار کی رفتار تیز ہو گئی۔ شاید وہ لوگ ٹیکسی سے آگے نکل کر اسے روک لینا چاہتے تھے۔ درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا۔ ڈرائیور کے چہرے پر میں نے سراسیمگی کے آثار دیکھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی ٹیکسی کی رفتار بڑھا رہا ہے۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”وہ لوگ آگے نکلنا چاہتے ہیں، انہیں راستہ دے دو۔“

ٹیکسی ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ٹیکسی کو ایک طرف کر لیا۔ پیچھے آنے والی کار تیزی سے آگے نکل کر میری توقع کے عین مطابق سڑک پر ترچھی کھڑی ہو گئی جس سے راستہ مسدود ہو گیا۔ دہنی

میرا ارادہ تھا کہ ان لوگوں کو وہیں اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو جاؤں گی۔ میرے نزدیک وہ معمولی قسم کے غنڈے تھے جو مجھے تنہا دیکھ کر ایئر پورٹ سے میرے پیچھے لگ گئے تھے لیکن اپنی تصویر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جو کچھ ہوا تھا، اتفاقی نہیں بلکہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنی تصویر اٹھالی اور پھر حملہ آوروں میں سے ایک کے قریب پہنچ کر غرائی۔ ”بولو یہ تصویر تمہیں کہاں سے ملی؟“ یہ کہتے ہوئے میں بیٹھ گئی اور اس شخص کے سر کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر انہیں جھک دیا۔

”مجھے..... مجھ کو کچھ نہیں معلوم..... یہ..... یہ تصویر اس..... کے پاس تھی۔“ اس شخص نے کراہتے ہوئے کچھ فاصلے پر پڑے ہوئے اپنے بیہوش ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

بیہوش ہونے والا ان غنڈوں کا سربراہ تھا، وہی چشمے والا جو کار چلا رہا تھا۔ میں نے کراہتے ہوئے اس شخص کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ پھر اس کے دوسرے زخمی ساتھی نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ چشمے والے کے ہوش میں آنے کا انتظار فضول ہی تھا۔ معلوم نہیں اسے کب ہوش آتا۔ کچھ سوچ کر میں نے اس کا پرس اٹھا لیا اور پھر اس کی جیبوں کی تلاشی لے کر جو بھی ملا اسے ایک رومال میں باندھ کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا۔

اب وہاں مزید رکنا کارآمد نہیں تھا۔ یہی سوچ کر میں نے ٹیکسی والے کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اسی کے ساتھ نیلی کار کے نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیے۔

ذرا ہی دیر بعد ٹیکسی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ڈھاکہ پہنچتے ہی جس انداز سے میرا استقبال ہوا تھا، میرے لیے حیران کن تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ کوئی میرے ڈھاکہ پہنچنے کا منتظر تھا۔ ڈھاکہ میں کون میرا منتظر ہو سکتا تھا، میرے لیے یہ سمجھنا بعید از قیاس تھا کیوں کہ وزیر داخلہ اور آپریشن سیل کے ارکان کے سوا کسی کو بھی میری ڈھاکہ روانگی کا علم نہیں تھا۔ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر پہلے سے کچھ لوگوں کا میرا منتظر ہونا اس بات کا ثبوت تھا کہ کچھ افراد کو حتیٰ طور پر میرے پروگرام کا علم تھا۔ میں انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ ٹیکسی شاہ باغ ہوٹل کے صدر دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ میں چونک اٹھی اور پھر ٹیکسی سے اتر آئی۔

ٹیکسی رکستے ہی ہوٹل کا ایک پورٹر قریب آ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ڈکی کھول دی۔ پورٹر نے ڈکی سے میرا سوٹ کیس اور ایئر بیگ نکال لیا پھر ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر کے میں پورٹر کے ساتھ ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

ہوٹل کی دوسری منزل پر مجھے ایک کمرہ بہ آسانی مل گیا۔ سفر بہر حال سفر ہوتا ہے، چاہے ہوائی جہاز ہی کا کیوں نہ ہو۔ میں نے ناشتہ کمرے ہی میں کیا اور پھر آرام کرنے کیلئے بستر پر دراز ہو گئی۔ فی الحال میں نے ہر خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ ابھی تک میں نے پرس اور اس سامان کا جائزہ بھی نہیں لیا تھا جو حملہ آوروں میں سے ایک کا تھا۔

کچھ دیر کو میری آنکھ لگ گئی، جب میں اٹھی تو سوادس بج رہے تھے۔ میں باتھ روم میں گھس گئی

اور غسل کر کے لباس تبدیل کر لیا، پھر چائے منگوا لیا۔ کچھ دیر سو لینے اور پھر غسل کرنے سے میری تھکن اتر گئی تھی۔ چائے پینے کے دوران میں اپنے ہینڈ بیگ سے میں نے حملہ آور کا پرس اور دوسرا سامان نکال لیا۔ اسی میں میری تصویر بھی تھی۔ اس پرس اور سامان کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ حملہ آور کا نام اکبر تھا اور وہ کسی شخص سیود مگر جی کا آلہ کار تھا۔ مجھے اس کے پرس سے سیو مگر جی کا ایک تحریری پیغام بھی ملا تھا جو انگریزی میں لکھا تھا۔ مگر جی نے اس فلائٹ کا نمبر اور وقت لکھا تھا جس سے میں ڈھاکہ پہنچ رہی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ شناخت کیلئے وہ میری ایک تصویر بھی بھیج رہا ہے۔ اس پیغام کے مطابق اکبر اور اس کے ساتھیوں کو مجھے اغوا کر کے دھان منڈی کی ایک کونٹھی میں پہنچانا تھا۔ اس کے بعد آج رات گرین کلب میں سیود مگر جی سے مل کر اپنا ”مفتاح“ وصول کرنا تھا۔

سیود مگر جی میرے لیے ایک بالکل اجنبی نام تھا۔ اب سے پہلے نہ میں کبھی اس سے ملی تھی اور نہ ہی میں نے اس کا نام سنا تھا۔ میں حیران تھی کہ اسے اس فلائٹ کا علم کس طرح ہو گیا جس سے میں ڈھاکہ پہنچ رہی تھی؟ پھر یہ کہ میری تصویر اس کے پاس کہاں سے آ گئی؟ ان سوالوں کا فی الحال میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر مگر جی کسی سبب مجھے اغوا کرانا چاہتا تھا اور ایک بار اپنی اس کوشش میں ناکام ہو چکا تھا تو دوبارہ بھی وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ دھان منڈی کی جس کونٹھی میں مجھے اغوا کر کے پہنچایا جاتا تھا، اس کا نمبر بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ اب میں ڈھاکہ آ رہی تھی اور اپنے دیرینہ حریفوں کے علاوہ نئے حریفوں سے بھی نمٹنا ہی تھا۔ مجھے زیر دام لانے کی خاطر انہیں بہر حال سامنے آنا ہی پڑتا۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ اس حرکت کا مقصد وقتی طور پر مجھے الجھانا بھی ہو سکتا ہے تاکہ میں جس مقصد سے ڈھاکہ آئی ہوں اس پر توجہ نہ دے سکوں۔

محترم وزیر داخلہ کی ہدایت پر ڈھاکہ پہنچنے کے بعد مجھے صوبائی ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے ملنا تھا۔ میں نے پہلے اسی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہوم سیکرٹری کے دفاتر گرین روڈ پر ہیں۔ میں نے سوچا کہ پہلے فون پر ہوم سیکرٹری کو اپنی آمد سے مطلع کر دوں۔ میرے سلسلے میں یقیناً اب تک محترم وزیر داخلہ کی طرف سے انہیں ہدایات مل چکی ہوں گی۔

ہوٹل کے کمرے میں فون تو تھا مگر ڈائریکٹ نہیں۔ اس کے علاوہ وہاں ٹیلی فون ڈائریکٹری بھی نہیں تھی۔ میں نے ریسپورڈنٹ اٹھا کر ہوٹل کی ٹیلی فون آپریٹر سے رابطہ قائم کیا اور اپنا روم نمبر بتا کر بولی۔ ”یا تو آپ خود میرا مطلوبہ نمبر ڈھونڈ کر اس نمبر پر میری بات کرادیں یا ٹیلی فون ڈائریکٹری میرے کمرے میں بھجوادیں۔“

”آپ بتائیے کس کا نمبر چاہئے۔ میں نمبر خود تلاش کر کے ملا دوں گی۔ آپ کس سے بات کریں گی؟“ آپریٹر نے نرم اور مہذب لہجے میں کہا۔

”مجھے ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے بات کرنا ہے۔ آپ انہیں میرا نام بتا سکتی ہیں۔ عذرا خان نام ہے میرا۔“

”ہوم سیکرٹری!“ آپریٹر کے لہجے میں حیرت تھی اور لہجہ تصدیق طلب سا تھا۔

”ہاں مجھے انہی سے بات کرنا ہے۔“ میں نے تصدیق کر دی۔

خلاف توقع پھر بج اٹھی۔ میں نے ریسور اٹھا لیا پھر جب آپریٹر نے مجھے بتایا کہ فون پر ایک شخص سیود مکر جی مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے تو میں چونک اٹھی۔

”کیا آپ بات کریں گی؟“ آپریٹر نے مجھے چپ دیکھ کر سوال کیا۔

”ہاں..... ہاں بات کراؤ۔“ میں نے سنبھل کر کہا۔ دوسرے ہی لمحے فون پر ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ وہ شخص انگریزی میں مجھ سے مخاطب تھا۔ ”سیود مکر جی آپ کو ڈھاکہ میں خوش آمدید کہتا ہے عذرا خان۔“

”مگر میں تو تمہیں نہیں جانتی۔“ میں نے پرسکون آواز میں کہا۔

”اگر نہیں جانتیں تو کیا ہوا؟ اب جان جائیں گی۔ مجھے افسوس ہے عذرا خان کہ ڈھاکہ پہنچنے کے بعد فوری طور پر آپ میری مہمان نہیں بن سکیں۔ میرے آدمیوں کی حفاظت کی وجہ سے آپ کو ہوٹل ٹھہرنا پڑا۔ پھر بھی بہت جلد مجھے آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہو جائے گا شاید آج ہی۔“

”تو یہ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“ میرے لہجے میں سختی آگئی۔

”یہ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔“

”مگر تم چاہتے کیا ہو مجھ سے؟“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”دبی جو خوب صورت عورتوں سے چاہا جاسکتا ہے۔“ اس کا لہجہ مبتدل تھا۔

”ایڈیٹ!“ مجھے غصہ آ گیا۔ ”اگر تم میں ہمت ہے تو سامنے آ کر بات کرو..... یوں کسی

چوہے کی طرح بل میں گھس کر کیوں بیٹھے ہو۔“

”خیر آپ کے سامنے تو آنا ہی پڑے گا۔ فی الحال تو میں آپ کی سریلی اور میٹھی آواز سننا چاہتا

تھا۔ دیکھ لیں دل سے دل کو راہ ہوتی ہے..... میں نے کس طرح آپ کو تلاش کر لیا۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔

”یہ کوئی کمال نہیں کیا تم نے۔“ میں مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولی۔ ”جب میں

ایئر پورٹ سے ٹیکسی لے کر ہوٹل کیلئے چلی تھی تو تمہارے آدمی میرے ارد گرد موجود تھے۔ تمہیں انہی سے

معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں.....“

”بہت عمدہ..... واقعی آپ کا اندازہ درست ہے۔“ اس نے میری تعریف کی۔ ”ویسے آپ

نے میرے آدمیوں پر بہت ظلم کیا۔ ان میں سے ایک کی کلائی ٹوٹ گئی ہے۔“

”اس کے باوجود تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم نے سبق حاصل نہیں کیا۔ اس واقعہ سے میں

تمہارے ہاتھ پاؤں بھی تو توڑ سکتی ہوں۔“

”بنگال میں ابھی کوئی ایسا پیدا نہیں ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں توڑ سکے۔“ اس کے لہجے میں تلخی

آ گئی۔ ”میرا نام سیود مکر جی ہے عذرا خان۔ آپ ابھی مجھے جانتی نہیں۔“

”مگر میں بنگال میں پیدا نہیں ہوئی سمجھے۔ مجھے تمہارے ہاتھ پاؤں توڑتے ہوئے کوئی افسوس

نہیں ہو گا۔ ویسے تمہاری اطلاع کیلئے عرض کر دوں کہ میں بہت جلد خود ہی دھان منڈی کی اس کوٹھی تک

پہنچ جاؤں گی جہاں مجھے پہچانے کیلئے تم نے اکبر کو حکم دیا تھا۔“ میرے لہجے میں چھینٹھی۔

میری بات پر دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ غالباً سیود مکر جی کے لیے میری بات

”میں نمبر تلاش کر کے ملاتی ہوں“ آپ انتظار کیجئے۔“

”آپریٹر کی بات سکر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر ریسور کریڈل پر رکھ دیا۔ پھر تقریباً

پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد ٹیلی فون کی ٹھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسور اٹھا لیا۔ دوسری جانب سے مجھے

آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کو کہہ رہی تھی۔

”ہیلو..... میں عذرا خان بول رہی ہوں۔ مجھے عبید الرحمن چودھری صاحب سے بات کرنا

ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں ان کا پی اے بول رہا ہوں میڈم!“ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔ ”آپ

ایک منٹ ہولڈ کیجئے چودھری صاحب دوسرے فون پر کسی سے بات کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے“ میں ہولڈ کرتی ہوں“ تم بات کراؤ۔“

مجھے مزید کچھ دیر انتظار کرنا پڑا اور پھر فون پر ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو چودھری

اسٹیلک۔“

”عذرا خان۔“ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ پھر کہا۔ ”میرے متعلق یقیناً آپ کو.....“

”اوہ یس یس!“ وہ میری بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ ”میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ شاید

آپ آج ہی تشریف لائی ہیں آپ کہاں ٹھہری ہیں۔“

”شاہ باغ ہوٹل میں۔“ میں نے بتایا۔

”ہوٹل میں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی آپ..... میں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں آپ کے قیام

کا.....“

”شکریہ!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں خود کو یہاں سرکاری مہمان سمجھ کر نہیں

آئی..... خیر آپ یہ بتائیں کہ کب مل سکتے ہیں مجھ سے؟“

”جب آپ فرمائیں!“ وہ بولا۔ ”اگر چاہیں تو ابھی آجائیں دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ہی کھا

لیجئے گا۔ اگر آپ حکم کریں تو میں آپ کیلئے گاڑی بھیج دوں؟“

”گاڑی.....“ میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”اچھا ٹھیک ہے“ بھیج دیجئے۔“ پھر میں نے اسے

اپنا روم نمبر بھی بتا دیا۔

”آدھے گھنٹے کے اندر گاڑی پہنچ جائے گی۔“ اس نے بتایا۔

”تھینک یوسر چودھری۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

اگر خود عبید الرحمن چودھری گاڑی بھیجنے کی پیشکش نہ کرتا تو میں شاید اس سے گاڑی کیلئے ہر گونہ

کہتی۔ ڈھاکہ پہنچتے ہی مجھے جو غیر متوقع واقعہ پیش آیا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں ذرا احتیاط سے کام

لوں۔ اگر یہ سہولت مل رہی تھی وہ بھی بغیر کہے کہ ہوٹل سے بہ حفاظت میں سرکاری گاڑی میں ہوم منسٹری

کے دفتر پہنچ سکتی تھی تو پھر اس میں تکلف سے کام لینے کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی۔ لباس میں پہلے

ہی تبدیل کر چکی تھی اور اب مجھے صرف گاڑی کی آمد کا انتظار تھا۔

عبید الرحمن چودھری سے فون پر بات کیے ابھی مجھے دس بارہ منٹ ہوئے تھے کہ ٹیلی فون کی ٹھنٹی

وسکنت پر اسی سبب میری نظر تھی۔
کار نے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ میں نے ڈرائیور کو ڈیش بورڈ کا ایک حصہ کھولتے دیکھا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ میں چونک کر بولی۔
”ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ قہقہہ کرنے لگی۔
”کیا مطلب؟“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ سیود بابو کا انتخاب برا نہیں ہے۔“ اس نے عقی آئینے میں میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
میں تقریباً اچھل پڑی۔ ”تو..... تو تمہیں سیود مگر جی نے بھیجا ہے..... تم ہوم نمٹری سے نہیں آئے؟“

”اس بیچارے غریب ڈرائیور کو تو نہ جانے کب ہوش آئے گا جس سے میں نے یہ وردی زبردستی اتروائی تھی۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے غالباً کوئی مٹن دبا دیا۔

ہلکا سا کھٹکا سنائی دیا اور پھر اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان شیشے کی ایک دیواری جائل ہو گئی۔ ابھی میں سوچ نہیں سکی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، میری قوت شامہ کو بدبوسی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد کار کے پچھلے حصے میں ہلکا ہلکا دھواں سا بھرنے لگا۔ جب تک ممکن ہوا میں نے سانس روکا، مگر کب تک آخر بیہوش کی گیس میرے پیچھے پردوں میں اتر ہی گئی۔ کھانسنے کھانسنے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آنے کے بعد کچھ دیر مجھے یاد ہی نہ آ سکا کہ میں کہاں اور کن حالات سے دوچار ہوں۔ پھر رفتہ رفتہ میرے تمام حواس بیدار ہو گئے۔ مجھے یاد آ گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور شاید اب میں سیود مگر جی کی قید میں ہوں۔ میرے لیے ہوم سیکرٹری نے جو گاڑی بھیجی تھی اس کے ڈرائیور کو ہوش پہنچنے سے پہلے ہی سیود مگر جی کے آدمی نے بیہوش کر دیا تھا اور سرکاری وردی اتروائی تھی، مگر اس بات کا علم سیود مگر جی کو کیسے ہوا کہ میرے لیے گاڑی بھیجی گئی ہے؟ یہ میرے لیے ایک معمہ ہی تھا۔

میں غالباً کسی آرام دہ بستر پر دراز تھی اور میرے ہاتھ پاؤں بھی آزاد تھے۔ میری اطراف تاریکی پھیلی ہوئی تھی جس سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا کہ میں کہاں ہوں۔

چند لمبے بعد اچانک سناٹا ٹوٹا اور میں نے کچھ سرگوشیاں سنیں۔

”سیود! میرا خیال ہے کہ اب اسے ہوش آ گیا ہوگا۔“ یہ کسی عورت کی آواز تھی۔

”ہاں۔“ میں نے جواب میں ایک بھاری اور آشنائی آواز سنی، مگر مجھے یاد نہ آ سکا کہ پہلے یہ آواز میں نے کہاں سنی تھی۔ پھر وہی آواز مزید سنائی دی۔ ”مگر ابھی میں اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا۔“ یہ آواز بہر حال نئی نہیں تھی جو میں نے فون پر سنی تھی۔

”میک اپ کر لو نا! اس میں کیا حرج ہے..... اس نے یوں بھی پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔“ نسوانی آواز بھر آئی۔

”ابھی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“ مردانہ آواز پھر ابھری جو شاید سیود مگر جی کی

خلاف توقع تھی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے گہرا سانس لیا، پھر بولا۔ ”تو آپ اس کوٹھی کے بارے میں بھی جان گئی ہیں۔“

”ہاں.....“ پھر میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ ”اور یہ بھی کہ وہ کوٹھی کس کی ملکیت ہے۔“
”اوہ!“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ”خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کو تو آج ہی میرا مہمان بن جانا ہے۔ جلد ہی ملاقات ہوگی آپ سے۔“ اسی کے ساتھ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے لہجے سے جلد بازی کا اظہار ہو رہا تھا۔

فون پر سیود مگر جی سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے خاص طور پر ایک بات نوٹ کی تھی کہ جیسے وہ آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا ہو مگر یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ جب وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا تو اسے آواز بدل کر بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ دھان منڈی کی وہ کوٹھی اب میری نظر میں اہمیت اختیار کر گئی تھی جہاں مجھے اغوا کر کے پہنچایا جانا تھا۔ یقیناً اس کوٹھی کے ذریعے سیود مگر جی کا کچھ سراغ لگ سکتا تھا ورنہ اس کے لہجے سے تشویش کا اظہار نہ ہوتا۔

سیود مگر جی کا بار بار یہ کہنا کہ مجھے آج ہی اس کا مہمان بن جانا ہے، میرے لیے تشویش اور حیرت کا سبب تھا۔ آخر اس سلسلے میں وہ اتنا پر یقین کیوں تھا؟ یا پھر وہ اس طرح میری خود اعتمادی کو ختم کرنا چاہتا تھا؟ دھان منڈی کی اس کوٹھی کے بارے میں پولیس کے ذریعے بھی معلومات حاصل کرنا آسا نہ تھا، مگر میں براہ راست سیود مگر جی سے نمٹنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری کو کچھ بتانے کا میرا ارادہ نہیں تھا۔

تقریباً پونے گیارہ بجے فون پر ہوم سیکرٹری سے میری بات ہوئی تھی کہ وہ میرے لیے گاڑی بھیج رہا ہے۔ سوا گیارہ بجنے میں دو ایک منٹ باقی تھے کہ فون پر استقبالیہ کلرک نے مجھے مطلع کیا کہ گاڑی آ گئی ہے۔ میں اپنا کمرہ منتقل کر کے نیچے آ گئی۔ وہاں ایک باوردی شخص مجھے اپنا منتظر ملا۔ نہ معلوم کیوں اس شخص کا میرے ذہن پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا جسے ہوم سیکرٹری نے گاڑی دے کر بھیجا تھا کہ مجھے لے آئے۔ میں اس شخص کی رہنمائی میں ہوٹل سے باہر نکل آئی۔ صدر دروازے کے سامنے ہی ایک لمبی سیاہ کار کھڑی تھی۔

ڈرائیور نے میرے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے میں ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ سرکاری گاڑی تو نہیں لگتی۔ اس کی نمبر پلٹ.....“

”یہ صاحب کی اپنی ذاتی کار ہے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

میں ڈرائیور کے جواب سے مطمئن تو نہیں ہوئی مگر پھر بھی کار میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے کار کا دروازہ بند کر دیا اور پھر اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

ڈھاکہ آتے ہی مجھے غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لئے میں بہت چونکا اور محتاط تھی۔ شاید اسی سبب میں اس کار کی نمبر پلٹ پر بھی نگاہ ڈال لی تھی ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کار ایک ہلکے سے جھٹکنے کے ساتھ آگے بڑھ گئی تو میں نے محسوس کیا کہ ڈرائیور عقی آئینے میں میزا جائزہ لے رہا ہے۔ ہر چند کہ ڈرائیور کے جسم پر سرکاری وردی تھی اس کے باوجود وہ مجھے کچھ کھٹک رہا تھا۔ اس کی حرکات

”اس طرح کہ تمہیں یہاں سے رہائی نصیب نہیں ہوگی۔ سمجھ گئیں۔“
 ”آج تک مجھے میری مرضی کے خلاف کوئی اپنی قید میں نہیں رکھ سکا۔ تم شاید مجھ سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔“

”مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔۔۔۔۔ یہ بھی عذرا خان کہ ابھی تک کوئی مرد تمہارے قریب نہیں آ سکا۔ مگر اب۔۔۔۔۔ اب سیود مکر جی کو تم اپنے قریب آنے سے نہیں روک سکو گی۔“
 ”تم اس آڑ میں اپنے اصل مقصد کو چھپانا چاہتے ہو یقیناً تم نے محض اسی لیے مجھے اغوا نہیں کرایا۔ تمہارا اصل مقصد کیا ہے اور یہ کہ تم کس کے اشارے پر راج رہے ہو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“
 میں نے پھر دانستہ ایک ایسی بات کہہ دی جس کا مجھے قطعی علم نہیں تھا۔
 جواباً خلاف توقع مجھے اس کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ”تم اندھیرے میں تیر چلاتی رہو ممکن ہے اسی طرح حقیقت تک پہنچ جاؤ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔“

”تم کہتے ہو تو چلو میں یہ کوشش نہیں کروں گی، مگر تم آخر کب تک سامنے نہیں آؤ گے؟ کب تک پردہ نشیں بنے رہو گے؟ شکنتلا ہی کا مشورہ مان لو، میک اپ کر لو اپنے چہرے پر تاکہ میں تمہاری اصل شکل نہ دیکھ سکوں۔ تم اتنا ڈر کیوں رہے ہو مجھ سے۔۔۔۔۔ میں تو پھر ایک عورت ہوں، کمزور اور بے بس مخلوق۔۔۔۔۔ تم تو مرد ہو پھر مرد بنو نا ڈرتے کیوں ہو کیا میری اس دھمکی سے ڈر گئے ہو کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دوں گی۔۔۔۔۔ تو چلو وعدہ۔۔۔۔۔ پہلی ملاقات میں ایسا نہیں ہوگا۔“

”بکومت عذرا خان۔۔۔۔۔ وہ برہم ہو گیا۔ ”میں تم سے ہرگز نہیں ڈرتا۔“
 ”اگر نہیں ڈرتے تو پھر شکنتلا سے یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ ابھی میرے سامنے جانا نہیں چاہتے؟“

”تم شاید اس طرح مجھے غصہ دلا کر یہ چاہتی ہو کہ میں تمہارے آ جاؤں لیکن۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“
 ”لیکن یہ کہ تم بزدل ہو اور بزدلوں ہی کو غصہ نہیں آتا۔“ میں نے اسے مزید چڑایا۔
 ”اگر۔۔۔۔۔ اگر تم مجھے بزدل ہی سمجھ رہی ہو تو۔۔۔۔۔ تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے عذرا خان۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ میں تمہاری یہ غلط فہمی آج ہی دور کر دوں گا۔“

”زندہ باد!“ میں نے اسے مزید بانس پر چڑھایا۔ ”یہ ہوئی نامردوں والی بات۔“
 اس کے بعد سیود مکر جی کچھ نہیں بولا۔ میں نے کئی بار اسے آوازیں دیں مگر جواب میں خاموشی چھائی رہی۔ اس نے شاید وہ سوچ آف کر دیا تھا جس کے ذریعے کسی اور کمرے میں اس تک میری آواز پہنچ رہی تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہاں سے فرار کی کوئی صورت نہیں تھی۔ کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی جہاں ایک روشن دان نظر آ رہا تھا جو کمرے میں ہوا کے گزرنے کی خاطر تھا۔ اگر کسی طرح اس روشن دان تک بھی میں پہنچ جاتی تو اس کے راستے باہر نکلتا ممکن نہیں تھا۔ روشن دان خاصا چھوٹا تھا۔
 کمرے کا جائزہ لینے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچی کہ جب تک کوئی شخص کمرے کا دروازہ کھول

اصل آواز ہی تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط نہیں تھا کہ فون پر وہ آواز بدل کر بول رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”اس کمرے میں روشنی تو کر دو۔۔۔۔۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ ہے کیسی جس کا اب تک اتنا ناہ سنا ہے۔“ نسوانی آواز میں اشتیاق تھا۔
 ”بظاہر بہت بھولی اور معصوم لگتی ہے وہ۔۔۔۔۔ مگر دراصل کتنی خطرناک ہے اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ ارے یہ سوچ۔۔۔۔۔ یہ کس نے دیا تھا شکنتلا تم بھی بے حد بے پروا رہتی ہو۔۔۔۔۔ اگر اسے ہوش آ گیا ہوگا تو اسے ہماری ساری باتیں سنائی دے رہی ہوں۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ سوچ تو اس لیے ہے کہ اگر ہمیں اس کمرے تک اپنی آواز پہنچانا ہو۔۔۔۔۔ خیر میں اسے بند کیے دیتا ہوں۔“
 پھر وہ آوازیں آنا بند ہو گئیں اور دوبارہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ چند ہی لمحوں گزرے تھے کہ روشنی ہو گئی۔ میں نے دانستہ فوراً آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

”عذرا خان۔۔۔۔۔ عذرا خان!“ مجھے اچانک وہی آواز سنائی دی جو فون پر میں نے سنی تھی۔ ”اگر تمہیں ہوش آ گیا ہے تو جواب دو۔“
 ”میں ہوش میں آ چکی ہوں سیود مکر جی!“ معاً میں بول اٹھی۔ ”مگر تم آواز بدل کر کیوں بول رہے ہو؟“

”آواز بدل کر!“ اس کے لیے اور آواز سے یوں معلوم ہوا جیسے وہ چونک اٹھا ہو۔ ”نہیں تو۔۔۔۔۔ میں اپنی اصلی آواز میں بول رہا ہوں۔“

”جھوٹ بول رہے ہو تم!“ میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کمرے کا جائزہ لینے لگی جہاں اکیلی تھی۔ اس کمرے میں یقیناً کوئی خفیہ لاؤڈ سپیکر کسی جگہ موجود تھا۔ جس کے ذریعے مجھے سیود مکر جی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی ایسا بندوبست بھی تھا کہ وہ لوگ مجھے دیکھ بھی سکیں اور میری آواز بھی سن سکیں۔ میں وہاں ایک مسہری پر پرداز تھی۔ مسہری کے علاوہ کمرے میں ایک الماری ایک میز اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ کمرے کا صرف ایک دروازہ تھا جو غالباً باہر سے بند تھا۔ کھڑکی کوئی بھی نہیں تھی۔ ذرا توقف سے میں نے سیود مکر جی کو پھر مخاطب کیا۔ ”شکنتلا سے پوچھو کہ میں اسے کیسی لگی؟ اسے شاید بڑی خواہش تھی مجھے دیکھنے گی۔“

”تو۔۔۔۔۔ تو اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔ کہ تمہیں بہت پہلے ہوش آ گیا تھا۔ خیر کوئی۔۔۔۔۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ سیود مکر جی کی آواز سے کچھ فکر مندی جھلک رہی تھی۔

”فرق پڑتا ہے!“ میں دانستہ ہنس پڑی اور پھر اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ ”میں نے تمہاری اصل آواز سنی لی ہے اور تمہیں شاید یہ جان کر بھی حیرت ہو کہ میں تمہیں تمہاری اصل آواز سے پہچان چکی ہوں۔ کبھی کبھی ذرا سی غلطی بڑے بھیانک نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔“

”اول تو یہ بات غلط ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے لیکن اگر ایسا ہے بھی تو تمہیں اب اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں مل سکے گا عذرا خان۔“ اس کی آواز میں سختی آ گئی۔

”وہ کس طرح؟“ میں بدستور پرسکون لیے میں بولی۔

کر اندر نہیں آئے گا، یہاں سے فرار ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ میرے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلنے کی منتظر ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ سیودمگر جی یا جو بھی اس کا اصل نام تھا، اسے میری بھوک پیاس کا بھی خیال ہوگا۔ اس کمرے میں کھانے پینے کا سامان پہنچانے تو کوئی آئے گا۔ معلوم نہیں اس انتظار میں کتنا وقت گزر گیا۔ بس اچانک ہی میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی اس کمرے کے دروازے کی طرف دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔ قدموں کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ چند لمحوں بعد قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آ کر رک گئی اور پھر میں نے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ میں تیزی کے ساتھ لپک کر دروازے کے قریب پہنچ گئی۔

ذرا سی دیر بعد دروازے کے دونوں پٹ پورے کھل گئے۔ میں ایک پٹ کی آڑ میں ہو گئی۔ آنے والی ایک دروازہ خوبصورت عورت تھی جس کے لمبے کھلے ہوئے سیاہ بال پشت پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ ساری پہننے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے سے خوف اور سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ جو میرے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی بڑی حسین آنکھوں میں غالباً خالی کرہ دیکھ کر کچھ بھر کو حیرت کا تاثر سا نظر آیا، پھر اس کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ ”عذرا خان عذرا خان! کہاں ہو تم؟“ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ میں دیکھ چکی تھی کہ وہ غیر مسلح ہے اور یہ کہ اس پر قابو پانا میرے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ اس لیے فوراً دروازے کی آڑ سے نکل کر اس کے سامنے آ گئی۔

اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہاں سے نکل چلو جلدی!“

”مگر کہاں اور کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس عمارت میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔“ اس نے تیزی سے بتایا۔ ”کسی بھی لمحے آگ عمارت کے اس حصے تک پہنچ سکتی ہے۔ ہمیں اس سے پہلے ہی نکل جانا چاہئے۔“ یہ کہتے ہی اس نے میرا ہاتھ کھینچا۔

اس کے لہجے سے واضح طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ مزید کچھ کہے اور پوچھے بغیر میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔

وہ ایک چھوٹی سی راہداری تھی جس کے اختتام پر مجھے آگ کے شعلے نظر آرہے تھے۔ وہ عورت میرا بازو پکڑے تقریباً دوڑتی ہوئی اسی طرح بڑھ رہی تھی۔

”تم ادھر کہاں جا رہی ہو.....؟ ادھر تو آگ لگی ہوئی ہے۔“ میں نے اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا۔

میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے وہ مجھے ساتھ لیے ہوئے بائیں جانب ایک کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گئی اور اندر پہنچنے ہی کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ ایک لائبریری تھی وہاں ہر طرف دیواروں سے لگی کتابوں کی الماریاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور دوڑتی ہوئی ایک الماری کے پاس پہنچ گئی۔ میں لائبریری کے وسط میں کھڑی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگ سے بچتے کیلئے اس نے اسی کمرے کا انتخاب کیوں کیا تھا۔ میری نگاہ اسی کی قفل و حرکت پر تھی۔

چند ہی لمحے بعد یہ دیکھ کر میں چونک اٹھی کہ بظاہر انتہائی وزنی نظر آنے والی وہ الماری بہت آسانی سے ترچھی ہو گئی تھی۔ الماری کے پیچھے دیوار میں ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ اس عورت نے مڑ کر مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ خلا اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک شخص داخل ہو سکتا تھا۔ میں قریب پہنچ گئی تو اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا اور اس خلا میں داخل ہو گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔ وہ ایک صندوق نما سی کوٹھری تھی جس میں نہ کوئی دروازہ تھا نہ کھڑکی۔ اب میں کچھ کچھ سمجھ رہی تھی کہ وہ عورت کسی خفیہ راستے کے ذریعے مجھے اس عمارت سے باہر نکال لے جانا چاہتی ہے۔ اس کوٹھری میں دائیں جانب دیوار پر ایک چوکور خانہ دیوار سے نسبتاً بھرا ہوا تھا۔ اس عورت نے جیسے ہی اس خانے پر ہاتھ رکھا مجھے یوں لگا کہ میرے قدموں تلے زمین نیچے دھسنے لگی ہو۔ اس کے ساتھ خلا برابر ہو گیا تھا۔ اب میں اس عورت کے ساتھ جیسے ایک گہرے کنوین میں اترتی جا رہی تھی۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ زمین کی حرکت رک گئی۔ اسی لمحے میں نے سامنے خلا بننے دیکھا۔ سامنے نظر آنے والی دیوار دو حصوں میں تقسیم ہو کر دائیں بائیں ہو گئی تھی۔ وہ عورت میرا ہاتھ تھامے اس خلا سے گزر کر ایک لمبی سی سرنگ میں آ گئی۔ سرنگ نیم تاریک تھی مگر اس میں ہم دونوں سیدھے آگے بڑھنے لگے۔ میں نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو عقب میں خلا برابر ہو چکا تھا۔ میں نے اب تک اس عورت سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کا نام کیا ہے؟ سرنگ میں آگے بڑھتے ہوئے یہی سوال میری زبان پر آ گیا۔

”میں تمہاری مددگار ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیا تعارف کیلئے صرف اتنا ہی کافی ہے؟“ میں نے مزید کہا۔

”تم مجھے سیودمگر جی کی ایک مخلص دوست سکتی ہو۔“ اس نے میرے اصرار پر بتایا۔

”مخلص دوست یا محبوبہ؟“ میرے لہجے میں جھن تھی۔

”اگر میں اس کی محبوبہ ہوتی تو وہ میرے سامنے تم سے وہ باتیں نہ کرتا جو کی تھیں۔“ اس نے کہا۔

وہ باتیں تو محض بہلاوا تھیں اسی لیے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اصل معاملہ کچھ اور ہے جس پر وہ پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ تم ایسی حسین عورت کی موجودگی میں مجھے مزید یقین ہو گیا ہے کہ اس کے اصل مقاصد کچھ اور ہی ہیں۔“

جواباً اس نے میری بات کی تردید یا تائید نہیں کی اور کہنے لگی۔ ”ہم تقریباً پہنچ گئے ہیں۔“

”مگر کہاں؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”ابھی تم خود ہی دیکھ لو گی۔ یہ سرنگ دائیں جانب مڑ کر ختم ہو جائے گی۔ تمہیں موڑ نظر آ رہا ہے نا۔“

”ہاں دیکھ رہی ہوں۔“ میں بولی۔ ”چند قدم کے بعد ہمیں دائیں جانب مڑنا پڑے گا۔“

پھر چند قدم مزید چلنے کے بعد ہم دونوں دائیں سمت مڑ گئے۔ میری نگاہ سامنے اٹھی۔ سرنگ واقعی ختم ہو گئی تھی۔ سامنے دیوار نظر آرہی تھی۔ معاً ہلکی سی گڑگڑاہٹ ہوئی اور سامنے کی دیوار دو حصوں میں

”ادھر..... وہ ادھر گئی ہے..... پکڑو۔“ میں نے اپنے عقب میں شور سنا۔

بغیر مڑے میں تیزی کے ساتھ دروازے سے نکل گئی اور پھر اسی تیزی سے پلٹ کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اب ان لوگوں کے پاس یہی ایک راستہ تھا کہ دوسرے دروازے کا رخ کرتے مگر اس ہلت سے میں پورا فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ میں ایک راہداری میں دوڑ رہی تھی جس کے اختتام پر مجھے کھلی جگہ نظر آ رہی تھی۔ وہ راہداری عبور کر کے میں ایک بڑے سے صحن میں آ گئی۔ صحن کی دیوار کے قریب مجھے بڑا ماسٹول رکھا نظر آیا۔ میں دوڑتی ہوئی اس سٹول تک پہنچی اور پھر اس پر چڑھ گئی۔ سٹول پر چڑھ کر دیوار تک با آسانی میرے دونوں ہاتھ پہنچ سکتے تھے۔

پھر میں دیوار پر جیسے ہی اپنے دونوں ہاتھ جمائے ایک دم شور سنائی دیا۔ ان لوگوں نے مجھے کچھ لیا تھا۔ وہ صحن تک آ گئے تھے۔ پیش آنے والے خطرے کے مدارک کی خاطر میں نے لات مار کر سٹول کو گرا دیا تاکہ وہ لوگ فوری طور پر مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ میرے جسم کا سارا وزن میرے دونوں ہاتھوں پر تھا اور میں آہستہ آہستہ اپنے جسم کو اوپر اٹھا رہی تھی۔ جب تک وہ لوگ بھاگتے ہوئے دیوار کے قریب پہنچنے میں دیوار پر چڑھ چکی تھی۔

میں نے دیوار کی دوسری جانب جھانک کر دیکھا۔ وہ ایک ویران سی گندی گلی تھی۔ میں نے فوراً ہی دیوار سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے کودتے ہی میں وہاں رکی نہیں اور فوراً ہی بھاگنے لگی۔ اس گلی کا اختتام ایک سڑک پر ہوا جہاں معمولی سا ٹریفک آ جا رہا تھا۔ سڑک پر میں نے اپنا سانس درست کیا اور پھر مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنے دشمن کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سی جگہ ہے ٹیکسی والے نے میرے قریب ٹیکسی روک لی تھی۔

”شاہ باغ ہوٹل۔“ میں نے ٹیکسی والے سے کہا اور پھر کچھ سنے بغیر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی والا غالباً میٹر کے علاوہ بھی کچھ طلب کر رہا تھا جس کی مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اس وقت میں ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے نکلنے کی بجائے دوبارہ ہوٹل پہنچنا چاہتی تھی۔ ہنگامہ آرائی اور بھاگ دوڑ کے درمیان میرا پرس کہیں گم ہو گیا تھا۔ ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کو بھی میرے پاس پیسے نہیں تھے اور میں پہلی ہی ملاقات میں ہوم سیکرٹری سے اتنی بے تکلف ہونا نہیں چاہتی تھی کہ ٹیکسی کا کرایہ بھی اسی سے ادا کرائی۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے ٹیکسی والے سے انتظار کرنے کو کہا کہ ابھی کرایہ بھجواتی ہوں۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ میٹر سے دو روپے زیادہ چاہئیں اور میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے ایک ویٹر کو بلایا اور اسے ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کیلئے پیسے دیے۔ ویٹر کمرے سے چلا گیا تو میں نے ٹیلی فون آپریٹر سے ہوم سیکرٹری کا نمبر ملانے کو کہا۔ اس وقت شام کے تین بج رہے تھے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اب تک اپنے دفتر میں ہوگا پھر بھی میں نے چانس لیا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے بتایا کہ دوسری جانب سے کوئی بھی ریسپونڈ نہیں

ہٹ گئی۔ شکنتلا مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔ میں نے اسے سرنگ کی بائیں جانب ایک پتھر پر دباؤ ڈالتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب خلا کی دوسری جانب بیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ شکنتلا نے مڑ کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پھر آگے قدم بڑھا دیئے۔ میرے ساتھ شکنتلا نے جیسے ہی زینے کی تیسری بیڑھی پر پاؤں رکھا ہلکی سی گرگز اٹھ پھر سنائی دی اور ہمارے عقب میں سرنگ کا دہانہ بند ہو گیا۔ زینے میں بھی نیم تار کی تھی مگر ہمیں اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

زینے کے اختتام پر ہمیں ایک بند دروازہ ملا مگر وہ مقفل نہیں تھا۔ شکنتلا نے اس کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور وہ دوسری جانب کھلتا چلا گیا۔ مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اس عمارت سے نکل آنے کے بعد بھی میں شکنتلا کے ساتھ کسی اور عمارت میں جا پہنچوں گی۔ وہ دروازہ ایک بڑے سے کمرے کا تھا۔ اس میں قدم رکھتے ہی اچانک نہ جانے کدھر سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ یہ آواز سیود مکرچی ہی کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے یقین تھا شکنتلا کہ تم خطرہ محسوس کرتے ہی عذرا خان کو اس عمارت سے نکال کر یہاں لے آؤ گی۔ تم نے یہ اچھا کیا کہ چلتے چلتے اس عمارت میں آگ لگا دی۔“

یہ سن کر میرے ذہن کو ہچکا سا لگا۔ میرے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ خود شکنتلا نے اس عمارت میں آگ لگائی تھی۔

”ہاں سیود۔“ شکنتلا بول اٹھی۔ ”اتنی جلدی یہ ممکن نہیں تھا کہ اس عمارت سے ضروری کاغذات اور سارا سامان کہیں اور منتقل کیا جاسکتا..... مگر تم نے باہر کا آئندہ کیلئے کوئی بندوبست بھی نہیں کیا..... وہ آئندہ بھی ہمارے لیے مشکلات پیدا کر سکتا۔“

”شکنتلا ہم یہ باتیں پھر کرتے رہیں گے۔ فی الحال تم عذرا خان کو کسی محفوظ کمرے میں پہنچا کر میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں۔“ یہ کہتے ہی شکنتلا میری طرف مڑی۔

اگر اس وقت مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی اور میں تیزی کے ساتھ جھک نہ جاتی تو شکنتلا اپنا کام کر چکی ہوتی۔ اس کا ہاتھ بہت تیزی سے گھوما تھا اور نشانہ یقیناً میری کپٹی ہی تھی۔ میرے جھک جانے سے وہ اپنے ہی زور میں گھوم گئی تھی اور پھر میں نے اسے مزید مہلت نہیں دی تھی۔ میری لات اس کے کولہے پر پڑی تھی اور وہ چپٹی ہوئی فرش پر گر گئی تھی۔ اس کے فرش پر گرتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلی اور جیسے ہوا میں تیرتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر ڈھیر ہو گئی۔ میرے دائیں پیر کی ٹھوکرنے اس کے ماتھے کو نشانہ بنایا تھا۔

معاہدہ طرف سائرین کی سی آواز بلند ہونے لگی۔ شکنتلا بیہوش ہو چکی تھی اور میں سائرین کی آواز سن کر چونک اٹھی تھی۔ یہ آواز لازماً خطرے کی علامت تھی۔ ابھی میں فیصلہ نہیں کر سکی تھی کہ مجھے کیا نیا قدم اٹھانا چاہیے کہ اس کمرے کے دونوں دروازوں سے کئی قوی بیکل افراد اندر داخل ہوئے وہ سبھی مقامی معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی تعداد نصف درجن کے قریب تھی۔ انہوں نے دونوں طرف سے مجھے گھیر لیا اور پھر نیم دائرے کی صورت میں میرے گرد ان کا گھیرا تنگ ہوا میں جست لگا کر اس کے درمیان سے نکل گئی۔ زمین پر پاؤں ٹکلتے ہی میں اس کمرے کے ایک کھلے ہوئے دروازے کی طرف بھاگ گئی۔

”تم یہ نیک اور مخلصانہ مشورہ مجھے کیوں دے رہے ہو؟“ میں نے چپے ہوئے لہجے میں

پوچھا۔

”اس کی وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ اس لیے کہ

پولیس کو تو خانہ پری کیلئے کچھ نہ کچھ چاہیے۔“ وہ جوابا بولا۔

”تمہارے مخلصانہ مشورے کا شکریہ..... یاں یہ بتاؤ شکستہ تو خیریت سے ہے؟ اگر مجبوری نہ

ہوتی تو میں ہرگز اس پر ہاتھ نہ اٹھاتی۔ اپنے باطن میں وہ جیسی بھی ہو مگر بظاہر بھولی بھالی اور معصوم ہی نظر

آتی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ کس طرح تمہارے چنگل میں پھنس گئی۔“

”اسے تو خیر چھوڑو میرے چنگل میں تو تمہیں بھی آخر کار پھنسا ہے عذرا خان..... کب تک

بچی بچی پھر دوگی۔“

”تم یہ حسرت لیے شمشان گھاٹ پہنچ جاؤ گے۔ اور تمہی کیا بہت سے اسی آرزو میں اپنی قبروں

میں جاسوئے ہیں۔“ میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک میں ہی نہیں اور بہت سے تمہارے تیر نظر کا شکار ہو چکے

ہیں۔“

”بکواس مت کرو!“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ وہ گھٹیا پن پر اتر آیا تھا۔ اسی کے ساتھ ٹیلی

فون کا سلسلہ بھی میں نے منقطع کر دیا۔

اس نے جو کچھ کہا تھا مجھے محض خوف زدہ کرنے کیلئے بھی ہو سکتا تھا، لیکن اس سے بہر حال

ایک بات کا اندازہ ضرور ہو گیا۔ وہ بات یہ تھی کہ اسے میرے اختیارات کا علم نہیں تھا۔ یقیناً وہ بے خبر تھا

کہ پولیس میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں بن سکتی۔ اس سے قطع نظر میں نے ایک بات پر اور غور کیا کہ

سیودکرجی نہ صرف مجھے جانتا پہچانتا تھا بلکہ اسے میرے ٹھکانے کا علم بھی تھا۔ میں بہر حال اس کی اپروچ

میں تھی۔ وہ جب چاہتا مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔ یہ صورت حال میرے نزدیک مناسب نہیں تھی۔ اس نے خود

ہی مجھے یہ ہوٹل چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تھا او میں بھی اسی پر غور کر رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اپنے چہرے

پر اگر میک اپ کر لوں اور یہ ہوٹل چھوڑ کر کہیں کسی دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں تو یقیناً اس کی نظروں

سے اوچھل ہو جاؤں گی اور وہ میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکے گا۔ اس بات کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا

جاسکتا تھا کہ اصل معاملے سے میری توجہ ہٹانے کیلئے سیودکرجی کو میرے پیچھے لگا دیا گیا ہو۔ اس کا ثبوت

یہ بھی تھا کہ ڈھاکہ پہنچنے کے باوجود میں اب تک ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے نہیں مل سکی تھی۔

کافی دیر غور و خوض کے بعد میں نے اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل ترتیب دے لیا۔ اسی دوران

میں ویٹر کھانا لے آیا تھا اور میں کھانا بھی کھا چکی تھی۔ کھانے کے بعد چائے پی کر میں نیچے کاؤنٹر پر گئی اور

ہوٹل کا حساب کر دیا۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ کچھ دیر بعد یعنی تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر ہوٹل چھوڑ

دوں گی۔

”میری ایک کزن ملنے آنے والی ہے وہی یہاں سے میرا سامان لے کر.....“

”اچھا اچھا میں سمجھ گیا!“ وہ بولا۔ ”آپ یہ چاہتی ہیں کہ ہم سامان لے جانے سے انہیں نہ

اٹھارہا۔

”پلیز تمہیں ایک زحمت اور دوں گی۔ ڈائریکٹر میں ہوم سیکرٹری کے گھر کا نمبر ہوگا۔ اگر مانتے

نہ کرو تو اس سے گھر پر میری بات کرا دو۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں میں دیکھتی ہوں۔ آپ ذرا انتظار کیجئے۔“ ٹیلی فون آپریٹر شائستگی سے بولی

اور اسی کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر فون ملنے کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے اب کچھ کچھ بھوک بھی لگنے

لگی تھی۔ میں نے صبح سے صرف ناشتہ کیا تھا وہ بھی ہلکا سا۔ ایک بار پھر میں نے ویٹر کو بلوایا اور اسے

کھانے کا آرڈر دیا۔

ویٹر کے کمرے سے نکلتے ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی اور میں نے جلدی سے ریسپور اٹھالیا۔

آپریٹر نے بتایا کہ اس وقت عبید الرحمن چودھری گھر پر نہیں ہے۔ اس کی بیوی سے اگر میں بات کرنا چاہوں

تو کر سکتی ہوں۔ میں جوابا پوچھی کہ انہی سے بات کرا دوں میں کم از کم اس کے ذریعے عبید الرحمن چودھری کو

کوئی پیغام تو دے ہی سکتی تھی۔

چند لمحوں بعد دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”میں مسز چودھری بول رہی ہوں

جی فرمائیے۔“

”سنئے میرا نام عذرا خان ہے۔ آج مجھے چودھری صاحب سے ان کے دفتر میں ملاقات کرنا

تھی مگر وقت پر نہیں پہنچ سکی۔ آپ ان سے کہہ دیجئے گا کہ اب میں کل صبح دس بجے ان کے دفتر خود ہی پہنچ

جاؤں گی اور یہ مرا فون نمبر بھی لکھ لیں۔“ یہ کہہ کر میں نے ہوٹل کا فون نمبر بتایا۔ ”اگر وہ چاہیں تو اس نمبر

پر مجھ سے بات کر لیں یا میرے لیے پیغام چھوڑ دیں۔“

”جی بہتر ہے جیسے ہی وہ گھر پہنچے میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گی۔“

”شکریہ خاتون!“ یہ کہہ کر میں نے ریسپور رکھ دیا۔

میں نے جیسے ہی ریسپور رکھا ایک بار پھر گھنٹی بجنے لگی۔ آپریٹر کی آواز آئی۔ ”سیودکرجی آپ

سے بات کریں گے بات کیجئے۔“

”ہیلو..... عذرا خان۔“

”ہاں بول رہی ہوں! کہو اب کیا چاہتے ہو؟“

”تم میری توقع سے کہیں زیادہ چالاک نکلیں! مگر زیادہ دیر تم آزاد نہیں رہ سکو گی۔“ اس کے

لہجے میں دھمکی تھی۔

”کیا تم نے یہی دھمکی دینے کیلئے مجھے فون کیا تھا۔“

”نہیں! تمہیں ایک بات اور بتانا تھی۔ آج رات پولیس شاہ باغ ہوٹل پر چھاپہ مارنے والی

ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم بھی شے میں دھری جاؤ۔ پولیس کو ایک مفروضہ کی تلاش ہے جو حال ہی میں

ڈھاکہ پہنچی ہے۔ اس ملزمہ کا تعلق ایک بین الاقوامی گروہ سے ہے جو سنگاپور میں ماخوذ ہے۔ میرا مشورہ

ہے مخلصانہ مشورہ کہ تم فوری طور پر شاہ باغ ہوٹل چھوڑ دو۔“

باہر کا نام بھی سنا تھا۔ ہر چند کہ یہ نام بہت عام ہے مگر محسوس ہو رہا تھا کہ یہ وہی پر جوش نوجوان ہو سکتا تھا جس سے میں کئی سال قبل ملی تھی۔ شکنتلا نے سیود مگر جی سے اس کا بندوبست کرنے کیلئے کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سیود مگر جی کیلئے مسئلہ بنا ہوا تھا۔ اس میں تو خیر کسی شے یا شک کی گنجائش نہیں تھی کہ سیود مگر جی ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ باہر ایسے ہی لوگوں کے خلاف سرگرم عمل رہتا تھا۔ آئندہ روز کے پروگرام میں باہر سے ملاقات بھی اب ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہوم سیکرٹری سے مل کر لوٹتے ہوئے باہر سے بھی مل لوں گی۔ وہ بہر حال میرے لیے مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

رات کا کھانا ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھاتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں عبید الرحمن چودھری نے مجھے شاہ باغ ہوٹل میں فون نہ کیا ہو۔ میں نے اس کی بیوی کو ہوٹل کا فون نمبر لکھوا دیا تھا۔ اگر اس نے وہاں فون کیا ہوگا تو اسے یہی بتایا گیا ہوگا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں۔ ویسے حالات کے پیش نظر توقع یہی تھی کہ اس نے مجھے اپنے گھر پہنچنے کے بعد فون ضرور کیا ہوگا۔ اسے یقیناً معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس نے جس ڈرائیور کو گاڑی لے کر میرے ہوٹل بھیجا تھا اس پر کیا گزری۔ ایسی صورت میں اسے میری طرف سے بہر حال فکر مند ہونا چاہیے تھا۔

ڈائننگ ہال سے اٹھ کر میں ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچی اور ٹیلی فون ڈائریکٹر میں ہوم سیکرٹری کے گھر کا فون نمبر دیکھ کر نوٹ کیا۔ اسی کے ساتھ اس کا پتا بھی لکھ لیا اور دفتر کے نمبر بھی لکھ لئے۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر میں نے ٹیلی فون آپریٹر کو اس کے گھر کا نمبر بتا کر ملانے کیلئے کہا۔

کچھ ہی دیر کے بعد فون پر میں اس سے گفتگو کر رہی تھی۔ مجھے پہچاننے کے بعد وہ بتا رہا تھا۔ ”میں نے شاہ باغ ہوٹل فون کیا تھا..... وہاں سے.....“

”معلوم ہوا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر جا چکی ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے اس کی بات پوری کر دی۔ ”آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا۔“

”جی..... جی ہاں..... اور میں اس پر بھی سخت شرمندہ ہوں کہ..... کہ آج صبح میرا ڈرائیور گاڑی لے کر آپ کے ہوٹل نہیں پہنچ سکا۔ دراصل اسے ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔ اس حادثے کا علم مجھے خاصی دیر کے بعد ہوا ورنہ میں آپ کیلئے دوسری گاڑی بھیج دیتا۔“ یہ کہہ کر وہ کھانسنے لگا۔

”خیر کوئی بات نہیں، میں کل آپ سے دفتر میں مل لوں گی۔“ میں بولی۔ ”آپ کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی لگ رہی ہے۔ کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی۔“

”جی ہاں! بس کچھ نزلے وغیرہ کا اثر ہے گلے پر۔“ وہ بولا۔

”آپ نے وہ ہوٹل کیوں چھوڑ دیا.....؟ اور اس وقت کہاں سے بول رہی ہیں۔؟ کیا کسی اور ہوٹل.....“

”نہیں جی۔“ نہ معلوم کیوں میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے اپنے موجودہ ٹھکانے کے متعلق کسی کو بھی نہیں بتانا چاہیے۔ یہی سوچ کر میں نے مزید کہا۔ ”دراصل یہاں ڈھاکہ میں میری ایک کزن رہتی ہے۔ اسی کے اصرار پر میں ہوٹل سے یہاں چلی آئی ہوں۔“

”یہاں سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ اس نے پوچھا۔

روکیں۔ ٹھیک ہے احتیاطاً آپ ہمیں ان کا نام بتا دیں تاکہ ہم سمجھ جائیں کہ وہ کوئی اور خاتون نہیں آپ کی کزن ہیں۔“

”عطیہ ٹکلیل نام ہے اس کا۔“ میں نے یوں ہی ایک نام لے دیا۔

”بہتر ہے۔“ کاؤنٹر کلرک نے ایک کاغذ پر یہ نام لکھا اور کمرہ بھی لکھ دیا۔

کچھ لوگ خاصے سٹائیک ہوتے ہیں کاؤنٹر کلرک بھی ایسے ہی لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پرچے پر یہ بھی لکھ لیا تھا کہ عذرا خان کی ہدایت کے مطابق ان کا سامان ان کی کزن کو لے جانے دیا جائے گا۔ پرچہ لکھ کر اس نے میری طرف بڑھا دیا۔

”جی؟“ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

”اس پر دستخط کر دیجئے۔“ اس نے نرمی سے کہا اور میری طرف پٹن بھی بڑھا دیا۔

میں اس کی حرکت پر مسکرانے لگی۔ ”آپ تو اس طرح دستخط لے رہے ہیں جیسے میں اپنی جائیداد کسی کے نام منتقل کر رہی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پرچے پر دستخط کر دیئے۔

”خانہ پری تو بہر حال ضروری ہے نا۔“ وہ بھی مسکرایا۔ ”کل کلاں کو اس پر اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ میں نے کسی اور کو آپ کا سامان لے جانے کی اجازت کیوں دی۔“

جواب میں مزید کچھ کہے بغیر میں وہاں سے چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے سوٹ کیس کھول لیا۔ اس میں میک اپ کا سامان موجود تھا۔

مجھے اپنے چہرے پر میک اپ کرنے میں تقریباً پون گھنٹہ لگا۔ میں نے دانستہ اپنے چہرے پر ایسا میک اپ کیا تھا کہ صنف مخالف کیلئے کوئی کشش نہ رہے جو ایک بار میری طرف دیکھ لے دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہ کرے۔ لباس بھی میں نے تبدیل کر لیا تھا۔ اب دیکھنے میں ایک بد شکل سی عورت نظر آ رہی تھی۔ چہرے سے عمر کا اندازہ تیس بیس سال سے کم نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ایسے چہرے عموماً لوگ یاد نہیں رکھتے اور یہی میرا مقصد تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب میں اپنا سامان وغیرہ سمیٹ کر ہوٹل کے کمرے سے نکلی تو کسی نے مجھ سے تعرض نہیں کیا۔ سوٹ کیس اتار دینی نہیں تھا کہ میں خود نہ اٹھا سکتی۔ اس لیے ہوٹل کے پورٹر کو میں نے نہیں بلایا تھا۔ ایئر بیگ میں نے اپنے شانے سے لٹکا لیا تھا۔

شاہ باغ ہوٹل کے مقابل ہی ایک فائبر سٹار ہوٹل تھا۔ میں نے اسی کا رخ کیا۔ اس ہوٹل کی شائیں مغربی پاکستان کے شہروں میں بھی تھیں۔ اس نو منزلہ ہوٹل کی پہلی منزل ہی پر مجھے ایک کمرہ مل گیا۔ یہاں میں نے اپنے اصل نام کی بجائے وہی فرضی نام لکھایا تھا جو شاہ باغ ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک کو بتایا تھا یعنی عطیہ ٹکلیل اس کے علاوہ میں نے یہ بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ مغربی پاکستان سے آ رہی ہوں۔ میں نے مشرقی پاکستان ہی کے ایک شہر چانگام کا پتا لکھا دیا تھا کہ میں وہاں سے آ رہی ہوں۔

ایک نئی حیثیت سے نئے ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد مجھے نسبتاً تحفظ کا احساس ہوا۔ اب میں سیود مگر جی کی پہنچ سے دور ہو چکی تھی۔ صبح سے اب تک پیش آنے والے واقعات کا تجزیہ کرنا میرے لیے موجودہ صورتحال میں سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے اب یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ شکنتلا کی زبان سے میں نے

چکی تھی۔ مجھے دس بجے ہوم نمٹری کے دفتر پہنچنا تھا اور اس میں ابھی بہت دیر تھی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ پہلے باہر سے مل لیا جائے۔ اس کی کوٹھی یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ بیچ گاؤں ہی میں اس کے والد مشیر احمد خاں کی کپڑے کی ایک مل تھی اور اسی علاقے میں اس کی سکونت بھی تھی۔ میرے چہرے پر جو میک اپ تھا، وہ یقیناً اس سلسلے میں مسئلہ بنا، مگر میں مشیر احمد خاں کے بجائے اب صرف باہر سے ملنا چاہتی تھی۔ اگر میں میک اپ میں نہ ہوتی تو یقیناً مشیر احمد خاں سے بھی ملتی۔

ہوٹل سے نکل کر بیچ گاؤں تک کیلئے مجھے بمشکل ایک ٹیکسی مل سکی کیوں کہ وہ علاقہ قریب ہی تھا۔ میٹر کی بجائے ٹیکسی والے نے الگ سے کرایہ طلب کیا تھا۔ دس روپے اس زمانے میں بہت ہوتے تھے۔ بہر حال میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ جب میری ٹیکسی مشیر احمد خاں کی کوٹھی کے گیٹ پر رکی۔ میں نے ٹیکسی سے اتر کر کرایہ ادا کیا اور پھر چوکیدار سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے باہر صاحب سے ملنا ہے۔ تم انہیں میرا پیغام پہنچا دو۔“

”مگر باہر بابو تو اب ادھر نہیں رہتا۔“ چوکیدار نے بتایا۔

”کیا مطلب؟ کیا یہ مشیر احمد خاں کی کوٹھی نہیں ہے؟“

”اُمی کا کوٹھی ہے، مگر باہر بابو تو پچھلے سال سے نہیں رہتا یہاں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے وہ اب کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ابی آپ ٹھہرو یہاں ہم اندر پوچھ کر آتا ہے۔ سنا ہے بادام علی گھاٹ میں باہر بابو اپنے کسی

دوست کے ساتھ رہتا ہے۔“

”پورا پتا معلوم کر کے آنا تاکہ میں اس پتے پر پہنچ سکوں۔“ میں نے چوکیدار کو مزید ہدایت

دی۔

چوکیدار سر ہلا کر آگے بڑھ گیا اور میں سوچنے لگی کہ یقیناً باپ بیٹے کے درمیان نظریاتی اختلاف کے سبب علیحدگی ہو گئی ہوگی۔ مشیر احمد خاں پہلے جی باہر سے نالاں رہتے تھے۔ باہر ان کا ہاتھ بنانے اور کاروبار میں دلچسپی لینے کی بجائے اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا تھا۔

ذرا دیر بعد چوکیدار لوٹ کر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ بھی تھا۔ آتے ہی وہ بولا۔ ”نسرین بی بی اس سے ملنے جانا رہتا ہے اسی سے یہ پتا کھوایا ہے۔ وہ بولتا ہے کہ اگر آپ چاہو تو اس سے مل لو۔“

”نہیں۔“ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے چوکیدار سے پرچہ لے لیا اور واپسی کیلئے مڑ گئی۔

مجھے معلوم تھا کہ نسرین باہر کی بہن کا نام تھا جو اس سے تین سال چھوٹی تھی۔ وہ اپنے بڑے

بھائی کو بہت چاہتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ گھر چھوڑ کر جانے کے بعد بھی وہ اپنے بھائی سے ملنے جاتی رہتی تھی۔ مشیر احمد خاں کو یا تو اس بات کا علم نہیں تھا اور اگر معلوم تھا تو وہ درگزر سے کام لیتے ہوں گے۔ ورنہ نسرین باہر سے ملنے نہ جاسکتی۔

وہاں سے جلد ہی مجھے گرین روڈ کیلئے ایک ٹیکسی مل گئی۔ بیچ گاؤں سے گرین روڈ کا فاصلہ کافی

اس کا تجسس مجھے کچھ غیر فطری محسوس ہوا پھر بھی میں نے کہہ دیا۔ ”موتی جمیل ہے اس علاقے کا نام۔“

”احتیاطاً فون نمبر بھی بتا دیجئے تاکہ کبھی ضرورت پڑے تو.....“

”یہاں فون نہیں ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ ”میں ایک ہوٹل سے فون کر رہی ہوں۔“

اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”ہاں آپ پورا پتا بتا دیں تاکہ میں کل صبح گاڑی.....“

”اس کی ضرورت نہیں، شکریہ! میں خود دس بجے صبح کچھ جاؤں گی۔“ پھر میں نے ہنستے ہوئے

مزید کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ڈرائیور کو پھر کوئی حادثہ پیش آجائے۔ یوں بھی مجھے پتا ٹھیک سے

معلوم نہیں ہے۔“

”لوکیشن تو بتا ہی سکتی ہیں۔“

معلوم نہیں وہ کیوں اس قدر بعید تھا کہ کسی طرح اسے معلوم ہو جائے کہ میں کہاں ٹھہری

ہوں۔ میں نے جواب کہا۔ ”دراصل یہ علاقہ میرے لیے بالکل نیا ہے اس لیے۔“

”خیر کوئی بات نہیں، کل جب میں اپنے ڈرائیور سے آپ کو وہاں چھڑواؤں گا تو معلوم ہو

جائے گا۔“

”آپ سے مل کر لوٹنے کے بعد میرا ارادہ یہاں آنے کی بجائے کہیں اور جانے کا ہے۔“ میں

نے اس کی اس امید پر بھی پانی پھیر دیا۔

”اوہ..... خیر پھر دیکھا جائے گا، آپ کل ملیں تو سہی۔“ اس کے لہجے سے مایوسی کا اظہار ہو رہا

تھا۔

”اچھا تو پھر خدا حافظ۔“ میں نے کہا اور پھر اس کی طرف سے بھی ”خدا حافظ“ سن کر ریسیور

رکھ دیا۔

فون پر عبدالرحمن چودھری سے گفتگو کر کے میرا ذہن الجھ سا گیا تھا۔ میری سکونت کے بارے

میں وہ کیوں اتنا تجسس تھا، میں سمجھ نہیں سکتی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ ہر حال میں یہ جان لینا چاہتا ہو کہ میں کہاں

ٹھہری ہوں۔ میرے ذہن میں اس کی ایک وجہ بھی آسکی کہ شاید محترم وزیر داخلہ نے اسے میری حفاظت

کا بندوبست کرنے کے احکام بھی دیئے ہوں گے اور وہ اپنے طور پر میرے علم میں لائے بغیر یہ سارا

بندوبست کرنا چاہتا ہوگا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں کوئی اور بات نہیں آسکی۔ اس کے علاوہ اس کی

بھرائی ہوئی آواز بھی میرے ذہن میں کلک رہی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر کھانسا رہا ہو۔

صبح کی نسبت اس وقت فون پر اس کی آواز کچھ بدلی بدلی سی تھی۔ اس کو بھی میں نے اپنا وہم سمجھ کر ذہن

سے جھٹک دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کیوں کہ اس وقت رات کے سوا دس بجتے والے تھے۔ میں

آج رات زیادہ سے زیادہ آرام کر لینا چاہتی تھی تاکہ کل سے پوری طرح سرگرم عمل ہو سکوں۔ ہم سیکرٹری

سے ملنے کے بعد کل ہی سے میں اپنے حریفوں کے پیچھے لگ جانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد کچھ ملے نہ ہوتا

کہ مجھے کوئی رات آرام کی نصیب ہو پاتی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح میری آنکھ کھل گئی۔ ساڑھے سات بجے تک میں ناشتہ کر کے تیار ہو

”شاید نہیں، یقینی طور پر بتائیے۔ یہی..... اسی تصویر کی ایک کاپی میں یہاں کے چند جرائم پیشہ افراد کے پاس بھی دیکھ چکی ہوں۔“ میں نے اس کے چہرے کے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”جرائم پیشہ افراد کے پاس۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”مگر..... ابھی کل ہی تو آپ یہاں آئی ہیں..... اتنی جلدی آپ کی مذہبی جرائم پیشہ افراد سے کس طرح ہوگئی؟“

”یہ تو خیر بعد کی باتیں ہیں، آپ پہلے سوال کا جواب دیجئے کہ آیا اس تصویر کی دو کاپیاں بھیجی گئی تھیں یا صرف ایک کاپی آئی تھی؟ اور اگر دو کاپیاں بھیجی گئی تھیں تو پھر دوسری کاپی بھی آپ کے پاس ہونا چاہئے..... میرا مطلب ہے کہ آپ کے ریکارڈ میں اس کی دوسری کاپی ہوگی۔“

”میں ابھی معلوم کرانا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے کھٹی بجائی اور جب چہرہ اسی اندر داخل ہوا تو اس سے ریکارڈ کیپر کو بلوایا۔ چہرہ اسی حکم سن کر چلا گیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کیا آپ اس تصویر سے متعلق تفصیلات بتانا پسند کریں گی؟“ میں اس معاملے کو کچھ سمجھ نہیں سکا۔

”سنئے! کل ڈھاکہ پہنچتے ہی مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔“ میں نے اسے بتانا شروع کیا۔ مختصر میں نے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات سے اسے آگاہ کر دیا اور اس کے چہرے پر رد عمل دیکھنے لگی۔ صرف میں نے اس سے یہ بات چھپالی تھی کہ شاہ باغ ہوٹل کے بعد اب میرا قیام کہاں ہے؟

سیود مگر جی..... وہ زیراب بڑوانے۔ ”یہ نام پہلے بھی کئی بار کئی معاملات میں سامنے آچکا ہے مگر ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا کہ یہ شخص کون..... ہاں دھان منڈی کی اس کوٹھی کا کیا نمبر بتایا تھا آپ نے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے قلم ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے نمبر لکھا دیا۔ یہ اسی کوٹھی کا نمبر تھا جہاں مجھے سیود مگر جی نے اغوا کر کے لے جانے کا حکم دیا تھا۔

”شاید اس نمبر سے کوئی سراغ مل جائے۔“ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ ”احتیاطاً اس نیلی کار کا نمبر بھی لکھ لیں جس میں اکبر اور اس کے ساتھی میرا تعاقب کر رہے تھے۔“ میں نے اپنے حافظے میں محفوظ نیلی کار کا نمبر بھی لکھوا دیا۔

اسی وقت ریکارڈ کیپر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کچھ گھبرا ہوا تھا۔ عبید الرحمن چودھری نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سرا! تصویر کی دو کاپیاں اسلام آباد سے بھیجی گئی تھیں جن میں سے ایک آپ کے نام پر چڑھی ہوئی ہے مگر..... مگر سزا دوسری کاپی ہمارے ریکارڈ میں نہیں ہے۔ میں نے بہت تلاش کی لیکن.....“ وہ ہکلائے لگا۔

”اسے جانے دیں۔“ میں نے ریکارڈ کیپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبید الرحمن چودھری سے کہا۔ ”اس معاملے میں یہ شخص بے قصور معلوم ہوتا ہے۔“

”لیکن یہ بات تو تشویش کن ہے۔“ عبید الرحمن چودھری بولا۔ ”ہوم منسٹری کے ریکارڈ روم سے کسی چیز کا اس طرح غائب ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔“

تھا اس لیے ٹیکسی والا میٹر ہی سے چلنے پر راضی ہو گیا تھا۔

ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے نہ میں نے اسے دیکھا تھا نہ اس نے مجھے۔ اسی سبب اپنے چہرے پر میک اپ سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مقررہ وقت سے نصف گھنٹے پہلے ہی میں وہاں پہنچ گئی۔ مجھے اس کا دفتر تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پی اے نے ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی، پھر پوچھا۔ ”آپ کا نام؟“

”عذرا خان۔“ میں نے بتایا۔

نام بتائے جانے پر میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ ”جی..... جی تشریف رکھئے! صاحب نے بتایا تھا کہ آپ دس بجے تشریف لائیں گی۔ آپ کچھ جلدی آگئیں۔“

”جی ہاں۔“ یہ کہہ کر میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

پھر مجھے عبید الرحمن چودھری سے ملاقات کیلئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ہی اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔

میں نے اپنے چہرے پر خاصی محنت کی تھی کسی کیلئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی تھا کہ میں نے میک اپ کر کے اپنا اصل چہرہ چھپا لیا ہے۔ میں اسی لیے مطمئن تھی، لیکن ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری کے کمرے میں قدم رکھتے ہی یہ اطمینان ختم ہو گیا۔ میں نے واضح طور پر اسے چونکتے دیکھا تھا۔

وہ میری پذیرائی کی خاطر اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا تھا۔ ”یہ آپ نے اپنا اچھا بھلا چہرہ کیوں بگاڑ لیا..... تشریف رکھئے۔“ اس نے کرسی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے اس کا جائزہ لیا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی شخصیت انتہائی غیر متاثر کن تھی، سیاہ رنگ، دبلا پتلا جسم اور قد چھوٹا۔ بڑی سی ریو الونگ چیئر پر بیٹھا ہوا وہ ایک بچہ سا لگ رہا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گئی تھی تو وہ بھی بیٹھ گیا تھا۔

”آپ سے کس نے کہا مسٹر چودھری کہ میں نے اپنا چہرہ بگاڑ لیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”میرنی دراز میں آپ کی تصویر موجود ہے۔ یہ دیکھئے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور ایک تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔

وہ میری ہی تصویر تھی جسے دیکھ کر میں چونک اٹھی۔ میرے چونک اٹھنے کا سبب یہ تھا کہ ایسی ہی تصویر بالکل یہی یوز یا غالباً اسی تصویر کی دوسری کاپی میں نے اکبر کے پاس دیکھی تھی وہی اکبر جو سیود مگر جی کے ایما پر مجھے اغوا کرنا چاہتا تھا۔ وہ تصویر میری شناخت کیلئے سیود مگر جی نے اکبر کو بھیجی تھی۔

”یہ تصویر آپ کے پاس کہاں سے آئی؟“ میں نے سوال کیا۔

”اسلام آباد سے ہوم منسٹری نے کچھ روز قبل ہمیں بھیجی تھی تاکہ جب آپ یہاں پہنچیں تو ہم آپ کو شناخت کر سکیں۔ میں نے ہی منسٹری سے یہ درخواست کی تھی۔“

”تصویر کی کیا صرف ایک ہی کاپی وہاں سے آئی تھی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”جی..... جی ہاں شاید ایک ہی کاپی تھی۔“ اس نے بتایا۔

اسی وقت چہرہ اسی چائے اور دیگر لوازمات لے آیا۔ چائے پینے کے دوران میں بھی عبید الرحمن چودھری سے امریکی ایجنٹوں ہی کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ پھر کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں نے اس سے رخصت کی اجازت چاہی۔

”اگر آپ مناسب خیال کریں تو میں اپنی کار میں آپ کو موتی جھیل پہنچا دوں؟“ وہ مجھے رخصت کرنے سے پہلے بولا۔

”میں نے آپ سے کل کہا تھا کہ یہاں سے میرا ارادہ کہیں اور جانے کا ہے۔ فی الحال میں اپنی کزن کے گھر نہیں جا رہی۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے کہا۔
پھر چند ہی لمحے بعد میں اس کے کمرے سے نکل آئی۔ گرہن روڈ سے اب میں بادام تلی گھاٹ

عبدالرحمن چودھری سے بظاہر میری ملاقات نسلی بخش ہی کہی جاسکتی تھی۔ امریکی ایجنٹوں کا

سراغ لگانے کیلئے مجھے بہر حال ایک سرا مل گیا تھا۔ اس کے باوجود نہ معلوم کیوں کوئی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی اور اس کھٹک کا کوئی سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

نہیں ہوئی۔ بابر کے دوست فرید احمد سے میری ملاقات ہو گئی مگر بابر نہیں ملا۔ فرید احمد نے اس کے بارے

میں بتایا کہ گزشتہ رات کو باہر کہیں گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا۔ فرید احمد کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ عموماً پاپا ایسا کرتا رہتا تھا۔ وہ کئی کئی روز کیلئے غائب ہو جاتا تھا۔ فرید احمد نے مجھ سے پوچھا

کہ باہر سے میرا کیا تعلق ہے اور میں اس سے کیوں ملنا چاہتی ہوں؟ مگر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میں نے کہا کہ پھر کبھی آ کر خود اس سے مل لوں گی۔ نام بتانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ باہر مجھے

میرے نام سے نہیں پہچان سکے گا۔
بادام تلی گھاٹ سے میں نے اپنے ہوٹل کا رخ کیا۔ ٹیکسی میں ایئر پورٹ روڈ کی طرف جاتے

ہوئے مجھے کچھ شبہ سا ہوا کہ میری ٹیکسی کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ سفید رنگ کی ایک ڈائن کار کو میں کافی دیر سے ٹیکسی کے پیچھے پیچھے آتے دیکھ رہی تھی۔ تعاقب کی یقین دہانی کیلئے میں نے ٹیکسی والے سے

ایزپورٹ روڈ کی طرف جانے کی بجائے پہلے ٹورڈ سٹریٹ چلے کو کہا۔
بادام تلی گھاٹ کے علاقے سے نکل کر اب میری ٹیکسی بابو بازار سے گزرنے کے بعد چوک

بازار کی طرف جا رہی تھی۔
”مجھے کچھ دیر کو ہڈ فورڈ ہسپتال جانا ہے۔“ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

”آپ وہاں اگر زیادہ دیر رکیں تو مجھے چھوڑ دیں۔“ نیکیسی والا بولا۔
 ”ٹھیک ہے، تم چلو..... دیے مجھے وہاں بس پانچ منٹ لگیں گے زیادہ دیر نہیں ہوگی۔“

”پھر کوئی بات نہیں اتنی دیر میں انتظار کر لوں گا۔“
کچھ ہی دیر کے بعد جب میری ٹیکسی ٹرن فورڈ ہسپتال کے سامنے رکی تو کچھ فاصلے پر وہ سفید

”ہاں یہ تو ہے، مگر آپ اس مسئلے سے پھر نمٹنے رہیں گے۔ یہاں سے وہ تصویر غائب کرنے والا کوئی ایسا ہی بااثر شخص ہو سکتا ہے جو یا تو ریکارڈ روم میں داخل ہو کر خود کوئی چیز نکال لانے کا اہل ہو یا پھر اس کے حکم پر کوئی بھی چیز اس تک پہنچائی جاسکے۔ آپ اس سلسلے میں ضروری کارروائی کیجئے لیکن اس وقت.....“

”ٹھیک ہے۔“ وہ میرا مقصد سمجھ گیا اور ریکارڈ کیپر کو جانے کی اجازت دے دی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا بتائیں گی؟“

”صرف چائے منگوائیں، باقی کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔
اس نے میرے انکار کے باوجود چہرہ اسی کو بلا کر چائے کے علاوہ بھی اور بہت کچھ لانے کا حکم

وے دیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہئے۔“ چپراسی کے کمرے سے نکلتے ہوئے، لالہ اکرم نے ”تائمن کے سولہ منہ اور اس کے ساتھ لالہ کی بات کہنا تو بہتر ہے، اطاعت ہر“

”تازہ ترین اطلاعات کے مطابق سولومن اور اس کے ساتھیوں کی بابت ایسا تازہ ترین اطلاعات ہیں؟“

”ناں معلوم ہے مجھے۔“ میں بولی۔ ”ڈھاکہ شہر سے تقریباً چودہ میلے ہوگی یہ بستی..... میری

”ہاں معلوم ہے مجھے۔ میں بولی۔ ڈھالہ سہرے سہریا چودہ بیٹھ بولی یہ سنی..... میری معلومات درست ہیں نا؟“

الاسلام ہے۔ اسی شخص کی حویلی میں سلومن کو آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ نارائن گج اور اس کے گردنواں میں اس شخص کی کافی زمین ہے۔ اس شخص کے مارے میں انکوائری کی جارہی ہے لیکن اب تک اس کے

”فی الحال میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ آپ دھان منڈی کی اس کونٹھی کے متعلق کل تک مجھے

معلومات فراہم کر دیں۔ کل میں فون پر آپ سے بات کر لوں گی۔“ میں نے کہا۔
 ”ناکل۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اور حملہ آوروں کی کار کے بارے میں بھی کل

”اس تعاون کا شکریہ۔“ وہ بولا۔ ”کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ فوری طور پر آپ کا کیا

”ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا، لیکن شاید مجھے جلد ہی نارائن گنج مانا پڑے۔“ میں نے

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ اپنی تفتیش کا آغاز وہیں سے کریں۔ اس سلسلے میں اگر پولیس

یا انٹیلی جنس وغیرہ کی مدد چاہئے تو بتا دیں میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔“
 ”ابھی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“ میں نے جواباً کہا۔

حویلی میں ٹھہرتے ہیں..... بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اکثر غیر ملکی بھی یہیں آکر قیام کرتے ہیں۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری نگاہ اس کے چہرے پر تھی۔

میری توقع کے مطابق لمحہ بھر کو اس کا چہرہ متغیر ہو گیا، پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ غیر ملکیوں کے بارے میں آپ نے کہاں سے سن لیا؟ عرصہ دراز سے کسی غیر ملکی نے اس حویلی میں قیام نہیں کیا۔ بہر حال مجھے آپ کی میزبانی سے خوشی ہوگی۔ آپ کب تک ٹھہریں گی یہاں؟“

”فی الحال تو میں آپ سے صرف ملاقات کرنے آئی تھی۔ میرا ارادہ فوری طور پر یہاں رکنے کا نہیں کیوں کہ اپنا سامان وغیرہ بھی میں ساتھ نہیں لائی۔ ہاں دو ایک روز بعد میں یہاں قیام کی غرض سے آؤں گی۔ اب سے اجازت مل گئی ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں رہی۔ آج ہی میں ڈھاکہ لوٹ جانا چاہتی ہوں۔“

”لوئیں گی تو اس صورت میں جان من جب آپ کو کوئی یہاں سے واپس جانے دے گا۔“ اچانک اس کا لہجہ بدل گیا اور ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ رکے بغیر مزید بولا۔ ”میرے غیر ملکی مہمان تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے عذرا خان..... انہیں بڑی شدت سے تمہارا انتظار تھا، مگر تم اتنی جلدی یہاں پہنچ جاؤ گی یہ تو قیام خود مجھے بھی نہیں تھی۔“

میں ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ میں اپنے دشمنوں کے چنگل میں پھنس چکی ہوں۔

”فضول ہے عذرا خان! فرار کی راہیں مسدود کی جا چکی ہیں۔“ یہ کہتے ہی اس نے تالی بجائی۔ دوسرے ہی لمحے نشست گاہ کے دونوں بیرونی دروازوں پر کئی مسلح افراد نظر آنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کا رخ میری ہی جانب تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈائن بھی رک گئی۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ہسپتال کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ اسی دوران میں میری نگاہ تعاقب کرنے والی کار کی طرف اٹھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے ایک ایسا چہرہ نظر آیا جسے دیکھ کر میں تقریباً اچھل پڑی۔ وہ شکنتلا تھی۔ میں رکے بغیر تیزی کے ساتھ ہسپتال کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ مجھے حیرانی اس پر تھی کہ میک اپ کے باوجود شکنتلا نے کس طرح میری شناخت کر لی تھی اور کب وہ میرے پیچھے لگ گئی تھی۔

ہر چند کہ یہ ایک غیر اخلاقی سی بات تھی کہ میں ٹیکسی والے کو کراہیہ ادا کیے بغیر خاموشی کے ساتھ ہسپتال کے پچھلے دروازے سے نکل جاتی مگر مجبوراً مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ شکنتلا تعاقب کر کے میرے نئے ٹھکانے سے بھی آگاہ ہو جائے۔ اس طرح میں ایک بار پھر اپنے دشمنوں کی نظر میں آ جاتی۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد میں نے ایک خالی ٹیکسی روک لی۔ اب ایک بار پھر میں ایئر پورٹ روڈ کی طرف جا رہی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میک اپ کے باوجود شکنتلا نے مجھے پہچان لیا تھا ورنہ وہ میرے پیچھے نہ لگتی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ شکنتلا کو مجھ پر کیسے شک ہوا؟

اپنے دشمنوں سے چھپنے ہی کی خاطر میں نے میک اپ کیا تھا، لیکن میری یہ کوشش نامعلوم وجوہ کی بنا پر ناکام ہو گئی تھی۔ اب مجھے ایک بار پھر اپنا چہرہ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے ہوٹل پہنچ کر وہی طریقہ کار اپنایا جس پر گزشتہ روز عمل کر چکی تھی۔ اسی روز میں ایک بار پھر ایک نئی حیثیت سے شاہ باغ ہوٹل میں قیام پذیر ہو گئی۔ اس بار بھی مجھے ہوٹل کی دوسری منزل ہی پر ایک کمرہ ملا تھا۔

”کل کرے سو آج کر“ کی مصداق میں اسی دن شام کو نارائن گنج کا ایک چکر لگانے کیلئے اپنے ہوٹل سے نواب پور روڈ کیلئے روانہ ہو گئی۔ میرا ارادہ تھا کہ رات گئے تک ڈھاکہ لوٹ آؤں گی۔ میں نے دانستہ ایسا لباس زیب تن کیا تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ میں ایک ٹورسٹ ہوں۔

شام ساڑھے پانچ کے قریب میں نارائن گنج پہنچ گئی۔ وہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ راہ چلتے ہوئے میں نے ایک شخص سے ضیاء الاسلام کی حویلی کا پتا معلوم کیا اور پھر اس طرف بڑھنے لگی۔ حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے میں اپنے ذہن میں آئندہ اقدام کا خاکہ ترتیب دے رہی تھی۔

ضیاء الاسلام کی حویلی کافی وسیع و عریض رقبے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں پہنچ کر جب یہ بتایا کہ میں ضیاء الاسلام سے ملنا چاہتی ہوں تو مجھے حویلی کی نشست گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ بعد بھاری تن و توش کا ایک شخص نشست گاہ میں داخل ہوا اور میں اخلافاً اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”بیٹھے..... بیٹھی رہنے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بھی مجھے بیٹھنے کو کہا۔ پھر بولا۔ ”خانم پہلی بار آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔“ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جی ہاں۔“ میں بولی۔ ”دراصل میں ایک ٹورسٹ ہوں اور مغربی پاکستان کے ایک شہر راولپنڈی سے یہاں آئی ہوں۔ اس بستی میں کوئی ہوٹل وغیرہ نہیں ورنہ میں آپ کو زحمت نہ دیتی۔ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک مہمان نواز آدمی ہیں اور اس علاقے میں جو ٹورسٹ وغیرہ آتے ہیں آپ ہی کی

نظر یہ کہ تم نے جس طرح میرے غیر ملکی مہمانوں کا ذکر کیا، اس سے بھی مجھے اشارہ مل گیا کہ تم درحقیقت کون ہو اور کسی غرض سے یہاں آئی ہو! یہ بات بہر حال اتنی عام نہیں تھی کہ میری حویلی میں غیر ملکی بھی ٹھہرتے ہیں۔ کسی اجنبی کو یہ علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان باتوں کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا جاسکتا تھا کہ میں جس کا منتظر تھا وہ تمہی ہو!“

اس کی باتوں میں وزن تھا۔ مجھ سے بہر حال غلطی ہوئی تھی اور اب میں غلطی کا خمیازہ بھگتنے والی تھی۔

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ اور مجھے اپنی قید میں کیوں رکھنا چاہتے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”حیرت ہے عذرا خان کہ تم یہ سوال کر رہی ہو! تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری یہاں موجودگی کا مطلب کیا ہے!..... کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ یہاں تمہاری آمد کے مقصد سے ہم واقف نہیں ہیں!..... اگر واقعی ایسا ہی ہے تو تم غلطی پر ہو تمہیں آزاد چھوڑ دینا ہمارا۔ عزائم کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہے۔“

”مجھے یہ بتاؤ ضیا الاسلام کہ اپنے وطن سے غداری کرنے پر تمہیں کس چیز نے مجبور کیا؟“ میرے لہجے میں جھین تھی۔

”غداری!..... کیسی غداری!..... ہم اپنے حقوق کے حصول کی خاطر جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں اور یہ جدوجہد بہ یک وقت پورے بنگال سے شروع ہوگی۔“

”پورے بنگال سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے چونک کر دریافت کیا۔

”پورے بنگال سے مراد پورا بنگال ہے۔ بنگال کو دو ٹکڑوں کے اس پر ظلم کیا گیا ہے۔ ہم بنگال کو پھر ایک دیکھنا چاہتے ہیں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر ماضی میں جو غلط فیصلہ کیا گیا تھا، ہم اس فیصلے کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ گریٹر بنگال کا حصول ہماری منزل ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہم اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔“

”ضیا الاسلام! تم یقیناً حقوق کی جنت میں رہتے ہو تاریخ کے فیصلے اس طرح نہیں بدلا کرتے۔“

”وہ تاریخ کا فیصلہ نہیں تھا عذرا خان!“ وہ بھرپور یقین کے ساتھ بولا۔ ”وہ ایک جذباتی اور وقتی فیصلہ تھا جسے آنے والا وقت غلط ثابت کر دے گا۔ عظیم بنگال کا خواب ایک دن ضرور پورا ہوگا۔ تم دیکھنا عذرا خان کہ ایک دن بنگال آزاد ہو جائے گا۔“ کیا اس وقت تم بنگال کو غلام سمجھتے ہو؟“

”ہاں میں اسے غلامی ہی کہوں گا۔ بنگال کو دو ٹکڑوں کے دو حکومتوں نے اسے اپنا غلام بنالیا ہے۔“

”تم نے یقیناً تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ہرگز ایسا نہ کہتے۔ تم بھول رہے ہو ضیا الاسلام کہ یہ ملک کیوں اور کس لئے حاصل کیا گیا تھا! اگر یہ ملک نہ بننا تو تم ہندو کے زیر دست ہوتے، تمہیں ہندو کی برتری تسلیم کرنا پڑتی اور یوں ایک طرح سے تم اس کے غلام بن جاتے۔“

ایسے لمحات میری زندگی میں بار بار گزرے ہیں، جب موت اور زندگی کے درمیان صرف چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا ہو مگر میں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا، میرا ایمان ہے کہ موت کا جو وقت مقرر ہے اس پہلے کوئی بھی مجھے نہیں مار سکتا، اسی کے ساتھ یہ بھی میرے ایمان کا حصہ ہے کہ اپنی تمام تر حیرت انگیز قوتوں کے باوجود میں موت کے لمحے کو نہیں ٹال سکتی۔ اسی یقین نے میرے اندر ایک بے خوفی سی پیدا کر دی تھی اور اسی کے سبب موت کو سامنے دیکھ کر بھی میں کبھی نہیں گھبرائی جو مقصوم کر دیا گیا ہے، اسے کوئی بدل نہیں سکتا، اس اعتماد نے ہمیشہ مجھے جینے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ اسی حوصلے نے اس وقت بھی میرا ساتھ دیا جب میں نے بہ یک وقت کئی رافٹوں کا رخ اپنی جانب دیکھا۔ ضیا الاسلام کے چہرے سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت نہیں کرے گا۔ مجھے پیش آنے والا واقعہ غلطی غیر متوقع تھا ورنہ ممکن ہے کہ میں چونکا ہونے کی صورت میں اتنی آسانی کے ساتھ اپنے دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ جاتی۔

ضیا الاسلام نے ابھی جو مجھ سے کہا تھا وہ بھی میرے لئے حیران کن ہی تھا۔ نارائن گنج میں میری آمد کا وہ پہلے ہی سے منتظر تھا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے معاً ضیا الاسلام کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں کیسے یقین تھا کہ میں نارائن گنج ضرور آؤں گی؟“

”ہمیں یہ اطلاع مل گئی تھی کہ تم ڈھاکہ پہنچ چکی ہو۔“ وہ بولا۔ ”ڈھاکہ پہنچنے کے بعد تم ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے ملو گی، یہ بھی ہمارے علم میں تھا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ڈھاکہ کی نواحی بستیاں ان دنوں انٹیلی جنس والوں کی نظر میں ہیں۔ ہوم سیکرٹری سے ملنے کے بعد تمہیں یقیناً ادھر ہی کا رخ کرنا چاہئے تھا، لیکن تم اتنی جلد بازی کا ثبوت دو گی یہ توقع ہمیں بہر حال نہیں تھی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ تم دو ایک روز بعد ادھر آؤ گی۔“

”میک اپ کے باوجود تم نے کس طرح مجھے پہچان لیا کہ میں ہی عذرا خان ہوں؟“ میں نے اپنے تجسس کے زیر اثر ایک اور سوال کیا۔

”سنو عذرا خان! یہ مشرق ہے مغرب نہیں! وہ مسکرا کے کہنے لگا۔“ مشرق اور خصوصاً ہمارے ملک کی عورت ابھی اتنی ایڈوانس نہیں ہوئی کہ تن تنہا یوں سپر تفریح کرتی پھرے۔ وہ بھی اجنبی علاقوں اور اجنبی لوگوں کے درمیان! اور نہ ہی وہ اس طرح کہیں کسی اجنبی سے میربانی کیلئے کہہ سکتی ہے۔ اس سے قطع

اسی کے ساتھ مسلح افراد نے مجھے اپنے زرعے میں لے لیا اور پھر اس نشست گاہ سے باہر نکال لائے۔ مہری پشت پر ایک رائل کی ٹال لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ میں ان کے زرعے سے نکلے کیلئے کوئی قدم نہ اٹھا سکی۔ ضیا الاسلام وہیں نشست گاہ میں رہ گیا تھا۔

وہ مسلخ افراد مجھے حویلی ہی کے ایک حصے میں لے آئے۔ یہ حصہ دو کمروں پر مشتمل تھا جس میں ضروریات کی ہر شے موجود تھی۔ ایک کمرہ نسبتاً بڑا تھا۔ دونوں کمروں کے سامنے چھوٹی سی راہداری تھی، پھر صدر دروازہ تھا، راہداری ہی کی ایک جانب ہاتھ روم اور کچن تھا۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ کچن میں تمام ضروری سامان موجود ہے، میں جب چاہوں وہاں جا کر اسے کھانے پینے کا بندوبست کر سکتی ہوں۔ میرے لئے کھانے پینے کا سامان لے کر وہاں آنے کی کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ چھوٹے کمرے میں آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا، بڑا کمرہ بطور لکھت گاہ استعمال کیا جاسکتا تھا، وہاں میز اور کرسیاں بھی تھیں۔ ان لوگوں نے خود مجھے تمام چیزیں دکھا دی تھیں تاکہ وہ چلے جائیں تو مجھے کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں میری حیثیت کسی نظر بند فرد کی سی تھی۔ اسے بہر حال قید کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

وہ لوگ مجھے حویلی کے اس حصے میں چھوڑ کر چلے گئے تو میں بڑے کمرے میں آ کر ایک آرام دہ کرسی پر ٹہم دراز ہو گئی۔ صدر دروازہ انہوں نے باہر سے مقفل کر دیا تھا۔ میں نے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی تھی۔ میں دیکھ چکی تھی کہ دونوں کمروں میں کوئی کھڑکی نہیں ہے راہداری بھی اوپر سے پٹی ہوئی تھی۔ بظاہر وہاں سے فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ کھانے پینے کا سامان بھی کیونکہ وہیں موجود تھا اس لئے وہاں کسی کے جلد آنے کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

وقتِ ستِ رفتاری سے گزرتا رہا اور پھر مجھے جھوک محسوس ہونے لگی وہاں لاش بھی تھی۔ میں نے کلائی ہنسی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا رات کے سوا دس بجتے والے تھے۔ میں کمرے سے نکل کر بچن میں آگئی اور کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔ اس میں تقریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ میں نے دو انڈوں سے آلیٹ بنا لیا تھا اور اس میں ڈبل روٹی سے کھا کر چائے پی لی تھی۔

میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آسکا تھا کہ یہاں سے رہائی کس طرح مل سکتی ہے! میں اسی سوچ بچار میں چھوٹے کمرے میں آکر بستر پر دراز ہو گئی پھر نہ معلوم کب میری آنکھ لگ گئی، سونے کا ارادہ نہیں تھا اس لئے کمرے کی لائٹ میں بچھا نہیں سکی تھی۔

معلوم نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ ایک غیر مانوس سی آواز سن کر میں جاگ اُٹھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کہیں قریب ہی کوئی درندہ غرا رہا ہے، پھر اچانک میری سماعت سے ایک تیز اور خوفزدہ سی نسوانی چیخ گرائی۔ اسی کے ساتھ میں بستر پر اچھل کر بیٹھ گئی۔ درندے کے غرائے کی آواز دربارہ سنائی دی، نسوانی چیخیں پھر آئیں اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگا جیسے اس درندے نے پیچنے والی کا گلا دبوچ لیا۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ کوئی اور آواز سنائی دے، مگر ہر طرف سکوت چھایا رہا۔ درندے کی خراہٹوں اور انسانی چیخوں کو میں کوئی معنی نہیں دے سکتا۔ میں نے اٹھ کر قریبی بڑے کمرے اور راہداری کا جائزہ لیا مگر وہاں کے اس حصے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح مجھے نیند آجائے۔

”اور اب..... اب کیا ہم اپنوں ہی کے زیر دست نہیں ہیں؟“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔
 ”ہماری زبان کو قومی زبان کی حیثیت حاصل نہیں جبکہ ہم اکثریت میں ہیں۔“

”قومی زبان تو اردو ہے اور اسے خود تمہارے بڑے تسلیم کر چکے ہیں۔“

”ہاں مجھے یاد ہے..... اچھی طرح یاد ہے..... یہیں بنگال میں قائد اعظم سے ایک جلسے میں سوال کیا گیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان کیا ہوگی؟ انہوں نے جواب دیا تھا ’اردو! اور لفظ ’اردو‘ زور دے کر بہ آواز بلند مین بار انہوں نے دہرایا تھا۔ میں اس جلسے میں موجود تھا عذرا خان! یہ واقعہ اس ملک کے بننے سے کچھ دن پہلے کا ہے۔“

”پھر اب تم لوگ اردو کو قومی زبان تسلیم کیوں نہیں کرتے؟“
 ”اس لئے کہ ہماری قومی زبان..... بنگال کی قومی زبان بنگلہ ہے اردو نہیں ہے!..... اور ہم بنگلہ کو قومی زبان تسلیم کرا کے رہیں گے!“

”گویا اس طرح تم لوگ قائد اعظمؒ کے فرمان کی تردید کرنا چاہتے ہو۔“

”تم اسے جو چاہو نام دے سکتی ہو عذرا خان، مگر ہم اپنا یہ حق ضرور حاصل کریں گے۔“ اس کے لہجے میں عزم تھا۔

”میرا خیال ہے، ابھی خود تمہارے ذہنوں میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ تم لوگ دراصل کیا چاہتے ہو؟ ایک طرف تو تم پورے بنگال کی غلامی کا رونا رو رہے ہو اور اس کی آزادی کیلئے جدوجہد کا آغاز کرنا چاہتے ہو دوسری طرف بنگلہ کو قومی زبان تسلیم کرانے کی بات کر رہے ہو!“

”ہم اچھی طرح جانتے ہیں عذرا خان کہ ہمارا کیا ہے!“ وہ پریقین آواز میں بولا۔ ”سب کچھ ایک ساتھ نہیں ہو جاتا، مرحلہ وار ہوتا ہے! پہلے ہم اپنی زبان کو قومی زبان تسلیم کرنا میں گئے۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی ناممکن یا انہونی بات نہیں ہے، تم دیکھو گی کہ بہت جلد ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہم اکثریت میں ہیں اور جمہوریت میں اکثریت ہی کی چلتی ہے۔“

”تو تمہارا کہنا یہ ہے کہ مستقبل میں اس ملک کی دو قومی زبانیں ہوں گی ایک بنگلہ اور دوسری اردو!“

”بالکل !..... ہم ایک الگ قوم ہیں اور ہماری قومی حیثیت بہر حال تسلیم کرنا پڑے گی۔“

اس وقت ضیا الاسلام کی باتیں سن کر مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی تھی، ایک ایسا خطرہ جو مستقبل میں میرے ملک پر منڈلانے والا تھا۔ بلکہ کو قومی زبان تسلیم کرنے کا مطلب بنگالیوں کو بھی ایک الگ قوم تسلیم کرنا ہوتا۔ ایسی صورت میں ایک الگ قوم کی حیثیت سے مستقبل میں وہ الگ ملک کا مطالبہ بھی کر سکتے تھے۔ میرے ذہن میں قائد اعظمؒ کے الفاظ گونجنے لگے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں پھر دو قومی نظریے ہی کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اس وقت یہ مسئلہ نہیں اٹھا تھا کہ بنگال ایک الگ قوم ہیں۔

”تم کس سوچ میں پڑ گئیں عذرا خان!“ فیا الاسلام نے مجھے خیالوں میں کھویا ہوا دیکھ کر ٹوکا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں جو کچھ معلوم ہو چکا ہے کافی ہے اب تم میری مہمان بن کر آرام کرو! یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی، مگر یہ خیال رکھنا کہ فرار کی کوشش تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے مسلح آدمیوں سے مخاطب ہوا۔ ”انہیں لے جاؤ!“

”اب یہ کھیل ختم کر دو عذرا خان!“ اچانک ضیا الاسلام بھاری آواز میں بولا۔

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ریوانور نظر آ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی سولوسن کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ جہاں میں کھڑی تھی اسی کی دہائی جانب مجھے ایک زینہ نظر آ رہا تھا زیادہ سوچ بچار کے بجائے میں نے عمل کو ترجیح دی اور دوسرے ہی لمحے زینے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت ضیا الاسلام نے مجھ پر فائر کیا اور گولی میرے قریب سے گزری۔

”یہ کیا حماقت کر رہے ہو تم!“ میں نے سولوسن کی آواز سنی۔ وہ یقیناً ضیا الاسلام کو فائر کرنے پر ڈانٹ رہا تھا۔ ”اسے زندہ پکڑنا ہے!..... اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم کرنا ہے“ کیا خبر اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھی بھی ڈھاکہ پہنچ گئے ہوں یا پہنچنے والے ہوں! وہ اگر ہماری راہ پر لگ گئے تو بہت برا ہوگا۔“

پھر ضیا الاسلام نے مجھ پر دوسرا فائر نہیں کیا اور میں تیزی سے زینے کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ ”وہ اوپر گئی ہے۔ اسے گھیرو!..... پکڑو!..... نکل کر جانے نہ پائے! ضیا الاسلام بلند آواز میں اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔

اب میں سیڑھیاں چڑھ کر حویلی کی چھت پر پہنچ چکی تھی اور نیچے سے مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے چھت کی چار دیواری کے قریب پہنچ کر نیچے جھانکنا بلندی خاصی تھی۔ وہاں سے نیچے کودنا آسان نہیں تھا مگر اس کے سوا مجھے کوئی چارہ کار بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی میں تذبذب کا شکار تھی کہ کیا کروں؟ کئی افراد چھت پر چڑھ آئے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں مجھے رسی کے بڑے بڑے پھندے نظر آ رہے تھے۔ رسی کے ایسے پھندے عموماً جانوروں کو قابو میں کرنے کیلئے اوپر کی طرف پھینکے جاتے ہیں۔ اچانک ایک شخص نے رسی کا موٹا پھندا میری طرف پھینکا پھندا پھینکنے میں وہ شخص یقیناً بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اگر میں تیزی سے ایک طرف نہ ہو جاتی تو میرا جسم پھندے کی گرفت میں آ گیا ہوتا پھر اس سے پہلے کہ دوسرا شخص مجھ پر پھندا پھینکتا، میں چھت کی چار دیواری پر چڑھ گئی۔ اب ان لوگوں سے بچنے کی یہی صورت ممکن تھی کہ میں نیچے چھلانگ لگا دیجی اور پھر میں نے یہی کیا۔

اتنی بلندی سے نیچے کودنے کے سبب میرے دونوں پیر جھنجھنا گئے اور میں ایک طرف لڑھک گئی۔ زمین نرم تھی ورنہ مجھے چوٹ ضرور لگتی۔ ان لوگوں کو شاید یہ توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں چھت کی چار دیواری پر چڑھ کر نیچے کود جاؤں گی ورنہ وہ اس کا بھی بندوبست ضرور کرتے۔ میں چند لمحے زمین پر پڑی رہی، پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ قدم اٹھاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرے بائیں پیر کے نیچے میں ہلکی سی سوچ آگئی ہے مگر یہ تکلیف میرے لئے قابل برداشت تھی، میں اپنے جسم کا زیادہ بوجھ دائیں پیر پر ڈال کر آگے بڑھنے لگی، جلد از جلد میں اس حویلی سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔

گھنے درختوں کے ایک جھنڈ سے نکل کر میں کچھ ہی دیر میں ایک نیم پتھر سڑک پر نکل آئی۔ چند ہی لمحے بعد دائیں جانب سے مجھے ایک بس آتی دکھائی دی۔ میں نے اسے روکنے کیلئے ہاتھ اٹھا دیا۔ بس میرے قریب آ کر رک گئی۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ بس ڈھاکہ جا رہی تھی، میں اس میں بیٹھ گئی۔

بس میں ڈھاکہ کی طرف جاتے ہوئے میرا ذہن سولوسن اور ضیا الاسلام ہی میں الجھا ہوا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ میں ان کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میرا یہ سفر کامیاب ہی رہا تھا، کم از کم ضیا

مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ صبح تک میں جاگتی ہی رہی۔ میں نے اس دوران میں ایک مرتبہ چائے بنا کر بھی پنی صبح ناشتہ بھی مجھے خود ہی بنانا پڑا۔ میں بڑے کمرے میں ناشتہ کر رہی تھی کہ کچھ کھٹکا سامحوس ہوا جیسے کوئی صدر دروازہ کھول کر اندر آ رہا ہو۔ کچھ سوچ کر میں ایک دم اٹھی اور اس کمرے میں موجود الماری کی آڑ میں ہو گئی۔ اب اس کمرے میں داخل ہونے والا فوری طور پر مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ چند لمحے اور گزرنے پر پھر کمرے کے باہر مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یقیناً صدر دروازہ کھول کر ایک سے زیادہ افراد اندر آئے تھے۔ قدموں کی چاپ سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔

مجا مجھے ایک آشنا آواز سنائی دی، کوئی شخص کسی سے انگریزی میں مخاطب تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ عذرا خان اتنی آسانی سے قابو میں آ سکتی ہے، کہیں وہ کوئی اور لڑکی تو نہیں؟“ ”نہیں“ وہ عذرا خان ہی ہو سکتی ہے۔“ جوابا کہا گیا۔ یہ آواز مجھ میرے لئے اجنبی نہیں تھی جوابا بولنے والا ضیا الاسلام تھا۔ ”عذرا خان کے سوا یہاں اور کون آ سکتا ہے!“

”تمہیں چاہئے تھا کہ اس کا میک اپ ختم کرا کے یقین کر لیتے۔“ انگریزی میں پھر کہا گیا۔ بولنے والا یقیناً امریکی ایجنٹ سولوسن ہی تھا۔ ”خیر میں اسے دیکھ لیتا ہوں۔“ آواز دور دوری چلی گئی۔ میرے اندازے کے مطابق سولوسن اور ضیا الاسلام پہلے میری تلاش میں چھوٹے کمرے کی طرف گئے تھے۔

موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بچوں کے بل چلتی ہوئی بڑے کمرے سے نکل کر راہداری میں آ گئی۔ اسی وقت میری نگاہ صدر دروازے پر پڑی جو نیم وائلز نظر آ رہا تھا۔ قدموں کی آواز پیدا کئے بغیر میں تیزی کے ساتھ صدر دروازے کی طرف لپکی۔ ابھی میں دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ عقب سے ضیا الاسلام کی تیز آواز سنی۔ ”رک جاؤ عذرا خان! ورنہ..... ورنہ میں گولی مار دوں گا!“

مڑے بغیر میں نے جست بھری اور پھر صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ دروازے کے باہر دو مسلح افراد موجود ہوں گے۔ اسی لئے نادانستگی میں چوٹ کھا گئی۔ مسلح افراد میں سے ایک نے اپنی رائفل کا بٹ میرے سر پر مارنا چاہا تھا اور میں جھٹکی دے گئی تھی۔ رائفل کا بٹ میرے شانے پر پڑا تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ میرے منہ سے نیچ نکل گئی۔ اسی کے ساتھ میں پکرا کر زمین پر گر پڑی۔ بے خبری و بے حواسی کے وہ بس چند ہی لمحے تھے اگر وہ لمحے کچھ اور طول پکڑ جاتے تو شاید پھر میں کچھ بھی نہ کر پاتی۔ کسی نے جیسے میرے اندر سرگوشی کی عذرا خان! اگر تم اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکیں تو پھر یہاں سے کبھی فرار نہ ہو سکو!

میرے زمین پر گرتے ہی دونوں مسلح افراد مجھ پر جھپٹ پڑے تھے۔ میں نے زمین سے اٹھنے اٹھتے ان میں سے ایک کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی اور وہ شخص منہ سے مسلح شخص کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا پھر میرے اور اس کے درمیان رائفل چھیننے کیلئے زور آزمائی ہونے لگی۔ رائفل غالباً لوڈ نہیں تھی ورنہ ہم دونوں ہی کو یہ زور آزمائی پہنچی پڑتی۔ وہ شخص مجھ سے رائفل چھیننے کیلئے اپنی طرف زور لگا رہا تھا اور میں اپنی طرف! اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے اچانک رائفل چھوڑ دی اور وہ شخص اپنے ہی زور میں پیچھے جا پڑا۔ اسی دوران میں سولوسن اور ضیا الاسلام دونوں ہی باہر آ چکے تھے۔ پہلا مسلح شخص ابھی تک زمین ہی پر پڑا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر سے اس کا سر گرا گیا تھا جس کے سبب شاید وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔

”تم یقیناً ایک ذہن نو جوان ہو باور کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود تمہیں میری آواز یاد رہی میں تمہیں مزید پریشان نہیں کروں گی۔ اس وقت میرے چہرے پر میک اپ ہے ورنہ تم مجھے دیکھتے ہی پہچان جاتے۔ میں عذرا خان ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”عذرا خان!..... آپ..... آپ کب آئیں؟ اور..... آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں کہاں.....“

”میں تمہاری کوشی گئی تھی کل“ میں نے بتایا۔ ”وہیں سے مجھے یہاں کا پتا معلوم ہوا تمہاری بہن نسرین نے یہ پتا لکھ کر دیا تھا۔“

”میں تو ابوس ہی ہو چکا تھا آپ کی طرف سے کہ شاید اب کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ یہ کہتا ہوا وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔“ یہ بتائیں کہ آپ کہاں ٹھہری ہیں؟“

”انیز پورٹ کے قریب ایک ہوٹل میں میرا قیام ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور ابھی مجھے یہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں۔“

”ٹھہریں“ میں ابھی آیا ذرا چائے کیلئے کہہ دوں۔“ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا پھر خود ہی رک کر بولا۔

”ارے ہاں ناشتہ بھی کر لیا ہے آپ نے یا نہیں؟“

”تکلف کی ضرورت نہیں باور میں ناشتہ کر کے آئی ہوں ہاں چائے پی لوں گی۔“ میں بولی۔

”اچھا“ چائیں چائے ہی سہی! یہ کہتے ہوئے وہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اس سے مل کر مجھے واقعی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈھاکہ میں وہ میرے لئے بہت مددگار و معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ لوٹ آیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں اب کہیں یہ اچانک آپ یہاں کیسے آگئیں؟“

”اچانک تو خیر نہیں“ میں نے کہا۔ ”کافی دن سے میرا یہاں آنے کا پروگرام بن رہا تھا یہاں میں ایک اہم معاملے کی تفتیش کرنے آئی ہوں۔“

”وہ تو میں آپ کے چہرے پر میک اپ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیں!“

میں نے چند لمبے وقف کیا پھر بولی۔ ”یہ بتاؤ باور کیا تمہارے سفر پرے کچھ دن کیلئے کوئی امکان کرائے پر مل سکتا ہے؟“

”کیا آپ رہیں گی اس میں؟“ اس نے سوال کیا۔

”ہاں میں نے جواب دیا۔“ ہوٹل میں قیام میرے لئے مشکلات پیدا کر سکتا ہے بہتر یہی ہے کہ.....“

”میں سمجھ رہا ہوں“ وہ میری بات کاٹ کر بولا پھر کہنے لگا۔ ”کیا آپ یہاں میرے ساتھ رہ سکتی ہیں؟“

”تمہارے ساتھ!“ میں حیرت سے بولی۔

”ہاں کیوں کیا حرج ہے! اس مکان میں تین کمرے ہیں اور یہاں میرے ساتھ صرف فرید رہتا ہے اس کے علاوہ ایک ملازم لڑکا ہے ہم ایک کمرہ آپ کیلئے پسیر کر سکتے ہیں۔“

”مگر اس کمرے کی حالت دیکھ کر تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جگہ کی قلت ہے۔“ میں نے کہا۔

الاسلام کے بارے میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ امریکی ایجنٹوں کا آلہ کار بنا ہوا ہے۔ اس سے میری جو گفتگو ہوئی تھی وہ بھی میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اس گفتگو کی روشنی میں یہ آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ سازش کا جال بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بنگال کا جو حصہ ہندوستان میں تھا وہ بھی اس سازش کی لپیٹ میں تھا۔ بجا طور پر اسے علیحدگی پسندانہ رجحان کہا جاسکتا تھا۔ گریٹر بنگال کا یہ منصوبہ یقیناً امریکیوں ہی کے ذہن کی اختراع تھی۔ اہل بنگال کو محرومی کا احساس دلا کر وہ اپنے مذموم عزائم پورے کرنا چاہتے تھے۔ یہ معاملہ ہر حال ایسا نہیں تھا کہ اسے غیر اہم سمجھ کر ٹال دیا جاتا۔ میرے خیال میں یہ خطرے کی گھنٹی تھی جس کا تذکرہ فوری طور پر ضروری تھا۔ صدر مملکت کی طرف سے مجھے جو اختیارات حاصل تھے وہ بھی میری نظر میں تھے مگر میں ان اختیارات کو مناسب موقع پر استعمال کرنا چاہتی تھی۔ جب تک بس ڈھاکہ کی حدود میں داخل نہ ہوگی میں انہیں خیالات کے تانے بانوں میں الجھی رہی۔

بس سے میں نواب پور روڈ اتر گئی۔ وہاں سے بادام تلی گھاٹ زیادہ دور نہیں تھا اس لئے میں نے ایک بار پھر باور کو وہاں دیکھ لینے کا فیصلہ کیا۔ گزشتہ روز اس سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ ابھی صبح کے نو ہی بجے تھے۔ مجھے امید تھی کہ باور اپنے دوست کے گھر سے نہیں نکلا ہوگا پھر جب میں مطلوبہ مکان تک پہنچی تو میری توقع پوری ہوئی۔ اگر مجھے مزید پانچ منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو شاید باور سے آج بھی ملاقات نہ ہو پائی۔ وہ بس کہیں جانے ہی والا تھا۔

دروازے پر دستک کے جواب میں باور کا دوست فرید احمد ہی آج بھی باہر آیا تھا اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ کل جب میں آئی تھی تو میرے چہرے پر دوسرا میک اپ تھا۔ وہ اس لئے مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔

”جی فرمائیے!“ اس نے مجھ سے کہا تھا۔

”مجھے آپ کے دوست باور سے ملنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک وقت پر آگئیں آپ..... وہ بس گھر سے نکلنے ہی والا تھا“ تشریف لائے! وہ ایک طرف ہو گیا تاکہ میں اندر داخل ہو سکوں۔

میں بلا جھجک دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ فرید احمد نے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لا کر بٹھا دیا جو ڈرائنگ روم کے ساتھ ساتھ کسی کی خواب گاہ بھی معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہاں میز کرسیوں کے علاوہ ایک پینک بھی پڑا تھا۔

”آپ بیٹھے“ میں باور کو ابھی بھیجتا ہوں۔“ یہ کہہ کر فرید احمد اندرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد اندرونی دروازے کا پردہ اٹھا کر باور اس کمرے میں آ گیا۔ اسے میں نے کئی سال بعد دیکھا تھا لیکن پہچاننے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس عرصے میں صرف اس کی مونچھوں میں اضافہ ہوا تھا۔ پہلے اس کی مونچھیں اتنی گھنی نہیں تھیں۔

”خانوں! آپ کو مجھ سے ملنا ہے نا؟“ باور میرے قریب آتے ہوئے بولا۔

”ہاں باور تمہی سے ملنا ہے مجھے!“ میں نے مسکرا کر کہا۔

میری آواز سن کر وہ چونکا اور پھر مجھے حیران حیران سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”آپ..... آپ کی آواز تک کچھ..... کچھ آشنائی لگ رہی ہے مگر صورت..... وہ کہنے لگا۔

”مجھے بالکل یقین آ گیا اور یہ بھی کہ آپ نے شکنتلا کو ضرور دیکھا ہے۔“
اس کے بعد باہر نے مجھے کریدنے کی بہت کوشش کی کہ میں سیودکرجی اور شکنتلا کو کیسے جانتی ہوں مگر فی الحال میں نے اسے کچھ نہیں بتایا اور چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
”پھر آپ آج شام کو آ رہی ہیں نا؟“ چلتے چلتے باہر نے تصدیق چاہی۔
”ہاں ضرور!“ میں نے اسے یقین دلایا اور پھر ”خدا حافظ“ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔
باہر سے ملنے کے بعد اب ایک بار پھر میرا ارادہ ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری سے ملنے کا تھا۔ میں نے اسے دھان منڈی کی جس کوٹھی کا نمبر دیا تھا اس کے بارے میں بھی معلوم کرنا تھا۔ ٹیکسی کر کے میں گرین روڈ کیلئے روانہ ہو گئی۔

عبید الرحمن چودھری کے دفتر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہے۔ اس سے ملاقات کی خاطر مجھے تقریباً پون گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ مجھے نئے میک اپ میں دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ اس کے پی اے نے بھی اس وقت حیرت کا اظہار کیا تھا جب میں نے اسے اپنا نام بتایا۔
”آپ کو پھر نئے میک اپ کی ضرورت پیش آ گئی“ عبید الرحمن چودھری نے کہا۔

”ہاں میں نے ضرورت ہی ایسا کیا ہے۔“ میں بولی۔ پھر اس سے پوچھا ”دھان منڈی کی جس کوٹھی کا نمبر میں نے کل آپ کو دیا تھا اس کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟“

”جی ہاں“ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”وہ کوٹھی حزب اختلاف کے ایک لیڈر ایس رحمن کی ہے جس کا قیام ان دنوں مغربی پاکستان میں ہے۔ اطلاعات کے مطابق یہ کوٹھی گزشتہ چھ ماہ سے خالی پڑی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ اس خالی کوٹھی کو اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر استعمال کر رہے ہیں اور ایس رحمن کو اس کا علم نہیں۔“

”یہ کوئی ضروری نہیں۔“
”کیا؟“

”جی نہیں کہ ایس رحمن لاعلم ہو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ویسے مشرقی پاکستان کے بجائے وہ مغربی پاکستان میں کیوں رہ رہا ہے اور وہاں اس کا قیام کس شہر میں ہے؟“

”یہ تو معلوم نہیں کہ گزشتہ چھ ماہ سے وہ مغربی پاکستان میں کیوں رہ رہا ہے ہاں یہ ضرور معلوم ہے کہ اس کا قیام راولپنڈی میں ہے۔“ عبید الرحمن چودھری نے بتایا۔

”یہاں اس کے کچھ عزیز واقارب تو ہوں گے!“
”ممکن ہے کہ ہوں۔“

”تو ان کے بارے میں معلومات حاصل کرائیں۔“ میں نے کہا۔

”بہتر ہے لیکن..... اس کا فائدہ؟“

”قبل از وقت کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اس طرح بات آگے ضرور بڑھ سکتی ہے۔ اس کے عزیز واقارب میں کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو سیودکرجی کے قریب ہو یا اس کا آلہ کار بن گیا ہو۔ سیودکرجی نے مجھے انوار کے ذہن لانے کا حکم دیا تھا اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ کوٹھی سیودکرجی کے تعارف میں رہتی ہے۔“

”نہیں“ وہ بولا بات یہ ہے کہ تیسرے کمرے کو فرید نے سنور بنا رکھا ہے۔ اس کی صفائی کی جاسکتی ہے میری درخواست یہی ہے کہ آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں۔“

”تمہارا اصرار ہے تو مان جاتی ہوں میں پھر بتاؤ میں کب تک یہاں آ جاؤں؟“ میں نے پوچھا۔

”آج شام تک وہ کمرہ رہنے کے قابل بنایا جائے گا“ آپ آج ہی آ جائیں اپنا سامان لے کر!“

”ٹھیک ہے تو پھر چلتی ہوں اب!“

”اور چائے؟“

”ارے ہاں وہ تو میں بھول ہی گئی چلو کچھ دیر اور بیٹھ جاتی ہوں۔“

”آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اہم معاملہ ہے کیا جس کی تفتیش کیلئے آپ یہاں آئی ہیں!“ باہر بولا۔

”یہاں آ جاؤں گی تو اس کے بارے میں بھی تمہیں معلوم ہی جائے گا۔“

ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ ایک چندرہ سالہ لڑکا چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہو گیا۔

باہر کے اشارے پر وہ درمیانی میز کی طرف بڑھ آیا اور چائے کی پیالیاں ٹرے سے اٹھا کر باری باری میرے اور باہر کے سامنے رکھ دیں۔

ملازم لڑکا چائے دے کر چلا گیا تو اچانک مجھے ایک خیال آیا اور اسی خیال کے زیر اثر میں نے باہر سے پوچھا۔

”تم سیودکرجی کو جانتے ہو؟“

میرے اس سوال پر وہ ایک دم چونک اٹھا۔ ”آپ اسے کیسے جانتی ہیں؟“

”میرا خیال ہے باہر کہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے!“

”سوری!“ وہ کچھ چل سا ہو گیا۔ ”دراصل غیر متوقع طور پر آپ کی زبان سے سیودکرجی کا نام سن کر میں کچھ حیران سا ہو گیا تھا“ خیر..... اس شخص کو آپ مشرقی پاکستان کے زیر زمین جرائم پیشہ افراد کا بے تاج بادشاہ

کہہ سکتی ہیں۔ اسے آج تک صرف چند افراد کے سوا کسی نے نہیں دیکھا۔ ان دنوں میں اس کی راہ پر لگا ہوا ہوں۔“

”شکنتلا کو بھی جانتے ہو تم؟“ میں نے مزید سوال کیا۔

”جی ہاں“ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”یہ عورت اس کی محبوبہ کہلاتی ہے یہ بھی سیودکرجی کی طرح

پراسرار ہے۔“

”مراد یہ کہ اسے بھی کسی نے نہیں دیکھا کیا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”جی..... جی ہاں“ مگر ایک بار اس سے میری مٹ بھینٹ ہو چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شکنتلا ہی ہو سکتی

تھی۔“

”میں اس بات کی تصدیق کر سکتی ہوں کہ تمہاری مٹ بھینٹ شکنتلا ہی سے ہوئی تھی یا تم کسی اور سے ٹکرائے

تھے؟“ میں مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ کس طرح؟“ باہر حیران سا ہو کر کہنے لگا۔

”میں تمہیں اس کا حلیہ بتا سکتی ہوں۔“ پھر میں نے شکنتلا کا حلیہ بیان کر دیا۔

”بالکل!..... قطعی یہی حلیہ تھا اس کا!“ باہر نے پر جوش لہجے میں کہا۔

”تو پھر یقین کر لو کہ وہ شکنتلا ہی تھی۔“

”جی ہاں جو واقعہ آپ کو پیش آیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ عبید الرحمن چودھری میری تائید

میں بولا۔

”ضیا الاسلام کے بارے میں تفتیش کچھ آگے بڑھی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”ابھی تو بات وہیں کی وہیں ہے۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ اسے گرفتار کر لیا جائے؟“

”مگر کس جرم میں؟..... ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں۔“ وہ بولا۔

”شے میں بھی تو گرفتاری ممکن ہے نا!“ میں نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس سے حاصل کیا ہوگا؟“

سین چودھری صاحب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ضیا الاسلام امریکی ایجنٹوں کا آلہ کار ہے

اور یہ بھی کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔“

”میں ثبوت ہی کی تو بات کر رہا تھا اگر ثبوت موجود ہے تو پھر گرفتاری یقیناً ہو سکتی ہے“ اس نے کہا۔

”ثبوت میں خود ہوں!“

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ چونک کر بولا۔

”میں کل تارائن سنج گئی تھی۔“ میں نے گویا انکشاف کیا۔ ”گزشتہ رات میں نے ضیا الاسلام ہی کی

حوالی میں گزاری ہے۔“

”کیا واقعی؟“ عبید الرحمن چودھری حیرت زدہ اور ناقابل یقین سے لہجے میں بولا۔

”ہاں ہاں..... کیوں اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے!“

”ابھی تو آپ آئی ہیں اور اتنی جلدی..... کمال ہے!..... اگر مناسب سمجھیں تو مجھے تفصیلات سے آگاہ

کردیں کہ آپ نے کیا معلومات حاصل کیں۔“

جواباً میں نے مختصراً عبید الرحمن چودھری کو دو باتیں بتادیں جو مجھے معلوم ہوئی تھیں۔ عبید الرحمن چودھری

کے چہرے سے فکر مندی کا اظہار ہونے لگا۔

”ان حالات میں ضیا الاسلام پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس سے بہت سی کام کی

باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ کم از کم وہ ان لوگوں کی نشاندہی تو کر ہی سکتا ہے جو سازش کے اس منصوبے میں اس کا

ساتھ دے رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟“ یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”میں آپ سے متفق ہوں۔“ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ آپ نے جو کچھ بتایا ہے وہ ایک بڑے

خطرے کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے۔ میں آج ہی ضیا الاسلام کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیتا ہوں۔ میرا خیال

ہے کہ آپ خود اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہیں گی۔“

”بالکل“ میں نے اقرار میں سر ہلایا پھر مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ ”اس کار کے بارے میں کیا

معلوم جس کا نمبر میں نے آپ کو دیا تھا؟“

”وہ کار چوری کی ثابت ہوئی۔ تھانہ پرانا پلٹن میں اس کی رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔“ عبید الرحمن

چودھری نے میرے سوال کا جواب دیا۔

”اچھا اب میں چلوں گی۔ یہ بتائیں کہ ضیا الاسلام کو حراست میں لینے کے بعد کہاں رکھا جائے گا؟ مجھے کہاں اس سے ملنا ہوگا۔“

”ابھی تو آپ نے چائے بھی نہیں پی، پیئیں نا! میں آپ کیلئے چائے منگواتا ہوں۔“

”نہیں چائے رہنے دیں میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دے دیں۔“ میں جلدی سے بولی۔

”آپ ایسا کریں کہ چاہیں تو کل صبح یہیں آ جائیں میں خود آپ کو ساتھ لے کر صدر گھاٹ چلوں گا۔

سی آئی ڈی آفس دیں ہے میرا خیال ہے کہ ضیا الاسلام سے وہیں پوچھ گچھ کی جائے کسی تھانے میں اسے نہ رکھا جائے۔“

”آپ کا خیال درست ہے لیکن میں اگر یہاں آنے کے بجائے سیدی سی آئی ڈی آفس پہنچ جاؤں

تو کیا حرج ہے! آپ فون پر میرے بارے میں سی آئی ڈی آفس والوں کو بتا دیں۔“

”جیسا آپ چاہیں آپ کہتی ہیں تو میں انہیں فون کر دوں گا مگر شناخت کیلئے.....“

”صرف میرا نام کافی ہے۔“ میں نے اس کی بات پوری کر دی۔ ”میں انہیں اپنا نام بتا دوں گی۔“

”دراصل مجھے بھی مجس رہے گا کہ آپ کو ضیا الاسلام نے کیا بتایا! میں بھی اسی لئے آپ کے ساتھ

چلنا چاہتا تھا۔“

”تو آپ بھی آجائیں وہاں!“ میں بولی۔ ”کل صبح ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان میں وہاں پہنچ

جاؤں گی۔ آپ خود وہاں ہوں تو شناخت کا مسئلہ بھی نہیں رہے گا۔“

”ٹھیک ہے میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں ساڑھے نو اور دس کے درمیان۔“ عبید الرحمن چودھری نے کہا۔

پھر میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور وہاں سے اپنے ہوٹل کیلئے روانہ ہو گئی۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے دوپہر کے

بارہ بج گئے تھے۔ گزشتہ رات کا بڑا احصہ جاگتے گزرا تھا۔ اس لئے میں تھکن سی محسوس کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بستر

پر دراز ہوتے ہی میری آنکھوں میں نیند نے جال بنا شروع کر دیے اور کچھ ہی دیر بعد میں سو گئی۔

اس وقت شام کے چار بج رہے تھے جب میری آنکھ کھلی دوپہر کا کھانا بھی سونے کی وجہ سے گول

ہو گیا تھا بستر سے اٹھ کر میں ہاتھ روم میں گھس گئی باہر سے میں نے آج شام ہی سامان لے کر اس کے پاس پہنچنے

کا وعدہ کیا تھا اس لئے غسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ناشتہ کیا اور پھر ہوٹل کے واجبات ادا کر دیئے۔ سوا

پانچ بجے کے قریب میں ایک ٹیکسی کے ذریعے بادام تلے گھاٹ روانہ ہو گئی۔

باہر مجھے اپنا منظر ملا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی۔ اس نے کمرے میں میرا

سامان وغیرہ سیٹ کر لیا اور پھر میرے لئے چائے بنانے لگا۔ ملازم لڑکے کو وہ چھٹی دے چکا تھا۔ وہ لڑکا صبح آٹھ

بجے آتا تھا اور شام پانچ بجے چلا جاتا تھا۔ اس کا دوست فرید احمد بھی اس وقت گھر پر نہیں تھا۔

جب وہ میرے لئے چائے بنا کر لایا تو میں نے اس سے کہا۔ ”باہر! تم اس ملازم لڑکے کو مستقل طور پر

چھٹی دے سکتے ہو؟“

”اگر آپ کہیں گئی تو یقیناً چھٹی دے دوں گا۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ ”بس تھوڑی بہت پریشانی

ہوگی کام وغیرہ کے سلسلے میں!“

”میں دراصل یہ چاہتی ہوں کہ آزادی کے ساتھ یہاں رہ سکوں۔ مثلاً اس وقت میرے چہرے پر جو

”سیودکرجی کے بارے میں ایک تازہ ترین اطلاع یہ ملی ہے کہ آج رات وہ ڈھاکہ کلب میں ایک غیر ملکی عورت سے ملنے والا ہے۔ یہ عورت فرانس کی رہنے والی ہے اور یہاں ٹورسٹ کی حیثیت سے آئی ہے اس کا نام مادام ڈینا ہے۔ اس کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ کسی بین الاقوامی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور یہاں کسی خاص مقصد سے آئی ہے۔ ہمارے آدمی اس عورت کے توسط سے سیودکرجی کو پہچان لیں گے۔ اس کا بندوبست بھی کر لیا گیا ہے کہ سیودکرجی کی تصاویر لے لی جائیں۔“

”لیکن باہر یہ ضروری تو نہیں کہ سیودکرجی اپنی اصل شکل میں ہو ایسی صورت میں تصاویر لینا بے سود ہی ہوگا۔ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم لوگ سیودکرجی پر ہاتھ ڈال دو! میں نے تجویز پیش کی۔“ میرے خیال سے تم لوگوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔“

”دراصل ہم اسے رکنے ہاتھوں پکڑنا چاہتے تھے اور یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ مادام ڈینا سے اس کی ملاقات کا مقصد کیا ہے! بہر حال جو آپ کی تجویز ہے اس پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے مگر اس کیلئے مجھے ازسرنو پلاننگ کرنا پڑے گی اور اس کیلئے فوری طور پر سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔“ باہر نے ہنسی کی۔

”اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں۔“ میک اپ ختم کرتے ہوئے میں نے آئینے پر آخری نگاہ ڈالی۔

”اسے ہم لوگ اپنی خوش قسمتی تصور کریں گے۔“ باہر پر جوش لہجے میں بولا۔ ”نئی حکمت عملی پر عملدرآمد کی خاطر مجھے فوری طور پر اپنے ساتھیوں سے ملنا پڑے گا اس لئے میں اب چلوں گا! وہی پر مجھے تقریباً اڑھائی تین گھنٹے لگ جائیں گے آپ تیار رہیے گا! ہمیں رات دس بجے تک ڈھاکہ کلب پہنچنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر باہر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اس وقت چھ بج رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک لوٹ آؤ گے!..... میں بہر حال تمہیں تیار ہی ملوں گی؟“ میں نے کہا۔

”ممکن ہے ساڑھے چھ بجے تک فریڈ احمد آجائے۔ آپ اس سے کہہ دیں کہ وہ فوری طور پر لال باغ پہنچ جائے وہاں میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔“ باہر نے چلتے چلتے مجھ سے کہا۔

”میں تمہارے دوست تک تمہارا پیغام پہنچا دوں گی تم اطمینان سے جاؤ۔“

پھر باہر چلا گیا۔ میں نے مکان کا صدر دروازہ اندر سے بند کر دیا اور پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ اس مکان میں اب میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ ہوٹل سے یہاں منتقل ہونا میرے لئے سودمند ہی ثابت ہوا تھا۔ ہوٹل کی نسبت میں خود کو یہاں زیادہ محفوظ تصور کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ باہر کی اور میری راہیں ایک ہی تھیں۔ سیودکرجی میرے حریفوں میں سے بھی ایک تھا اور باہر بھی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا پھر یہ کہ میں تنہا نہیں رہی تھی باہر اور اس کے ساتھی میرے لئے مددگار و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ ان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ باہر سے یہ جان کر سیودکرجی آج رات ڈھاکہ کلب میں کسی غیر ملکی عورت ڈینا سے ملنے والا تھا، میرے دل میں بھی تجسس پیدا ہو گیا تھا ڈینا پر باہر کے آدمیوں کی نظر تھی اور وہ اسے پہچانتے تھے۔ اس کے توسط سے سیودکرجی کو پہچان لیا جاتا۔

بستر پر نیم دراز ہو کر میں اس وقت تک حالات و واقعات پر غور کرتی رہی جب تک دروازے پر دستک نہ سنائی دی۔ اس وقت ساڑھے چھ بجنے والے تھے۔ باہر نے اپنے دوست فریڈ احمد کے بارے میں یہی بتایا تھا کہ

میک اپ ہے اسے ختم کر کے میں نیا میک اپ کرنا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے کہ آئندہ بھی اس کی ضرورت پیش آئے۔ وہ لڑکا لھینا اس سے کلنک جائے گا جو میں نہیں چاہتی۔“

”ٹھیک ہے، کل منج وہ آئے گا تو میں اس کا حساب کر دوں گا۔“ باہر نے کہا۔

”میں کیونکہ اس وقت نیا میک اپ کرنا چاہتی ہوں اس لئے کوشش کرنا کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہ رکے اور اس کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکے۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے انچھی کیس سے میک اپ کا سامان نکال لیا اور پھر میک اپ کرنے لگی۔ یہ میک اپ میں اس لئے ختم کرنا چاہتی تھی کہ اس میں مجھے نیا الاسلام اور اس کے آدمی دیکھ چکے تھے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری کو بھی میں نے اب تک اپنی سکونت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ آج ملاقات کے دوران میں اس نے مجھ لے یہ سوال بھی نہیں کیا تھا۔ غالباً وہ سمجھ چکا تھا کہ میں اس سلسلے میں رازداری سے کام لینا چاہتی ہوں۔

باہر میرے نزدیک قابل اعتبار تھا اسی لئے اس کے کچھ پوچھے بغیر میں نے اسے مختصر طور پر تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔

”مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ نے مجھے اعتماد کے قابل سمجھا۔“ باہر کہنے لگا۔ ”میں بھی اپنے بارے میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں یہاں نو جوانوں کی ایک تنظیم قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو اپنے طور پر جرائم کی تقویت کرتی ہے اور جرائم پیشہ افراد کو سزائیں دیتی ہے۔ میرا دوست فریڈ احمد بھی اسی تنظیم کا ایک رکن ہے۔ ان دنوں ہم یہاں کے سب سے بڑے جرائم پیشہ سیودکرجی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہم نے عہد کیا ہے کہ اسے اس کے انجام تک پہنچا کر دم لیں گے۔ دراصل حزب اختلاف کے کچھ سرکردہ افراد اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں اس پر ہاتھ ڈالنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہم اپنے مقصد میں کامیاب ضرور ہوں گے۔“

”حزب اختلاف کے ان لیڈروں میں کیا کوئی ایس رٹن بھی شامل ہے؟“ میں نے باہر سے سوال کیا۔

”جی ہاں۔“ باہر نے جواب دیا۔ ”ہمیں خاصے دن بعد اس کا علم ہوا کیونکہ ایس رٹن خود ان دنوں مغربی پاکستان کے شہر راولپنڈی میں ہے۔ یہاں دھان منڈی میں اس کی کوفی سیودکرجی کے مصرف میں تھی۔ جب ہمارے آدمیوں نے وہاں ریڈ کیا تو سیودکرجی وہاں سے فرار ہو گیا۔“

”اور فرار ہوتے ہوئے اس نے کوفی میں آگ بھی لگا دی تاکہ تمہارے آدمیوں کو وہاں اس کیخلاف کوئی ثبوت نہ مل سکے۔“ میں نے اس کی بات پوری کر دی۔

باہر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا تو میں نے اسے اپنی قید اور پھر قید سے فرار کے متعلق بھی بتا دیا جو پہلے نہیں بتایا تھا۔

”آپ نے اس لئے شکنتلا کا حلیہ بتا دیا تھا۔“ باہر یہ کہہ کر مسکرایا پھر کہنے لگا۔ ”آپ نے جو حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی ایجنٹوں نے ہی سیودکرجی کی خدمات حاصل کی ہوں گی تاکہ آپ ان سے دور ہی دور رہیں۔“

”ہاں حالات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے باہر کی بات سے اتفاق کیا۔

پیچھے ہٹا اور اسی وقت میں نے داڑھی والے کے ہاتھ پر جھپٹا مارا جو قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تو نہیں آسکا مگر اس کے ہاتھ میں بھی نہ رہا اور دور جاگرا۔ میں اسی موقع کی منتظر تھی، بجلی کی طرح کوند کر میں نے ان میں سے ایک کی پنڈلی پر اپنے سیدھے پیر سے بھرپور ضرب لگائی اور دوسرے کے پیٹ پر ناف کے قریب گھونسا مارا۔ وہ دونوں ہی چیخ اٹھے۔ ایک اپنا پیٹ تھامے زمین پر بیٹھے لگا اور دوسرا جھک کر پنڈلی تھامنے لگا۔ اسی لمحے میں نے باری باری ان کے ہاتھوں کو نشانہ بنایا اور وہ چیختے ہوئے زمین پر چت گر پڑے۔ میرے پیر کی بھرپور ٹھوکریں ان کے ہاتھوں پر پڑی تھیں، ضرر نہیں شدید تھیں جس کی وجہ سے ان کے ماتھے کی کھال پھٹ گئی تھی اور خون بہنے لگا تھا۔ شدید تکلیف کے آثار ان کے چہروں پر تھے اور اس کے ساتھ ساتھ حیرت بھی نظر آ رہی تھی۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ کسی عورت کے ہاتھوں پڑے تھے۔

”اب اٹھو نہ میرے شیر دا!“ میں ان کے قریب پہنچ کر تیز لہجے میں بولی۔ ”کوشش کرو مجھے پکڑنے کی۔“

”ہمیں..... معاف..... معاف کر دیں!“ داڑھی والا اپنے ماتھے سے خون پونچھتے ہوئے گلہ لگانے لگا۔ ”ہمیں معلوم نہیں تھا کہ..... کہ بابر اور فرید احمد کے بجائے یہاں آپ ہوں گی۔“

داڑھی والے کے ساتھی نے بھی عاجزانہ لہجے میں اسی طرح کے الفاظ کہے۔

”معافی کی صرف ایک صورت ہے کہ تم لوگ یہ بتا دو کہ یہاں تمہیں کس نے اور کیوں بھیجا تھا؟“ میں سخت لہجے میں بولی۔

”ہمیں یہاں اکبر نے بھیجا تھا کہ..... کہ..... داڑھی والا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔“

”ہاں ہاں بولو نا! چپ کیوں ہو گئے!“ میں نے اسے ٹوکا۔

”اکبر نے کہا تھا کہ ہم بابر اور فرید احمد کو اس قابل نہ چھوڑیں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔“

داڑھی والے نے بتایا۔

”ظاہر ہے اس کیلئے اکبر نے تمہیں معاوضہ بھی دیا ہوگا۔“ میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔

”جی..... جی ہاں..... دس ہزار ملے ہوئے تھے اور..... پانچ ہزار پیشگی مل گئے تھے بقیہ رقم کام ہونے کے بعد آج ملنا تھی۔“

”کیا تم لوگ جانتے ہو کہ اکبر سیوڈ کرجی کیلئے کام کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں معلوم ہے ہمیں! مگر اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔“

”کیا تم دونوں میں سے کسی نے سیوڈ کرجی کو دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ دونوں باری باری بولے۔ ”اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ بہت پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ کہتے ہیں کہ جو اسے دیکھ لے وہ پھر زندہ نہیں بچتا۔“

اسی وقت اچانک گھر کے دروازے پر ہدیتک سنائی دینے لگی۔

”تم دونوں اسی طرح زمین پر پڑے ہو گے اور اٹھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“ میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے بلند آواز میں دستک دینے والے کا نام دریافت کیا۔

”فرید احمد“ دروازے کی دوسری جانب سے آواز آئی۔ ”دروازہ کھولے!“

وہ اس وقت آئے گا۔ مجھے اسی لئے یہ توقع تھی کہ دروازے پر دستک دینے والا وہی ہوگا۔ میں نے اسی سبب دروازہ کھول دیا اور پھر دروازہ کھلتے ہی مجھے ایک دم پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ میری طرف ایک ریوالور کی نال آگھی ہوئی تھی! آنے والے دو قومی ٹیکل مقامی افراد تھے جن میں سے ایک کے چہرے پر داڑھی تھی دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر گھس آئے تھے۔

”کیا تم ہو تم؟“ ان میں سے داڑھی والے نے سخت لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ دروازہ کھلتے پر مجھ سے ملاقات ہوگی۔

”میں..... میں..... دروازہ ہوں..... نف..... فرید احمد کی چچا زاد۔“ میں نے گھبرانے اور خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے رک رک کر کہا۔

”دروازہ بند کر دو اندر سے!“ داڑھی والے نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ ریوالور اس کے ساتھی کے ہاتھ میں تھا۔

”تم..... تم لوگ کیا..... کیا چاہتے ہو؟“ میں نے خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

”لڑکی یہ بتاؤ کہ بابر اور فرید احمد کہاں ہیں؟ داڑھی والے نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔“ اور تم یہاں کیسے نظر آ رہی ہو۔“

”میں..... میں فرید احمد سے ملنے آئی تھی وہ..... وہ کسی ضروری کام سے اپنے دوست بابر کے ساتھ گیا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ گیا تھا کہ میں اس کا انتظار کروں۔ اس نے جلد ہی لوٹ آنے کیلئے کہا تھا۔“ میں بدستور جھوٹ بولتی رہی۔

”انہیں گئے ہوئے کتنی دیر ہو گئی؟“ داڑھی والے نے سوال کیا۔

”ابھی چند منٹ پہلے وہ گئے ہیں۔“ جواب میں بولی۔

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جلد واپس نہیں آئیں گے۔“ اس بار ریوالور والا بولا پھر وہ عجیب سے انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا ”ہمیں بہر حال ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرتا ہے اور یہ بہت اچھا ہے کہ تم یہاں موجود ہو انتظار کے یہ لمحات ہمیں گراں نہیں گزریں گے۔“

”تم..... تم کیا..... کیا کرنا چاہتے ہو؟“ میں..... میں سمجھی نہیں۔“ اس کے لہجے سے سب کچھ سمجھ جانے اور آنکھوں میں شیطانی چمک دیکھنے کے باوجود میں انجان بن کر بولی۔

”جلد ہی سمجھ جاؤ گی۔“ ریوالور والا ہنسا پھر داڑھی والے سے بولا ”کیوں استاد پہلے تم سمجھاؤ گے یا میں اسے سمجھاؤں۔“

”جیسے تمہاری مرضی!..... چلو پہلے تم ہی سہی!..... ریوالور مجھے دے دو!..... اور کہو تو میں کچھ دیر کو ہرے کمرے میں چلا جاؤں۔“ داڑھی والے نے کہا۔

”دوسرے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں۔“ ریوالور والے نے اپنا ریوالور اسے تھما دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو چندا“ چیختے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر تم نے یہ کوشش کی تو ہم تمہارے منہ میں کپڑا اٹھوئیں دیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے۔

میں نے اسے قریب آنے دیا اور پھر اچانک اچھل کر اس کے سینے پر اپنے سر کی ٹکڑی مار دی وہ لڑکھڑا کر

میں نے فرید احمد کی آواز پہچان کر دروازہ کھول دیا۔
 اندر آتے ہی فرید احمد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے میرے چہرے کو بھی حیران حیران سی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کا سب میرے چہرے پر کیا جانے والا نیا میک اپ ہی ہو سکتا تھا۔
 ”یہ..... یہ سب کیا ہے؟..... کون..... کون لوگ ہیں یہ؟“ فرید احمد میری طرف دیکھتے ہوئے رک کر بولا۔

”یہ دونوں تمہیں اور باہر کو معذور بنانے آئے تھے اور اب خود قابلِ رحم نظر آ رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے فرید احمد کو پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دیا۔ پھر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ ان کیلئے اتنی سزا کافی ہے۔ انہیں اب جانے دیا جائے۔ غالباً اب یہ آئندہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔“ پھر میں ان دونوں سے مخاطب ہوئی۔
 ”ہاں بولو تم لوگ! اب تو ادھر نہیں آؤ گے؟“

”ہرگز نہیں“ دونوں بہ یک زبان بولے۔
 ”تو پھر اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ!“ میں نے انہیں حکم دیا۔ پھر آگے بڑھ کر فرش پر پڑا ہوا ریو اور اٹھا لیا۔ ریو اور کھول کر میں نے اس کے اندر سے گولیاں نکال لیں اور خالی ریو اور داڑھی والے کو تھما دیا۔ اسے بھی لے جاؤ۔ ہاں یہ یاد رکھنا کہ تمہیں میرے بارے میں اکبر کو کچھ نہیں بتانا! ویسے بھی تم لوگوں کیلئے یہ ذلت ہی کی بات ہے کہ تم ایک عورت سے بچے ہو۔“

داڑھی والے نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور ریو اور میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ”ایسا ہی ہوگا جو آپ نے حکم دیا ہے ہم اکبر کو کچھ نہیں بتائیں گے آپ کے بارے میں!“
 ذرا ہی دیر بعد جب وہ دونوں چلے گئے تو فرید احمد نے مجھ سے باہر کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟

”اس وقت وہ تمہیں لال باغ میں ملے گا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تمہارے لئے پیغام چھوڑ گیا تھا کہ تمہیں بھی وہیں بھیج دیا جائے۔“

وہ میری بات سن کر چونکا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں“ شاید کوئی خاص بات معلوم ہوتی ہے۔

”ہاں“ میں بول اٹھی۔ ”آج رات کے پروگرام میں تمہوڑی سی تبدیلی ہو گئی ہے۔“

وہ پھر چونکا۔ ”کیا باہر نے آپ کو اس سلسلے میں کچھ بتایا تھا؟“

”ظاہر ہے مجھے اس سے آج رات کے پروگرام کا علم ہو سکتا تھا۔“ میں بولی۔

کچھ نہ سمجھنے والے سے انداز میں فرید احمد نے سر ہلایا اور پھر دروازے کی طرف مڑ گیا۔ بڑھتے بڑھتے

دروازے کے قریب رک کر اس نے کہا۔ ”کل آپ کے چہرے پر یہ میک اپ نہیں تھا غالباً ضرورتاً آپ نے نیا

میک اپ کیا ہے۔“

”کچھ باتیں صرف سمجھنے کیلئے ہوتی ہیں پوچھنے کیلئے نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ظاہر ہے کہ ضرورتاً ہی میں

نے ایسا کیا ہے اور اب پھر مجھے نیا میک اپ کرنا پڑے گا کیونکہ وہ دونوں مجھے دیکھ چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی

کو میرا چہرہ یاد رہے۔ غالباً اب تمہاری نفسی ہو گئی ہوگی۔“

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے کہا اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔
 فرید احمد کے دروازے سے نکلنے ہی میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا اور اپنے کمرے میں آ کر نیا میک اپ کرنے کیلئے سامان نکالنے لگی۔ میں نے فرید احمد سے غلط نہیں کہا تھا۔ واقعی میں اپنے چہرے پر اب نیا میک اپ کرنا چاہتی تھی۔

چہرے پر نیا میک اپ کرنے میں مجھے تقریباً گھنٹہ بھر لگا۔ میں جان بوجھ کر وقت گزاری کی خاطر آہستہ آہستہ میک اپ کر رہی تھی کیونکہ ابھی ساڑھے نو بجتے میں خاصی دیر تھی۔ باہر نے ساڑھے نو بجے تک لوٹ کر آنے کو کہا تھا کیونکہ دس بجے ڈھاکہ کلب پہنچنا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ کرائے کے ان غنڈوں سے باہر اور فرید احمد پر حملہ کرانے والا حقیقتاً سیود مکر جی ہی تھا۔ اکبر محض درمیانی کڑی تھا۔ شکستہ نے سیود مکر جی سے میرے ہی سامنے باہر کا کوئی بندوبست کرنے کیلئے کہا تھا۔ ان غنڈوں کا یہاں تک پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ سیود مکر جی کو باہر کے ٹھکانے کا علم تھا۔ یہ بات میرے نزدیک خطرناک تھی لیکن اس سلسلے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ باہر کی واپسی تک میں انہی تمام باتوں پر غور و خوض کرتی رہی۔ وہ ساڑھے نو بجے سے کچھ پہلے ہی لوٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھ فرید احمد نہیں تھا وہ اکیلا ہی تھا۔

”باہر! اگر وقت ہوتا تو میں تمہارے چہرے پر بھی میک اپ کر دیتی تاکہ سیود مکر جی یا اس کے آدمی تمہیں نہ پہچان سکتے۔“ میں نے باہر کے ساتھ گھر سے نکلے ہوئے کہا۔

”جی ہاں یہ یقیناً بہتر ہوتا۔“ باہر نے میری بات کی تائید نہیں کی۔ ”لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”فرق تو پڑے گا۔“ میں بولی۔ ”سیود مکر جی تمہیں دیکھ کر چو کنا ہو جائے گا۔“

”پھر آپ ہی بتائیں کہ کیا کیا جائے؟“ اس نے کہا۔

”میرا مشورہ ہے کہ تم کلب کے اندر نہ جاؤ اور باہر ہی رہو۔“

”مگر ایسی صورت میں میرے آدمیوں کی رہنمائی کون کرے گا؟“ باہر اس کار کی طرف بڑھتے ہوئے

بولا جو دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔

”بہر حال یہ باتیں پہلے سے سوچنے کی ہوتی ہیں فوری طور پر پروگرام میں کوئی تبدیلی تمہارے

آدمیوں کو شک و شبہ میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔ اب جو ہو گیا سو ہو گیا دیکھا جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں باہر کے قریب

والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ باہر پہلے ہی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

میرے کار میں بیٹھے ہی اس نے کار اشارت کر دی۔ ابھی تک میں نے باہر سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ

سیود مکر جی پر ہاتھ ڈالنے کیلئے اس نے کیا بندوبست کیا ہے؟ میں چاہتی تھی کہ اس سلسلے میں خود ہی کچھ بتائے تو بہتر

ہے مگر اب تک اس کی طرف سے خاموشی ہی رہی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں نا تجربہ کاری کی وجہ سے اسے یا

اس کے دوستوں کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے اس بارے میں پوچھ ہی لیا۔

”ٹھیک ہے میں سمجھ گئی“ کچھ اور بتانے کی ضرورت

وہ مزید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ میں بول اٹھی۔ ”ٹھیک ہے میں سمجھ گئی“ کچھ اور بتانے کی ضرورت

نہیں۔“

یہ سانسے کی بات تھی کہ کھانے پینے کی اشیا میں کوئی ایسی چیز ملا دی جاتی کہ سیودکرجی بے ہوش ہو جاتا۔ میں نے اسی لے مزید وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔
دس بجے سے کچھ پہلے ہی ہم ڈھاکہ کلب پہنچ گئے۔ ہماری کاررکتے ہی ایک نوجوان تیزی سے قریب آ گیا۔

”ڈینا آچکی ہے مگر سیودکرجی شاید ابھی نہیں آیا۔“ اس نوجوان نے قریب آ کر باہر سے سرگوشی کی۔
”وہ کلب کے بار روم میں اکیلی ہی بیٹھی ہوئی ہے۔“
”باقی تمام تیاریاں تو مکمل ہیں نا؟“ باہر نے بھی دھیمی آواز میں نوجوان کو مخاطب کیا۔
”جی ہاں۔“ نوجوان نے جواب دیا۔ ”ہوٹل کے مین سوئچ بورڈ کے قریب بھی ہمارا ایک آدمی موجود ہے جو اشارہ پاتے ہی سوئچ آف کر دے گا۔“

”ویری گڈ!“ باہر بولا اور پھر کار سے اترتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جاؤ۔“
وہ نوجوان جس تیزی سے قریب آیا تھا اسی تیزی سے واپس چلا گیا۔
”باہر! میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ مین سوئچ آف کرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور تم ایسا کس مرحلے پر کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سیودکرجی کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے نکال لے جانے کیلئے ہمارے خیال میں یہی تدبیر تھی۔“ اس نے جواب دیا۔
”بہر حال اب تو تم سب کچھ طے کر چکے ہو مین میرے نزدیک یہ ضروری نہیں تھا۔“ میں اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

”اس کے سوا اسے یہاں سے نکال کر لے جانے کی اور کیا صورت ممکن تھی؟“ باہر نے کہا۔
”جب اس پر بے ہوشی کی دوا اثر کرنے لگتی تو تمہارا کوئی آدمی اسے سہارا دے کر یہاں سے اٹھا سکتا تھا، لوگ یہی سمجھتے کہ وہ زیادہ پی گیا ہے۔“

”اور ڈینا؟“ اس نے سوال کیا۔ ”کیا وہ اس پر کوئی اعتراض نہ کرتی؟“
”ڈینا پر بھی تو بیہوشی کی دوا اثر کرتی نا!..... وہ آخر کیسے بچ جاتی!“
”دراصل ہم نے صرف سیودکرجی کو بے ہوش کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔“ باہر کہنے لگا۔
”بے ہوشی کی دوا شراب کی بوتل میں بھی تو ملائی جاسکتی تھی!..... بار میں ظاہر ہے کہ وہ دونوں شراب تو پیتے ہی نا!“

”سیودکرجی شراب نہیں پیتا، ہماری اطلاعات یہی ہیں۔ ایسی صورت میں اس کے کھانے ہی میں بے ہوشی کی دوا ملائی جاسکتی تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ ڈینا بھی کھانا کھاتی۔“
”بہر حال تم جاؤ!..... ویسے یہ بڑی عجیب بات ہے کہ سیودکرجی شراب نہیں پیتا۔“
ہم دونوں اسی طرح باتیں کرتے ہوئے کلب کی عمارت میں داخل ہو گئے جہاں دن کا سا سماں تھا۔
باہر اور میں کچھ ہی دیر بعد کلب کے بار میں داخل ہو گئے۔

”باہر! کیا تم شراب پیتے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”پھر ہم دونوں یہاں کس طرح بیٹھیں گے؟“ میں نے سوال کیا۔

”میں اس کا بندوبست بھی کر چکا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”ہم دونوں کو شراب کے بجائے سادہ مشروب سرو کیا جائے گا۔“

پہلی بار مجھے باہر کی ذہانت پر خوشی ہوئی، اپنی عمر اور تجربے کے مطابق اس نے اپنی دانست میں کوئی بات نظر انداز نہیں کی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لئے ایک میز پر بیٹھ گیا۔

”یہاں سے دائیں جانب جو تیسری میز ہے اسی پر وہ فرانسیسی عورت ڈینا بیٹھی ہے۔“ باہر نے مجھے آہستہ سے بتایا۔

میں نے کن آنکھوں سے ڈینا کی طرف دیکھا، بلاشبہ وہ مغربی حسن کا شاہکار تھی۔ اس کی عمر تیس اور بیس کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ سرخ سرٹ میں اس کا گورا جسم کسی گلاب کے مانند معلوم ہو رہا تھا۔ نقوش پرکشش اور جاذب نظر تھے۔ اس کے سامنے شراب کی بوتل اور پیگ رکھا تھا، پیگ سے ابھی چند گھونٹ پیے گئے تھے۔

”میں وہاں بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک ویٹر ہماری میز پر آ گیا۔
”ہمارے یہاں آنے سے پہلے کوئی خاص بات تو تم نے نوٹ نہیں کی؟“ باہر نے ویٹر کو آرڈر دینے کے بجائے آہستہ سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ ویٹر نے جواب دیا اور بظاہر اس طرح سر ہلانے لگا جیسے آرڈر سن کر اثبات میں سر ہل رہا ہو۔

پھر وہ مزید کچھ کہے سے بغیر چلا گیا۔ اسے غالباً پہلے ہی سے معلوم تھا کہ کیا کرتا ہے!
بار میں ہلکی ہلکی مغربی موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ زیادہ تر میزیں بھری ہوئی تھیں اور لائٹ ڈم تھی۔
دراذیر بعد ویٹر ہماری میز پر دو پیگ رکھ کر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سوڈے کی بوتلیں اور شامی کباب بھی تھے۔
باہر نے دونوں پیگ اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لئے اور ان میں سوڈا ملانے لگا۔

اسی وقت میں نے ایک دراز قد شخص کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ڈینا کی میز کی جانب بڑھتے دیکھا۔
”وہ دیکھو باہر!“ میں نے باہر کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ ”شاید تمہارا شکار آ گیا ہے۔“

”یہ سیودکرجی نہیں ہو سکتا!“ باہر کا لہجہ یقینی تھا۔
”تم یہ بات یقینی طور پر کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”سیودکرجی پہلے قد شخص ہے اور یہ شخص.....“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔
وہ دراز قد شخص اب ڈینا سے کچھ کہہ رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ڈینا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر وہ شخص سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟“ میں خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ ”ڈینا کے چہرے سے تو یہی اظہار اور ہا ہے کہ وہ شخص اس کیلئے اجنبی ہے۔“

جلدی بابر لوٹ آیا۔ میں نے اس دوران میں بل ادا کر دیا تھا۔ اس وقت ویٹر ٹینا کی میز پر بل دے رہا تھا۔

”میرا خیال ہے بابر کہ ہمیں پہلے ہی یہاں سے اٹھ جانا چاہئے۔ بابر اپنی کار میں بیٹھ کر ہم ان دونوں کا انتظار کر سکتے ہیں۔ اس طرح انہیں تعاقب کا شک نہیں ہوگا۔“ یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

بابر میرے ساتھ بار سے نکل آیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم دونوں کار میں بیٹھے ہوئے کلب کے دروازے پر نگاہ جمائے ہوئے تھے۔ زیادہ دیر ہمیں ٹینا کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ٹینا اس دروازہ قفس کے ساتھ کلب سے نکلی اور وہ ایک لمبی سیاہ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی دروازہ قفس بیٹھا تھا۔ ٹینا اس کے برابر والی سیٹ پر آگے ہی بیٹھی تھی۔ بابر کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ مصلحتاً اب میں نے سنبال لی تھی۔ اس سیاہ کار کو دیکھ کر بھی میں چونک اٹھی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ وہی کار تھی جس میں اغوا کر کے مجھے لے جایا گیا تھا۔ اس کار کی وجہ سے مجھے مزید یقین ہو گیا تھا کہ ٹینا سیوڈکمرجی ہی سے ملنے جا رہی ہے۔ میں نے اس کار کے نمبر کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا حالانکہ یہ ضروری نہیں تھا کہ کار کی نمبر پلیٹ اصلی ہی ہوگی۔

سیاہ کار کچھ آگے بڑھ گئی تو میں نے بھی اپنی کار شارٹ کی اور پارکنگ لائٹ سے باہر نکل آئی۔ تعاقب کرتے ہوئے میں نے درمیانی فاصلہ کافی رکھا تھا تاکہ دروازہ قفس کو تعاقب کا شک نہ ہو سکے مگر اس کے باوجود نہ معلوم کیسے وہ کھٹک گیا۔ مجھے اس کا اندازہ یوں ہوا کہ میں نے بلا مقصد اسے ادھر سے ادھر مڑتے دیکھا پھر وہ ایک ایسی سڑک پر آ گیا جو ڈھاکہ سے ایک نواحی بستی ڈیرا کی طرف جاتی تھی۔ یہ نواحی بستی ڈھاکہ شہر سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھی۔ یوں بھی اس وقت دن کے گیارہ سے زیادہ بجے رہے تھے۔

”بابر! دروازہ قفس کو شاید تعاقب کا علم ہو گیا ہے۔“ میں نے بابر کو مخاطب کیا۔ اس سے پہلے کہ جواب میں بابر کچھ کہتا آگے جانے والی کار کی کھڑکی سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور سڑک پر کوئی چیز چھینکی گئی۔ میری نگاہ کیونکہ سیاہ کار ہی پر جمی ہوئی تھی اس لئے میں فوراً چونکا ہو گئی۔ میرا حیرت بریک پڑا۔ اسی کے ساتھ ایک زبردست دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔ سیاہ کار سے یقیناً ہینڈ گرینڈ پھینکا گیا تھا جس سے دھواں پھیل گیا تھا اور اس دھوئیں میں سیاہ کار غائب ہو گئی تھی۔

”اب وہ نہیں چاہتا کہ ہم اس کا تعاقب جاری رکھ سکیں۔“ میں طویل سانس لے کر بولی۔ کار میں نے سڑک کے کنارے روک دی تھی۔ اور ایسی صورت میں جبکہ وہ تعاقب سے باخبر ہو چکا ہے میرے خیال میں تعاقب فضول ہی ثابت ہوگا۔ وہ کبھی اور کسی بھی صورت میں ہمیں اپنے پیچھے لگا کر سیوڈکمرجی کے ٹھکانے تک نہیں لے جائے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے کار کو روڑ میں لیا پھر یوٹرن لے کر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

”یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔“ بابر کے لہجے میں گہرا تاسف تھا آج کی ساری بھاگ دوڑ لا حاصل رہی۔“ ”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے“ میں دلاسہ دینے والے لہجے میں بولی۔ ”مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تم نے بہر حال کوشش کی تھی اور ضروری نہیں کہ کوشش کا نتیجہ کامیابی ہی کی صورت میں سامنے آئے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں بابر!“

پھر وہ کچھ نہیں بولا اور بقیہ سفر خاموشی سے طے ہو گیا۔ نصف شب کے قریب ہم بادام تلی گھاٹ پہنچ

میری نگاہیں بدستور انہی دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک میں نے اس دروازہ قفس کو اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالتے دیکھا پھر اس نے کچھ کہتے ہوئے وہ کاغذ ٹینا کی طرف بڑھا دیا۔ ٹینا نے اس سے کاغذ لے کر اسے کھولا اور پھر پڑھنے لگی۔ دروازہ قفس اس دوران میں خاموش ہی رہا۔ کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر ٹینا نے اسے اپنے پرس میں رکھ لیا اور دروازہ قفس سے کچھ کہنے لگی۔ چند ہی لمحے بعد میں نے ٹینا کو ویٹر کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔ یقیناً وہ ویٹر کو بلا رہی تھی۔ ویٹر فوراً ہی اس کی میز کی طرف بڑھ گیا۔ ویٹر کے قریب آنے پر ٹینا نے اس سے کچھ کہا اور ویٹر اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔ یہی ویٹر ہماری میز پر بھی سرور کر رہا تھا۔ بابر نے بھی اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

ویٹر نے قریب آکر کچھ پوچھے بغیر ہی آہستہ سے بتایا۔ ”وہ بل مانگ رہی ہے شاید اب وہ اٹھنا چاہتی ہے۔“ یہ کہتے ہی ویٹر اٹھے قدموں واپس چلا گیا۔

”مجھ میں نہیں آتی یہ بات!“ بابر بڑبڑانے لگا۔ اسے تو یہاں سیوڈکمرجی سے ملنا تھا پھر وہ اس سے ملے بغیر کس طرح.....“

”میرا خیال ہے بابر کہ وہ سیوڈکمرجی ہی سے ملنے جا رہی ہے۔“ میں بول اٹھی۔

”کیا مطلب؟“ بابر چونک کر بولا۔ ”سیوڈکمرجی کو تو یہاں آنا تھا!“

”تم شاید یہ بھول گئے ہو بابر کہ اس کا نام سیوڈکمرجی ہے، یقیناً وہ انتہائی چالاک اور محتاط شخص ہے۔ اس لئے تو اسے آج تک چند افراد کے سوا کوئی اور نہیں دیکھ سکا۔ یہ دروازہ قفس یقیناً سیوڈکمرجی ہی کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ میرے خیال میں وہ پیغام یہ ہو سکتا ہے کہ کسی سبب میں کلب نہیں پہنچ سکتا آپ خود فلاں جگہ اس شخص کے ساتھ آجائیں وغیرہ۔“

اگر..... اگر واقعی یہی بات ہے تو..... تو پھر کیا کیا جائے؟“ بابر کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

”ہم ان دونوں کا تعاقب کریں گے!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ ”اس نے کم از کم سیوڈکمرجی کے ٹھکانے کا تو علم ہو جائے گا، مگر..... میں کچھ سوچ کر خود ہی چپ ہو گئی۔

”مگر کیا؟“ مجھے خاموش دیکھ کر بابر سے صبر نہ ہو سکا اور وہ بول اٹھا۔

”مگر یہ بابر کہ وہ..... وہ سیوڈکمرجی کا عارضی ٹھکانا بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہم..... ہم تعاقب ضرور کریں گے۔ تم اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ ہمارے ساتھ نہ آئیں اور ہمیں سے واپس چلے جائیں۔ چلو اٹھو جلدی کرو! ویٹر اس کا بل لے کر آتا ہی ہوگا۔“

میری بات سن کر بابر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی کے ساتھ میں نے ویٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا جو میرا اشارہ پاتے ہی تیزی سے میری طرف بڑھ آیا۔

”ہمارا بل بھی لے آؤ جلدی!“ ویٹر کے قریب آنے پر میں نے۔ ”ٹینا کو بل دینے سے پہلے ہمارا بل آنا چاہئے، ہم بھی اٹھیں گے۔“

”بہتر ہے۔“ ویٹر نے کہہ کر تیز تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔

سیوڈکمرجی کے نہ آنے سے سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا تھا۔ پھر بھی میں بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کے مصداق کچھ نہ کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

سے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ شخص قطعی بے گناہ ہے۔“
 ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ عبید الرحمن چودھری نے بھی میرے خیال کی تائید میں کہا پھر بولا۔ ”اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”میں آج رات خود پولیس کے ساتھ نارائن گنج جاکر ضیا الاسلام کی حویلی پر ریڈ کرنا چاہتی ہوں۔ خورشید الاسلام کو بہر حال گرفتار ہونا چاہئے کیونکہ اصل مجرم وہی ہے۔“
 ”تو پھر آپ کہیں تو میں اس سلسلے میں احکام دے دوں؟“ عبید الرحمن چودھری بولا۔
 ”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں آج رات گیارہ بجے یہاں آ جاؤں گی۔ مجھے پولیس پارٹی تیار ملنی چاہئے!“

عبید الرحمن چودھری نے اسی وقت ضروری ہدایات دے دیں اور پھر مجھ سے بولا۔ ”آپ کو میں کہاں چھوڑ دوں؟“

”نواب پور روڈ۔“ میں بولی۔
 ”مگر آپ نے تو بتایا تھا کہ موتی جھیل میں اپنی کزن کے گھر آپ کا قیام ہے!“
 ”وہ بھی غلط نہیں بتایا تھا۔ دراصل نواب پور روڈ میں ایک ضروری کام سے جارہی ہوں اس کے بعد ہی گھر جاؤں گی۔“

پھر عبید الرحمن چودھری نے مجھے اپنی کار میں نواب پور روڈ پر امجدیہ ہوٹل کے سامنے اتار دیا اور میں وہاں سے پیدل ہی بادام تلّی گھاٹ کی طرف چل دی جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔
 میں واپس گھر پہنچی تو بار مجھے اپنا منتظر ملا۔ فرید احمد گھر پر نہیں تھا۔ بار کو کہیں جانا تھا اس لئے میرا انتظار کر رہا تھا۔

”کہاں جاتا ہے تمہیں؟“ میں نے اس سے معلوم کیا۔
 جواب میں اس نے ایک فائو سٹار ہوٹل کا نام لیا پھر بولا۔ ”یہ معلوم کرنا بھی تو ضروری ہے کہ اس فرانسیسی عورت ٹرینا اور سیدو کرجی کے درمیان کیا چکر چل رہا ہے! دراصل میں اس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی کام کی چیز ہاتھ لگ جائے۔“
 ”اور اگر وہ ہوٹل میں موجود ہوئی تو؟“ میں نے پوچھا۔

”تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اس نے جوابا کہا۔ ”میں اس سلسلے میں بھی سوچ چکا ہوں میرے آدمی اسے سنبھال لیں گے۔“
 ”میں تمہارے معاملے میں مداخلت کرنا تو نہیں چاہتی لیکن اگر کہو تو تمہارے ساتھ چلوں یوں بھی اب رات تک میں خالی ہی ہوں۔“

”آپ بھی چلیے کوئی حرج نہیں ایک سے دو بھلے!“ وہ مسکرا کر بولا۔
 ”گھر میں تالا ڈال کر جانا پڑے گا۔ اگر اس دوران میں تمہارا دوست فرید.....“
 ”اس کے پاس دوسری چابی ہے۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔
 ”تو پھر ٹھیک ہے چلو۔“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مگر..... مگر وہ..... وہ ٹھیکہ کی زندگی کی ضمانت کون دے گا جو..... جو ان کی قید میں ہے!“ بوڑھے کے چہرے پر گہرے دکھ کے سائے پھیل گئے۔

”ٹھیکہ.....؟ یہ کون ہے؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”میری بیٹی..... وہ..... وہ لوگ یقیناً اسے ہلاک کر دیں گے! اگر میں نے کچھ بتایا۔“
 ”کون لوگ ہیں وہ؟..... تم بتاؤ! یقیناً کروہم تمہاری بیٹی کو ان کی قید سے رہائی دلا دیں گے۔“

پھر ضیا الاسلام بمشکل زبان کھولنے پر آمادہ ہوا۔ اس نے جو داستان سنانی مختصر یہ تھی کہ جو شخص مجھ سے اس کی حویلی میں ملا تھا وہ اس کا سوتیلا بھائی خورشید الاسلام تھا۔ اس کے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ خورشید الاسلام اس کے والد کی دوسری بیوی کے پہلے شوہر سے تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے خورشید الاسلام اس کے ساتھ اس کی حویلی میں رہ رہا تھا۔ اس سے قبل وہ مغربی پاکستان کے ایک شہر لاہور میں تھا۔ سلاخ خورشید الاسلام بھی بنگالی ہی تھی۔ نارائن گنج پہنچ کر خورشید الاسلام ایک روز اپنی سہیلی ٹھیکہ کو اپنے ساتھ ڈھاکہ گھمانے کیلئے لے گیا تھا اور پھر اکیلا ہی نارائن گنج واپس آ گیا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی باز پرس پر اس نے بتایا تھا کہ ٹھیکہ بخیریت سے ہے لیکن اس وقت تک بخیریت رہے گی جب تک ضیا السلام اس کے حکم کی تعمیل کرتا رہے گا پھر رفتہ رفتہ خورشید الاسلام نے پوری حویلی پر قبضہ جمایا تھا۔ ضیا الاسلام کے تمام ملازمین پر بھی اب اسی کا حکم چلتا تھا۔ اس دوران میں فون پر کئی بار ٹھیکہ سے اس نے ضیا الاسلام کی بات کرا دی تھی۔ اس یقین دہانی کیلئے کہ ٹھیکہ ابھی زندہ اور بخیریت ہے۔ ضیا الاسلام نے یہ بھی بتایا کہ اس کا سوتیلا بھائی یقیناً ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ غیر ملکی افراد بھی اسی وقت سے حویلی میں آنے جانے لگے تھے جب سے خورشید الاسلام وہاں آیا تھا۔

”یہ بتاؤ کہ جب گزشتہ رات تمہیں گرفتار کیا گیا تو خورشید الاسلام کہاں تھا؟“ ضیا الاسلام اپنی داستان سنا چکا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ حویلی ہی میں موجود تھا۔“ ضیا الاسلام نے جواب دیا۔
 ”تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ اب بھی وہیں ہوگا؟“ میں نے مزید سوال کیا۔
 ”یقینی طور پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس کی سرگرمیاں بہت پراسرار ہیں۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اب کہاں ہوگا!“ اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

”نی انی حال ہم تمہیں تمہارے ہی تحفظ کی خاطر اس وقت تک یہیں رکھیں گے جب تک خورشید الاسلام پکڑا نہیں جاتا۔ تمہیں اس کے کسی اور ٹھکانے کا علم ہے؟“
 ”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”اکثر وہ کئی کئی دن کیلئے حویلی سے غائب ہو جاتا ہے مگر اس دوران میں وہ کہاں رہتا ہے کچھ معلوم نہیں۔“

پھر میں نے سی آئی ڈی انسپکٹر کو بلوا لیا اور ضیا الاسلام کو دوبارہ لاٹک اپ میں بند کر دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے یہ ہدایت بھی دی تھی کہ اس کی حفاظت کا خاص طور پر خیال رکھا جائے اور کسی بھی شخص کو اس سے نہ ملنے دیا جائے۔
 ”ضیا الاسلام کی آڑ میں درحقیقت اس کا سوتیلا بھائی کھیل کھیل رہا ہے۔“ میں نے عبید الرحمن چودھری

میرے نزدیک ڈینا سے یہ حماقت سرزد ہوئی تھی کیونکہ دوسرے ہی لمحے باہر کے ساتھی نے اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ ڈینا کو شاید باہر کے ساتھی سے اس بے جگری کی توقع نہیں تھی۔ وہ اسی لئے فوری طور پر جوابی کارروائی نہ کر سکی۔ باہر کے ساتھی نے ڈینا کے ریوالور والے ہاتھ کی کلائی پکڑ کر اوپر اٹھا دی تھی جس کے سبب ریوالور کی نال کار رخ چھت کی طرف ہو گیا تھا پھر نہ جانے کس طرح ڈینا کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر ایک طرف جاگرا۔ اس کے ساتھ باہر کے ساتھی کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں صرف یہ دیکھ سکی تھی کہ ڈینا نے گردن کے قریب اس کی کوئی نرس دبا دی تھی۔ باہر کا ساتھی چیخ کر کسی مردہ چھپکلی کی طرح ایک طرف جا پڑا تھا۔

”اب تم لوگ بھی چاہو تو اپنی حسرت نکال لو!“ ڈینا بازو پھیلا کر تیز لہجے میں بولی۔
اس بار باہر نے پہل کی اور اسے بھی منہ کی کھانا پڑی۔ وہ ڈینا کے قریب پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ڈینا نے اچھل کر باہر کے سینے کو اپنے دونوں پیروں سے نشانہ بنایا تھا اور باہر ایک طرف ڈھیر ہو گیا تھا۔ بلاشبہ وہ عورت ایک بہترین لڑاکا تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ باہر کا دوسرا ساتھی آگے بڑھتا میں ڈینا کے مقابل آ گئی۔
”عورتوں پر ہاتھ اٹھانا میں بردی سمجھتی ہوں۔ اس نے بڑی نفرت سے کہا۔“ ابھی تمہارا ایک مرد ساتھی اپنے پیروں پر کھڑا ہے اسے سامنے آنے دو۔“

ڈینا کی بات پوری ہونے سے پہلے میرے پاؤں زمین چھوڑ چکے تھے۔ میری فلامنگ کلک اس کے سینے پر پڑتی مگر وہ حیرت انگیز طور پر اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ میری اچھتی ہوئی کلک اس کے شانے پر پڑی اور پھر میں زمین پر پہلو کے بل گر گئی۔
”تو تمہیں بھی یہ کیل آتا ہے!“ ڈینا کی آواز مجھے سنائی دی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں فرش سے اٹھنے میں کامیاب ہو جاتی، وہ کسی وحشی ذرعے کی طرح زقند بھر کے میرے سر پر پہنچ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا ہاتھ جیسے میں خود اپنے روبرو ہوں۔ آج سے پہلے کسی عورت کو میں نے اپنا ہم پلہ نہیں پایا تھا۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی اس نے مجھے جکڑ لیا۔ معلوم نہیں اس کے جسم میں کیسی شیطانی قوت تھی کہ مجھے اپنے جسم کی ہڈیاں ٹوٹی محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں نیچے گئی اور وہ میرے اوپر اس نے کسی ہشت پا کی طرح میرے جسم کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر کچھ دیر وہ اسی طرح اور دباؤ ڈالے رہی تو شاید میرے حواس قابو میں نہیں رہیں گے۔ چند ہی لمحوں بعد نہ جانے کس طرح اس کے دایں ہاتھ کی کہنی میری گردن پر آ گئی اور کہنی کا دباؤ گردن پر پڑتے ہی میرا سانس رکنے لگا۔ اسی کے ساتھ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کسی کے مقابل خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈینا ہی دیر بعد جو دونوں کار میں بیٹھے ہوئے اس فانیو سٹار ہوٹل کی طرف جا رہے تھے جہاں ڈینا کا قیام تھا۔ راستے میں باہر نے مجھے ایک سیاہ نقاب دیتے ہوئے کہا۔ ”اے اپنے پاس بیکھ لیں! میں ڈینا پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ لٹیرے ہیں اور اسی غرض سے اس کے کمرے میں گھسے ہیں۔ آپ کو بھی چہرے پر نقاب چڑھانا ہوگا اور یہ ریوالور بھی رکھ لیں!“ اس نے ایک ریوالور بھی اپنی کار کے ڈیش بورڈ سے نکال کر مجھے تھا دیا۔

میں نے نقاب اور ریوالور لے کر دونوں چیزیں اپنے پرس میں رکھ لیں۔
مطلوبہ ہوٹل پہنچ کر باہر کے دوسرا ساتھی بھی ہمارے ساتھ ہوئے جنہیں باہر نے اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ وہ دونوں ڈینا کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہی سے یہ معلوم ہوا کہ ڈینا اس وقت اپنے کمرے ہی میں موجود ہے۔ نو منزلہ ہوٹل کی پانچویں منزل کے ایک کمرے میں وہ ٹھہری ہوئی تھی۔ لفٹ کے ذریعے ہم چاروں افراد پانچویں منزل پر پہنچ گئے۔ باہر کے اشارے پر اس کے ایک ساتھی نے دروازے پر دستک دی اور پھر فوراً ہی اپنے چہرے پر نقاب چڑھائی پھر جیسے ہی کمرے کا دروازہ کھولا گیا وہ اپنی جیب سے ریوالور نکال ہوا اندر گھس گیا۔ باہر اس کے ایک ساتھی اور میں نے بھی اپنے چہروں کو نقاب کے پیچھے چھپائے۔ میں دیر نہیں کی اور پھر ہم بھی کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم سبھی کے ہاتھوں میں ریوالور تھے لیکن باہر اپنے کبھی ساتھیوں کو یہ ہدایت دے چکا تھا کہ کوئی نہیں چلا نا۔

کمرے میں پہنچتے ہی میں چوک اٹھی۔ باہر کے اس ساتھی کو ڈینا بے بس کر چکی تھی جو کمرے میں سب سے پہلے داخل ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور پشت سے ریوالور کی نال لگی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ ڈینا کا تقریباً پورا جسم اس کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

”اپنے اپنے ریوالور پھینک دو!“ خلاف توقع ڈینا صاف ستھری اردو میں بولی۔ ”اگر تم لوگوں نے ریوالور نہ پھینکے تو میں تمہارے ساتھی کو کوئی مار دوں گی!“ اس کے لہجے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اگر اس کی بات پر عمل نہیں کیا گیا تو یقیناً وہ گولی چلا دے گی۔

میرے لئے یہ بڑی حیران کن بات تھی کہ اس عورت نے کس طرح باہر کے ساتھی سے ریوالور چھین کر اسے بے بس کر دیا۔

”ریوالور پھینک دو!“ میں نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی ایسا کرنے میں پہل کی۔
باہر اور اس کے ساتھی نے میری تقلید کی۔ اسی وقت ڈینا کی تیز آواز سنائی دی۔ ”کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دو!“

اس کا یہ حکم میرے لئے غیر متوقع اور حیرت انگیز تھا مگر میں نے پلٹ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دوسرا حکم اس نے چہروں سے نقاب اتارنے کا دیا۔ اس پر بھی عمل کیا گیا۔ ابھی تک وہ باہر کے ساتھی کی پشت پر ریوالور رکھے ہوئے تھی اور اسی کے زور پر ہم سے ہر بات منوار رہی تھی مگر یہ صورتحال جلد ہی بدل گئی۔ خود اسی نے باہر کے ساتھی کی پشت پر ایک لات ماری پھر بولی کہ تم بھی اب اپنے ساتھیوں کے قریب جا کر کھڑے ہو جاؤ! اس کے ہاتھ میں اب بھی ریوالور تھا جو ہماری طرف اٹھا ہوا تھا۔ باہر کا ساتھی زمین سے اٹھ کر ہمارے قریب آ کھڑا ہوا۔

ہاتھ نہیں اٹھاتی اور اسے بزدلی سمجھتی ہوں، مگر.....“

میرا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیوں کہ میں نے اسے خود پر جست لگاتے دیکھ لیا تھا۔ ادھر اس نے جست بھری، ادھر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر میں بھی اپنی جگہ سے اچھلی اور پھر ہم دونوں کے جسم فضا میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ میں عموماً اپنے کسی کم زور حریف پر ایسی صورتحال میں وہ داؤ آزمانے سے گریز کرتی تھی جو اس وقت ڈینا پر آزمایا۔ یہ داؤ نہ آزمانے کا سبب یہ تھا کہ اس میں پچاس فیصد سے زیادہ گردن کی بڑی ٹوٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ گردن کی بڑی ٹوٹنے کے بعد شاذ ہی کوئی شخص بچتا ہے، مگر ڈینا کوئی کمزور حریف نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ اس داؤ کا توڑ بھی کر سکتی تھی اور اس نے کسی حد تک ایسا کیا بھی! ورنہ شاید زندہ نہ بچتی۔ میرے ہاتھ کی بھرپور ضرب اس کی گردن کے پچھلے حصے پر نہ پڑ سکی، لیکن بہر حال وہ پورے طور پر داؤ نہ بچا سکی۔ اسی کے نتیجے میں چند لمحوں کے لئے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی۔ میرا اور اس کا جسم فضا میں ٹکرا کر زمین پر آ رہا۔ میں تو فوری طور پر زمین سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی، مگر وہ گردن پر ضرب لگنے کے سبب فوراً نہ اٹھ سکی۔ پھر یہی چند لمحے فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ میں کسی عقاب کی طرح فضا میں جست بھرتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی اور پھر میرے دائیں پیر کی ٹھوک اس کی کپٹی پر پڑی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ یقیناً بے ہوش ہو چکی تھی۔

دانتوں پسینے آنے کا محاذہ شاید ایسے ہی مواقع کے لئے ہے۔ ڈینا کو قابو میں کرنے کے لئے مجھے واقعی دانتوں پسینا آ گیا تھا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑے ہی میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی تھی کہ میں اس کا اصلی چہرہ دیکھ لوں، مگر فوراً ہی مجھے باہر اور اس کے ساتھیوں کا خیال آ گیا تھا۔ ڈینا سے برسر پیکار ہونے کے دوران میں ان کی طرف میری توجہ نہیں گئی تھی۔ میں نے اب کمرے کا جائزہ لیا تو باہر کے ایک ساتھی کو اس کے قریب پایا۔ یہ وہی تھا جو سب سے پہلے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ باہر کو زمین سے اٹھا رہا تھا۔ باہر آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ڈینا کی بھرپور فلتاننگ لگک باہر کے سینے پر پڑی تھی جس کی وجہ سے وقتی طور پر وہ اپنے حواس برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ باہر کا وہ ساتھی جس نے ڈینا پر چھلانگ لگائی تھی، اب تک ایک جانب بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ ڈینا نے اس کی گردن کی کوئی نرس دبا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

میں لپک کر باہر کے قریب پہنچ گئی اور اسے سنبھال لیا، پھر اس کے ساتھی کو مخاطب کیا۔ ”تم اسے..... اپنے ساتھی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو!..... یہاں ہاتھ روم میں پانی ہوگا!“

باہر کا ساتھی میرے کہنے پر اپنے بے ہوش ساتھی کو ہوش میں لانے کے لئے اس کی جانب بڑھ گیا۔

”کیا محسوس کر رہے ہو تم؟“ میں نے باہر کو سیدھا کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں..... پسلیوں میں درد ہے، مگر..... قابل برداشت ہے اب..... میں سہارے کے بغیر کھڑا ہو سکتا ہوں۔“ باہر نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

”تم ادھر صوفے پر جا کر بیٹھ جاؤ!“ میں نے اس سے کہا۔ ”کچھ دیر بعد درد کم ہو جائے گا۔“

”مگر آپ..... آپ نے اسے کس طرح قابو میں کر لیا؟..... میں دیکھ نہیں سکا کہ.....“ وہ

میری گردن پر ڈینا کی کہنی کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، اسی کے ساتھ میرے جسم پر بھی اس کی گرفت مضبوط تھی۔ میرے چہرے سے اس کا چہرہ بھی بہت قریب تھا۔ اتنے نزدیک سے اس کا چہرہ دیکھ کر میں نے وہ خاص بات محسوس کر لی جو دور سے محسوس نہ کر سکتی تھی۔ یقیناً یہ اس کا اصلی چہرہ نہیں تھا۔ جلد میں جو قدرتی گداز اور نرمی ہوتی ہے وہ مفقود تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ میک اپ میں تھی۔ غیر معمولی حالات سے نبرد آزما ہونے کے باوجود میں اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

مجھے جو واقعہ پیش آیا تھا قطعی غیر متوقع اور اچانک تھا اس لئے میں فوری طور پر سنبھال نہیں سکی تھی اور چوٹ کھا گئی تھی۔ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈینا غیر معمولی قوتوں کی مالک ہوگی، لیکن اب مجھے پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ میرے مقابل کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ میں نے اپنے جسم کی تمام قوت صرف کر کے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پیر اٹھانا شروع کر دیئے۔ نتیجتاً اس کے پیروں کی گرفت میرے پیروں پر ڈھیلی پڑنے لگی۔ پھر میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو بھی حرکت دی اور اس کی کہنی کو اپنی گردن سے ہٹانے کی جدوجہد کرنے لگی۔ اسی دوران میں مجھے ایک اور تدبیر سوچ گئی۔ میں نے اچانک پورا زور لگا کا بائیں جانب کروٹ لی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ اس سے فوری طور پر میری گردن سے ڈینا کی کہنی کا دباؤ ختم ہو گیا، مگر اس کے باوجود وہ ابھی تک میرے جسم کو جکڑے ہوئے تھی۔ چند ہی لمحے بعد ایک اور کوشش کے نتیجے میں مجھے مزید کامیابی حاصل ہو گئی۔ اب ڈینا نیچے تھی اور میں اس کے اوپر۔ میں نے اپنی دونوں کہنیاں اس کی پسلیوں میں گاڑ رکھی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ دباؤ بڑھانی جا رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ڈینا کی بجائے کوئی اور عورت ہوتی تو فوراً چیخ اٹھتی، مگر اس نے اف بھی نہ کی ہاں میں نے اتنا ضرور دیکھا کہ ڈینا کے ہونٹ سختی سے بھینچ گئے تھے۔ میرے جسم پر ابھی تک اس کی گرفت برقرار تھی۔

جس طرح میں نے اچانک کروٹ لے کر اس کی برتری ختم کر دی تھی، بالکل اسی طرح اس نے تیزی کے ساتھ حرکت کی۔ اس نے انتہائی سرعت کے ساتھ اپنے دونوں پیر سمیت کر میرے جسم کو فضا میں اچھال دیا تھا اور پھر اسی تیزی کے ساتھ اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی۔ فرش پر گرتے ہی میں نے بھی اٹھنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کی تھی۔ ہم دونوں پھر ایک دوسرے کے مقابل آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔

معا میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”ڈینا!..... یا جو بھی تمہارا اصل نام ہے، میں بھی عورتوں پر کبھی

”معاف کیجئے گا چودھری صاحب! ایک ضروری معاملے میں آپ کو زحمت دے رہی ہوں۔“
میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔
”جی جی فرمائیے!“

جواب میں نے اس فائینا اشار ہوٹل اور پھر سادری کے کمرے کا نمبر بتایا، پھر بولی۔ ”اس کمرے میں اس وقت ایک بھارتی ایجنٹ بے ہوش پڑی ہے۔ اس کے پاس سے فوجی نوعیت کے کچھ نقشے اور کاغذات بھی برآمد ہوئے ہیں جنہیں میں نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک ٹرانسمیٹر بھی اس کے ایچی کیس میں ہے جو میں نے رہنے دیا ہے۔“ پھر میں نے ہوم سیکرٹری کو یہ بھی بتا دیا کہ سادری کس حیثیت سے پاکستان میں داخل ہوئی تھی اس کے بعد میں بولی۔ ”وہ نقشے اور کاغذات لے کر میں اسی وقت آپ کے دفتر پہنچ رہی ہوں۔ آپ فوری طور پر اسے حراست میں لینے کے احکام جاری کر دیں۔ میرے خیال سے بیج گاؤں تھانے کے عملے کو یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“
”میرا خیال ہے مس خان کہ انٹیلی جنس والوں کو اسے حراست میں لینا چاہئے۔“ ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری نے کہا۔

”بہر حال آپ جو بھی مناسب سمجھیں۔“ میں نے کہا۔
”میں تو وقت بچانے کی خاطر کہہ رہی تھی کہ بیج گاؤں تھانے کی پولیس پہلے اسے گرفتار کر لے پھر اسے انٹیلی جنس والوں کے سپرد کیا جاسکتا تھا۔ ہاں یہ بتا دوں کہ اس کمرے کو میں باہر سے مقفل کر آئی ہوں اور اور یہ بتانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ ہر کمرے کی ایک چابی ہوٹل والوں کے پاس بھی ہوتی ہے جس سے کمرہ کھولا جاسکتا ہے۔“

”مگر آپ..... آپ مس خان کس طرح اس سے جانکر آئیں؟“ عبید الرحمن چودھری نے سوال کیا۔ اس کے لمحے میں حیرت تھی۔ ”ابھی چند لمحے پہلے تو آپ کو میں نے نواب پور روڈ پر اتارا تھا!“ مجھے اس وقت عبید الرحمن چودھری کی احمقانہ بات پر غصہ تو آیا، مگر میں ضبط کر گئی اور بولی۔ ”میرا خیال ہے چودھری صاحب کہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ اس وقت تو آپ کو فوری طور پر اس بھارتی ایجنٹ کی گرفتاری کے احکام جاری کرنا چاہئیں!“

”جی..... جی ہاں، ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ مس خان!..... اور پھر آپ تو آہی رہی ہیں ناں یہاں میرے پاس!“
”جی ہاں، خدا حافظ!“ یہ کہتے ہی میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر ٹیلی فون بوتھ سے باہر آ گئی۔

کچھ ہی فاصلے پر باہر اور اس کے ساتھی میرے منتظر تھے۔ میں نے باہر سے کہا۔
”اور..... اور وہ سادری؟..... اس کا کیا ہوگا؟ باہر ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے بولا۔
”اس کا بندوبست میں نے کر دیا ہے تم بے فکر رہو۔ باقی باتیں گھر واپسی پر ہوں گی۔“
”اگر آپ کو کہیں جانا ہے تو میں گاڑی میں پہنچائے دیتا ہوں۔“ باہر نے پیشکش کی۔ ”یوں بھی اب مجھے کوئی کام نہیں ہے۔“

”بہتر ہے کہ تم اپنے دونوں ساتھیوں کو ان کے ٹھکانے پر چھوڑ دو، میں چلی جاؤں گی۔“
”ان میں سے ایک کے پاس گاڑی ہے یہ لوگ میرے بغیر بھی جاسکتے ہیں۔“ باہر بولا ”ویسے اگر رازداری والی کوئی بات ہے تو میں ضد نہیں کروں گا۔“ اس کا لہجہ بجھا ہوا سا تھا۔
”اب تم سے کیا رازداری!..... اگر واقعی تمہارے ساتھیوں کے پاس کنونینس ہے تو پھر تم میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ میں تو تمہارے ساتھیوں کی وجہ سے کہہ رہی تھی دوسرے یہ کہ ناحق میرے ساتھ چل کر تمہیں یورپ ہی ہوگی۔“
باہر کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ غالباً اپنے اس تجسس کو دور کرنا چاہتا تھا کہ میں نے بھارتی ایجنٹ سادری کا کیا بندوبست کیا ہے اور یہ کہ اب کہاں اور کیوں جا رہی ہوں اس نے میری رضامندی پا کر اپنے دونوں ساتھیوں کو رخصت کر دیا اور مجھے ساتھ لئے اپنی کار میں آ بیٹھا۔
کار اشارت کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”کدھر چلنا ہے؟“
”گرین روڈ۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

باہر نے کار آگے بڑھا دی، پھر ذرا توقف سے اس نے پوچھ ہی لیا۔ ”سادری کا آپ نے کیا.....“
”مجھے معلوم تھا کہ تم اس سلسلے میں ضرور سوال کرو گے۔“ میں مسکرا کر بولی، پھر اسے مختصراً یہ بتا دیا کہ مشرقی پاکستان کی انتظامیہ میرے ساتھ تعاون کر رہی ہے اور یہ بھی کہ میں نے اس وقت ہوم سیکرٹری کو فون کیا تھا اور اسی سے ملنے جا رہی ہوں تاکہ سادری کے کمرے سے جو نقشے وغیرہ برآمد ہوئے ہیں ہوم سیکرٹری کے حوالے کر دوں۔

باہر نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ مجھے انتظامیہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔
”مگر باہر! میں اپنے طور پر کام کرنے کو زیادہ پسند کرتی ہوں۔“ میں نے اپنے دل کی بات اس سے کہہ دی۔
”میں جانتا ہوں آپ کو!“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ آزادانہ طور پر کام کرنے کو ترجیح دیتی ہیں۔“

باہر سے اسی طرح کی گفتگو میں سفر تمام ہو گیا۔ ہوم منسٹری کے دفتر سے کچھ پہلے ہی میں نے کار کو روک لیا اور باہر سے وہیں انتظار کرنے کو کہا۔ پھر میں کار سے اتر کر پیدل ہی اپنی منزل کی طرف چل دی۔

عبید الرحمن چودھری کو میں نے اپنا ہی منتظر پایا۔ اس کے پی اے نے مجھے یہ کہتے ہوئے فوراً اندر اس کے کمرے میں پہنچ دیا تھا کہ صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔
کمرے میں داخل ہو کر جیسے ہی میری نظر عبید الرحمن چودھری کے چہرے پر پڑی، میں چونک اٹھی۔ اس کے چہرے سے واضح طور پر فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا۔
”کیوں؟ کیا ہوا؟ آپ کچھ فکر مند سے نظر آ رہے ہیں!“ اس کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے کہا۔ وہ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا

اشارہ کیا، مگر جب تک خود اس کے مقابل ایک عرصی نہ پڑا، وہ کھڑا ہی نہ رہا۔ کرسی پر بیٹھے کے بعد میں نے اپنا سوال پھر دہرایا اور اس کی فکر مندی کا سبب دریافت کیا۔

”وہ نکل گئی“ عبید الرحمن چودھری ٹھنڈا ساٹھ لیتے ہوئے بولا۔

”کون نکل گئی؟“ میں نے دانستہ وضاحت چاہی حالانکہ میں کچھ تو گئی تھی کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے!

”وہی بھارتی ایجنٹ!۔۔۔۔۔ اٹلی جنس والوں کو اس کے ہونے تک پہنچنے میں موثر ہوئی تھی۔ ابھی ابھی فون پر مجھے اٹلی جنس والوں کی بجائے تاج گاؤں پولیس اسٹیشن کے اہلکار آئے تھے، وہی کوہلوں پر چھاپا مارنے کے لئے کہہ دیا ہوتا۔“ عبید الرحمن چودھری کے لئے سے واقعی ہنسوں کا اظہار ہو رہا تھا۔

”مگر یہ کیسے ہوا؟“ میں الجھ کر بولی۔ ”پانچویں منزل کے اس منتقل کرنے سے پہلا وہ کس طرح فرار ہو گئی؟“

”اندازہ اور قیاس یہی ہے، مس خان کہ آپ کے اس کمرے سے نکلے ہی اسے ہوش آ گیا ہوگا۔“ عبید الرحمن چودھری بتاتے لگا۔ ”اطلاعات کے مطابق اس نے کمرے میں موجود فون پر ہونے کے نیچر سے بات کی اور اس سے کہا کہ میرے کمرے میں کچھ لٹیرے آئے تھے جو لوٹ مار کے بعد کمرے کی چابی بھی سرس سے لے گئے ہیں اور مجھے کمرے میں بند کر گئے ہیں۔ میرے کمرے کا دروازہ دہلی کیٹ چابی سے فوراً کھلوا دیجئے! ہونے کے نیچر نے یہ اطلاع پاتے ہی دوسری چابی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھلوا دیا۔ اسی کے ساتھ اس نے درخواست کی کہ جو نقصان ہوا ہے میں پورا کرادوں گا۔ اس واقعے کی رپورٹ آپ پولیس میں نہ کریں۔ اس سے ہونے کی بدنامی ہوگی۔ وہ اس پر رضی ہو گئی۔ مگر فوری طور پر وہ ہونے چھوڑ گئی۔ اس کے بجائے ہی تقریباً پانچ منٹ بعد اٹلی جنس والے ہونے پہنچے اور پھر فون پر مجھے اس ناخوشی کی اطلاع دی۔“

”اس میں ایک غلطی مجھ سے بھی ہوئی ہے۔“ میں خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ ”مگر میں وہ ونگ اور اس نے خشک جھلی وہیں نہ پیچک آتی تو شاید وہ اس قدر آسانی سے فرار نہ ہوتا۔“

”میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں!“ عبید الرحمن چودھری مجھ سے مخاطب ہوا۔

میں نے اسے بتایا۔ ”وہ میک اپ میں تھی اور میں نے اس کے چہرے پر چھٹی ہوئی جھلی اتار دی تھی۔ اس وقت وہ بے ہوش تھی۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے ابھی بیان کر چکی ہوں۔ قیاس غالب یہی ہے کہ ہوش میں آ کر اس نے ونگ دوبارہ اوڑھ لی ہوگی اور اپنے چہرے پر جھلی بھی چڑھا لی ہوگی۔ آپ نے جو واقعہ بیان کیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے، مگر اس کے چہرے پر میک اپ نہ ہوتا تو ہونے کا نیچر یقیناً اس کی طرف سے ٹھیک جاتا اور پھر اسے آسانی سے نہ جانا دیتا۔“ عبید الرحمن چودھری بھی اسے اور آپ کی جھلی میں نے اس امکان پر بھی غور نہیں کیا تھا کہ کمرے میں موجود ٹیلی فون کے ذریعے وہ ہونے کی انتظامیہ سے رابطہ قائم کر کے کمرے کا دروازہ کھلوا سکتی ہے۔ مجھے بھی اپنی حماقت پر ہنسوں ہو رہا تھا۔

ساتویں بوی آسانی سے میری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گئی تھی۔ اب دوبارہ اس کا ہاتھ آنا مشکل ہی تھا۔

”آپ وہ نقشے اور کاغذات لائی ہیں جن کا ذکر فون پر کیا تھا؟“ عبید الرحمن چودھری نے

ما۔

”ہاں لائی ہوئی۔“ میں نے اپنا پرک کھول کر نقشے وغیرہ نکال لیے پھر بولی۔ ”یہ اچھا ہی ہوا میں نے انہیں اسی وقت اپنے قبضے میں لے لیا ورنہ وہ یہ بھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ اب دوبارہ ان حصول کی خاطر اسے مزید یہاں دیکھنا پڑے گا۔ ممکن ہے اس سے اس دوران میں پھر ٹکراؤ ہو جائے۔ مجھے اس کی توقع کم ہی ہے کیوں کہ وہ بہت چالاک عورت ہے۔“

عبید الرحمن چودھری نقشے اور کاغذات اٹھا کر ان کا جائزہ لینے لگا، پھر بولا۔ ”واقعی یہ تو بہت پر نقشے ہیں، دشمن کے ہاتھوں میں ان کا چلا جانا بہت خطرناک ہوتا۔“

”جہاں تک میری معلومات ہیں اسے یہ نقشے دیکھ کر قہر میں نہ آئے۔“ میں نے بتایا۔

”سیو دکر جی! عبید الرحمن چودھری حیرت مندہ آواز میں بولا۔

”کیوں اس میں اتنے حیران ہونے کی کیا بات ہے چودھری صاحب؟“ میں نے حیرت کا

بب بوجھا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سیو دکر جی کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں اور وہ ایسے معاملات میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔ ایک صاحب کو یقین ہے کہ سیو دکر جی ہی نے اس بھارتی ایجنٹ کو یہ نقشے اور کاغذات فراہم کئے ہوں گے؟ میں آپ کی معلومات پر تو کمی کم کا ٹک دیکھ رہی ہوں کہ ان معلومات کے ذریعے کے ہاتھ میں ضرور چھپا جاسکتا ہوگا۔“ عبید الرحمن چودھری نے اپنی بات کی وضاحت کے ساتھ ہاتھ جھجھکے اور دریافت کیا۔

”اپنی معلومات کے ذریعے کے متعلق کچھ بتانا میں مناسب نہیں سمجھتی۔“ میں دو ٹوک الفاظ میں بولی۔ ”ہاں یہ سچ ہے کہ یہ بھارتی ایجنٹ ساتویں بوی اور سیو دکر جی کے درمیان ساز باز بھی ہو رہی ہے گواہ میں خود ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ ساز باز اسی سلسلے میں ہو سکتی تھی۔“

”آپ خود گواہ ہیں؟“ یعنی؟ کیا؟ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

”چودھری صاحب! آپ اس معاملے میں اپنے ذہن کو نہ اٹھا سکتے۔“ میں نے اسے تفصیل کے ساتھ آپ کو سب کچھ نہیں بتا سکیں گی۔ لیکن اٹنا مجھ سے کہہ کر کل رات مجھے اپنے کچھ ذراخ سے یہ معلوم ہوا کہ سیو دکر جی ڈھاکہ کلب میں اس بھارتی ایجنٹ سے ملنے آ رہا ہے۔ اس وقت تک ساتویں بوی میں بھارتی ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں پہچان کی گئی تھی۔ میرا اصل اشارہ سیو دکر جی میں تھا۔ بہر حال میری اطلاع کے مطابق سیو دکر جی اس سے ملنے نہیں آیا۔ وہ بہت چالاک شخص ہے۔ خود آپ نے اس کے بجائے اس نے اپنے ایک آدمی کو ڈھاکہ کلب کے ذریعے کہ وہ ساتویں بوی کو اس کے پاس لے آئے۔“

”قطع کلام معاف کیجئے گا مس خان! آپ اس طرح یہ واقعہ بیان کر رہی ہیں جیسے خود اس وقت ڈھاکہ کلب میں موجود تھیں!“ عبید الرحمن چودھری درمیان میں بول اٹھا۔ اس کے بولنے کا سبب ظاہر ہے

”کچھ کہا نہیں جاسکتا فی الحال!“ میں نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے کل ہی ملاقات ہو جائے۔“
 ”آپ کہیں تو میں اپنی کار میں آپ کو چھڑا دوں!“ اس نے آج بھی اپنی پیشکش دہرائی پھر
 اسی کے ساتھ بولا۔ ”دیے مجھے توقع نہیں کہ آپ میری درخواست قبول کر لیں گی!“
 ”ایسی کوئی بات نہیں کہ میں دانستہ آپ کی پیشگی قبول نہیں کرتی۔ دراصل میں ناحق آپ کو
 زحمت دیتا نہیں چاہتی۔ اگر کبھی میں نے اس کی ضرورت محسوس کی تو یقین کریں کہ ہرگز تکلف سے کام
 نہیں لوں گی۔ آپ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھیں! مہمان نوازی کا شکریہ!“ میں اس کے کمرے کے دروازے
 تک پہنچ کر بولی۔ ”خدا حافظ چودھری صاحب!“
 ”خدا حافظ مس خان!“ یہ کہہ کر عبید الرحمن چودھری اپنی سیٹ کی طرف لوٹ گیا اور میں اس
 کے کمرے سے نکل آئی۔

ہوم بیکر ٹری کے دفتر سے نکل کر میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس طرف چلنے لگی جہاں باہر اپنی
 کار لئے میرا منتظر تھا۔ ابھی میں نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ ایک موٹر سائیکل میرے پاس سے گزر
 کر آگے بڑھ گئی اور پھر ذرا ہی دور جا کر رک گئی۔ موٹر سائیکل پر ایک متوسط عمر کا شخص سوار تھا۔ اس شخص پر
 میں نے اس لئے بھی توجہ دی تھی کہ جب میں ہوم بیکر ٹری کے پی اے سے ملی تھی تو اس کے پاس وہی شخص
 بیٹھا ہوا تھا۔ واپسی پر وہ پی اے کے پاس مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ اگر وہ کچھ دور جا کر رک نہ جاتا اور رک کر
 اس طرح موٹر سائیکل کا معائنہ نہ کرنے لگتا جیسے اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے تو شاید میں اسے نظر انداز
 کر دیتی، مگر اس کے رک جانے کی وجہ سے میں چونکا ہوگئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ میری
 ایک تصویر ہوم نمسٹری کے ریکارڈ روم سے غائب ہو کر سیوڈ مکر جی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ یہ شخص سیوڈ مکر جی کا
 آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ ہوم بیکر ٹری کے پی اے کے پاس بیٹھنے والا شخص دفتر ہی کا کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔ یہی
 قیاس غالب تھا۔

سڑک کے کنارے رکا ہوا وہ شخص ریشم پر بیٹھا اپنی موٹر سائیکل کے کسی پرزے کا جائزہ لے رہا
 تھا۔ میں اس کے قریب سے ہو کر آگے بڑھ گئی۔ کچھ ہی دور باہر کی کار کھڑی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر
 دانستہ میں ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے پر رک گئی اور جبکہ کر باہر سے مخاطب ہوئی۔ ”تم برابر والی
 سیٹ پر بیٹھ جاؤ کار میں چلاؤں گی۔ مجھے ایک ذات شریف راجل دینا ہے جو شاید ہماری کار کا تعاقب
 کرنے کے چکر میں ہیں۔“

باہر فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر برابر والی نشست پر جا بیٹھا اور میں کار کا دروازہ کھول کر
 اندر بیٹھ گئی۔ کار میں بیٹھتے ہی کن آنکھوں سے میں نے موٹر سائیکل والے کو دیکھا تھا۔ وہ اب سیدھا کھڑا
 ہو گیا تھا۔ اب وہ کسی بھی لمحے اپنی موٹر سائیکل اشارت کر کے ہمارا تعاقب کر سکتا تھا۔ کار میں بیٹھ جانے
 کے باوجود میں نے فوراً کار اشارت نہیں کی اور عقبی آئینے میں اس مشتبہ شخص کا جائزہ لینے لگی وہ یقیناً اس
 میک اپ میں مجھے عذرا خان کی حیثیت سے پہچان چکا تھا۔

”کیا بات ہے آپ کار اشارت کیوں نہیں کر رہی؟“ باہر نے پوچھا۔
 ”ذرا اس شخص کے صبر کا امتحان لے رہی ہوں جواب اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو چکا ہے۔“

تصدیق ہی ہو سکتا تھا۔

”جی ہاں! میں خود موجود تھی وہاں!“ میں نے تصدیق کر دی۔
 ”بس ایک سوال اور!“ عبید الرحمن چودھری معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ”اگر آپ مائنڈ نہ
 کریں!“
 ”ہاں ہاں بولیں! میں برا نہیں مانوں گی۔ یقین کریں جس حد تک میں آپ کو بتا سکتی ہوں
 ضرور بتاؤں گی۔“

”ہمارے ریکارڈ میں سیوڈ مکر جی کا کوئی فوٹو گراف نہیں ہے۔ اس کے بارے میں شہرت بھی
 یہی ہے کہ چند افراد کے سوا اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ پھر آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ جو شخص ڈھاکہ کلب میں
 بھارتی ایجنٹ سادری سے آکر ملا تھا وہ خود سیوڈ مکر جی نہیں تھا؟“ عبید الرحمن چودھری نے تفصیل کے
 ساتھ سوال کیا۔

”سیوڈ مکر جی کے بارے میں میری معلومات یہ ہیں کہ وہ پستہ قد شخص ہے اور جو شخص ڈھاکہ
 کلب میں سادری سے ملا تھا وہ اسی شخص تھا۔“

”اس شخص پر اسرار شخص سیوڈ مکر جی کے متعلق یہ بتا کر آپ نے میری معلومات میں اضافہ کیا
 ہے مس خان! مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی، شکریہ!..... ہاں تو آپ بتا رہی تھیں کہ.....“

”جی!“ میں پھر گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کی تفصیل اسے بتانے لگی۔ ”سادری کو
 اس شخص نے ایک پرچہ دیا جو میرے قیاس کے مطابق سیوڈ مکر جی ہی نے بھیجا تھا۔ وہ پرچہ پڑھ کر سادری
 کچھ ہی دیر بعد مل ادا کر کے اس شخص کے ساتھ چلی گئی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا، لیکن بد قسمتی سے کسی
 طرح سیوڈ مکر جی کے آدمی کو تعاقب کا علم ہو گیا اور..... پھر میں نے وہی سب کچھ دہرایا جو پیش آیا تھا۔
 میری بات سن کر عبید الرحمن چودھری نے طویل سانس لیا، پھر بولا۔ ”ہمارے محکمے سے بہتر
 کارکردگی تو آپ کی ہے کہ اتنی جلدی اس پر اسرار شخص کی راہ پر لگ گئیں! ہمارا محکمہ تو اب تک اندھیرے ہی
 میں بھٹکتا پھر رہا ہے۔“

”مگر اس سے کوئی فائدہ تو نہیں ہوا چودھری صاحب!..... میں تو ایک بھارتی ایجنٹ تک کو
 گرفتار نہیں کر سکی اور یقیناً اس میں میری کوتاہی کو بھی دخل ہے۔“

”خیر یہ تو آپ کس نفسی سے کام لے رہی ہیں! آپ کو یہاں آئے ہوئے دن ہی کہتے ہوئے
 ہیں!“ یہ کہہ کر اس نے ٹھٹھی بجا کر چپراسی کو بلایا اور چائے لانے کے لئے کہا۔ میرے انکار کے باوجود وہ
 نہیں مانا تھا۔ چائے پینے سے انکار کا سبب باہر بھی تھا جو میرا انتظار کر رہا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں عبید الرحمن چودھری سے آج رات پولیس ریڈ کے بارے میں بھی
 بات ہوئی۔ اس نے رات گیارہ بجے پولیس کو تیار رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ چائے پی کر میں فوراً ہی اٹھ
 کھڑی ہوئی۔

”اب آپ سے کب ملاقات کا امکان ہے؟“ عبید الرحمن چودھری اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے

ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

سیرکڑی کا، اب مجھے اس کی طرف سے کوئی کھٹکانہ نہیں رہا تھا۔ اگر اس وقت باہر میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اتنی آسانی کے ساتھ اس سے جان نہ چھڑا پاتی۔

گھنے درختوں کی آڑ سے نکلنے ہوئے میں نے ایک ٹیکسی کو قریب آتے دیکھا۔ وہ گرین روڈ کی طرف جاری تھی اور یہ توقع کم ہی تھی کہ ٹیکسی والا واپسی کے سفر پر آمادہ ہو جاتا اس کے باوجود میں حیرت کے ساتھ سڑک کے کنارے آکھڑی ہوئی۔ ٹیکسی مزید قریب آئی تو یہ دیکھ کر میں مایوس ہو گئی کہ پیچھے ایک سواری بیٹھی تھی۔ میں نے اسے اسی لئے نہیں روکا، مگر خلاف توقع ٹیکسی میرے پاس آ کر رک گئی۔

”کاہاں جائے گا آپ؟“ بنگالی ٹیکسی والے نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے پوچھا۔
”مگر تہار ٹیکسی میں تو سواری بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے اسی لئے تمہیں روکا بھی نہیں تھا۔“

میں نے کہا۔

”یہ شواری (سواری) نہیں، امارا دوست (دوست) اے۔ آپ بولو نا کدر جانے مانگتا؟“
میں عموماً کسی ایسی ٹیکسی میں بیٹھنے سے گریز کرتی ہوں جس میں ڈرائیور تنہا نہ ہو اس کا کوئی دوست یا عزیز بھی ساتھ ہو مگر اس وقت اس احتیاط کو نظر انداز کر دیا۔

”مجھے بادام تلی گھاٹ جانا ہے۔“ میں نے ٹیکسی والے کو بتایا۔

”ابی ام اور سے آتا کھائی، پانس ٹوکا (پانچ روپے) بیش (زیادہ) لے گا، بولو چلنا کہ نہیں؟“
”چلو لے لینا!“ میں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔

”اے کھو! ابی تم اور آگے بیٹا!“ ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے نوجوان ساتھی کو مخاطب کیا۔

وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس دوران میں اس نے سر سے پاؤں تک عجیب سی نظروں سے میرا جائزہ لیا اور ان عجیب گستاخ نظروں کا مفہوم سمجھنا میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ میں اس لئے مطمئن تھی کہ اس جیسے لفظوں کا دماغ درست کرنا مجھے خوب آتا تھا۔ پھر بھی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے ہوئے میں چونکا ہو گئی۔

میرے بیٹھنے ہی ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی موڑنے کی بجائے اسے پوری سپیڈ میں سیدھا بھاگنا شروع کر دیا اور پھر دائیں جانب گرین روڈ کی سمت موڑنے لگا۔

میں نے کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر اپنے پرس سے ریوالور نکالا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو باہر نے مجھے ہوٹل جاتے ہوئے دیا تھا۔

”واپس چلو! ورنہ تم میں دونوں کے سروں میں سوراخ کر دوں گی!“ میں نے ریوالور کی نال

ٹیکسی ڈرائیور کی گدی سے لگادی۔

بھینا اس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں رہا ہوگا کہ ایک اکیلی عورت ایک دم اتنا جارحانہ رویہ بھی اختیار کر سکتی ہے اور یہ کہ اس کے پاس ریوالور بھی ہو سکتا ہے! نتیجتاً وہ بوکھلا گیا اور ٹیکسی سڑک پر لہرانے لگی۔ یوں بھی اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

”اتنی آدی!“ میں چیخ اٹھی۔ ”اسٹیرنگ سنبالو! ورنہ میرے مارنے سے پہلے اپنے آپ ہی

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”وہ اس توقع پر گلیں لگا رہا ہے کہ اب کسی بھی لمحے میری کار حرکت میں آجائے گی۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ اب وہ کس بہانے اپنی جگہ رکا رہتا ہے۔“

عقبی آئینے میں موٹرسائیکل والے کو میں نے کار کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ اپنی موٹرسائیکل اشارت کر چکا تھا، مگر ابھی اسے آگے نہیں بڑھایا تھا۔ موٹرسائیکل اشارت ہو جانے کے بعد اب اس شخص کا اسی جگہ کھڑا رہنا اسے مشتبہ ظاہر کر سکتا تھا۔ میں نے جب کار اشارت نہ کی تو مجبوراً اسے حرکت کرنا ہی پڑی مگر اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ کچھ دور آگے بڑھ کر وہ دوبارہ واپس جانے لگا۔ پھر جیسے ہی اس نے واپسی کا سفر اختیار کیا، میں نے کار اشارت کر دی۔

وہ شخص بھی یقیناً عقبی آئینے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کار کے حرکت میں آتے ہی اس نے موٹرسائیکل کا رخ پھر کار کی طرف موڑ لیا، مگر اس طرح کار اور موٹرسائیکل کا درمیانی فاصلہ خاصا ہو گیا۔ گیزر تبدیل کرتے ہوئے میں نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی اور وہ موٹرسائیکل والا کافی پیچھے رہ گیا۔

”سنو باہر اب جو موڑ آ رہا ہے وہاں سڑک کے کنارے گھنے درخت ہیں۔ میں وہاں کار روک کر اتر جاؤں گی اور پھر تم ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لینا۔ میں کوئی ٹیکسی کر کے گھر پہنچ جاؤں گی۔ ہاں تم سیدھے گھر نہیں پہنچو گے۔ یہ ضروری ہے کہ تعاقب کرنے والے کو معلوم ہو جائے کہ میں اب تم اکیلے ہو۔ اس کے لئے تم کار کو کسی ہوٹل کے سامنے کھڑا کر کے ہوٹل میں چلے جانا۔ جب وہ شخص یہ دیکھے گا کہ میں کار سے غائب ہو چکی ہوں اور تم اکیلے رہ گئے ہو تو پھر تمہارا پیچھا نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود تم چونکا رہنا کہ کہیں وہ میری طرف سے مایوس ہو کر تمہارے ہی پیچھے لگا ہوا گھرنیک نہ آجائے!..... سمجھ گئے؟“

”جی ہاں اچھی طرح سمجھ گیا، آپ بالکل فکر نہ کریں اور اگر آپ کہیں تو میں اس شخص کو کوئی

سبق بھی دے دوں!“ باہر بولا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”یہ تو محض زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اس سے الجھنا فضول ہوگا۔“

”جو آپ کا حکم!“ اس نے اسی طرح سعادت مندی سے کہا کہ مجھے اپنے آپ پریشن سیل کا نگران کمانڈر نواز یاد آ گیا۔

چند ہی لمحے بعد موڑ آ گیا۔ میں نے عقبی آئینے میں موٹرسائیکل والے کو دیکھا جو ایک چھوٹے سے دھبے کی صورت نظر آ رہا تھا۔ میں نے بائیں جانب گاڑی موڑ کر روک دی اور پھر فوراً اس سے اتر کر سڑک کے کنارے گھنے درختوں کی طرف لپکنے لگی۔

ذرا ہی دیر کے بعد ایک درخت کے تنے کی آڑ میں چھپی ہوئی میں باہر کی کار کو آگے بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے اس موٹرسائیکل والے کی آمد کا انتظار تھا۔ پھر جب کچھ دیر بعد وہ بھی میرے سامنے سے تیز رفتاری کے ساتھ گزر گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اسے جل دینے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ میں نے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ وہ تعاقب کرنے والا خود ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چودھری کا آدی رہا ہو اور اسی کے ایما پر میرا تعاقب کر رہا ہو۔ بہر حال وہ سیدو مگر جی کا آدی رہا ہو یا ہوم

خودکشی کر کے مری جاؤ گے! سپیڈ کم کرو اور پھر ٹیکسی روک لو!“ اسی کے ساتھ میں نے اس کی گدی سے ریوالور کی نالی ہٹائی کہ کہیں وہ بولھلاہٹ میں ٹیکسی کو سڑک کے کنارے موجود کسی پیڑ سے نہ گرا دے۔ ریوالور کی ٹھنڈی نال اپنی گدی سے ہٹتے ہی اسے کچھ ہوش آ گیا اور پھر اس نے اسٹیرنگ اچھی طرح سنبھال لیا۔

”روکو ٹیکسی!..... اور پھر ریورس میں لے کر واپس چلو!“ میں نے اسے دوسرا حکم دیا۔

”؟؟؟ ما..... گر پھل.....“ وہ ریوالور کے خوف سے ہلکانے لگا۔

”یقین رکھو میں تمہیں اسی صورت میں گولی نہیں ماروں گی کہ تم میرے حکم پر چلتے رہو!“ یہ کہتے ہوئے میں آئینے میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس کے نو جوان ساٹھی کا چہرہ بھی خوف کے سبب مزید تاریک نظر آ رہا تھا۔

بالآخر اسے میرا حکم ماننا ہی پڑا اور ٹیکسی نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور خوف زدہ آواز میں مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں اسے پولیس کے حوالے تو نہیں کر دوں گی!

میں یوں بھی معمولی چوراہوں سے نہیں الجھتی۔ اس کے باوجود جو خود ہی مجھ سے خواہ مخواہ الجھ پڑتا ہے اسے بخشتی بھی نہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کی بات کے جواب میں چند لمحے خاموش رہ کر میں نے کہا۔ ”میں تم دونوں کو پولیس کے حوالے تو نہیں کروں گی، لیکن تمہیں اپنے طور پر سزا ضرور دوں گی تاکہ تم لوگ آئندہ کسی اکیلی عورت کو دیکھ کر گیدڑ سے شیر بننے کی کوشش نہ کرو!“ یہ کہہ کر میں چپ ہو گئی اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کے اس سوال کا جواب نہیں دیا کہ میں ان دونوں کو کیا سزا دوں گی!

بادام تلی گھاٹ پہنچ کر میں نے نسبتاً کم آباد اور تنگ سی گلی میں ٹیکسی روکالی اور ان دونوں سے نیچے اترنے کو کہا۔ وہ دونوں حیران حیران سے نیچے اتر آئے۔

”اب تم دونوں ایک دوسرے کی ٹھکانی کرو!“ میں نے انہیں حکم دیا، مگر وہ میرا عجیب حکم سن کر ساکت کھڑے رہے۔ گلی میں ادھر ادھر دیکھ کر میں نے اپنا پرس کھول لیا اور پھر ریوالور پر نظر پڑتے ہی مشینی انداز میں وہ ایک دوسرے پر چل پڑے۔ مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ ریوالور میں نے پرس سے نکالتے نکالتے دوبارہ پرس میں رکھ لیا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ وہ ایک دوسرے پر پھنپھن اور گھونے برساتے رہے اور پھر میرا حکم سنتے ہی کہ بس کرو وہ ہانپتے ہوئے رک گئے۔ ان میں سے ایک کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور دوسرے کی دائیں ہاتھوں پھٹ گئی تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ اگر تم بد معاشی نہ کرتے تو شاید میں تمہیں میٹر سے پانچ روپے زیادہ کرایہ ہی دے دیتی، مگر اب میٹر کے مطابق ہی کرایہ دوں گی۔

اس ابتلا کے بعد شاید ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ملنے کی توقع نہیں رہی تھی۔ اسی لئے جب میں نے میٹر کے مطابق کرایہ اس کی طرف بڑھایا تو وہ حیران سا نظر آنے لگا۔

”رکھ لو رکھ لو!..... چلو جلدی کرو!“ میں نے مزید کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کچھ ڈرتے جھجکتے ہوئے کرایہ لے لیا اور پھر میرے اشارے پر وہ اپنے ساتھی سمیت ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں وہاں سے اس گلی کی طرف چل دی جس میں بابر

دوست فرید احمد کا گھر تھا۔

مجھ سے پہلے بابر وہاں پہنچ چکا تھا اور بابر چچی خانے میں گھسا ہوا دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ملازم کو جواب دے دینے کی وجہ سے اب کھانا وغیرہ بابر اور اس کے دوست ہی کو پکانا پڑتا تھا۔ کبھی ہوٹل سے بھی کھانا آ جاتا تھا اور کبھی وہ لوگ خود ہوٹل میں کھانا کھا آتے تھے۔

کچھ دیر بعد کھانا کھاتے ہوئے میں بابر سے کہہ رہی تھی۔ ”آج رات مجھے تمہاری کاری ضرورت پڑے گی۔“

”لے جائیے گا اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے! آپ ہی کی کار ہے۔“

”میں نے اس لئے پہلے سے کہہ دیا کہ کہیں رات کو تمہیں کسی جگہ جانا نہ ہو!“

”مجھے تو خیر کہیں نہیں جانا، مگر آپ..... آپ کہاں جا رہی ہیں؟ اگر آپ مناسب سمجھیں تو

بتادیں!“

”نارائن گنج جانا ہے مجھے!“ میں نے راز داری نہیں برتی، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔

بابر نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ بھی غالباً سمجھ گیا تھا کہ میں مزید کچھ بتانا نہیں چاہتی۔

کھانا کھا کر چائے پینے کے بعد میں اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی آئی۔ بابر بیرونی کمرے میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔

شام ساڑھے چار بجے کے بعد میں سو کر اٹھی۔ اس دوران میں بابر کا دوست فرید احمد بھی آچکا تھا۔ میں غسل خانے میں گھس گئی اور فرید احمد چائے بنانے لگا۔ شام کی چائے بابر فرید احمد اور میں نے ساتھ ساتھ پی۔ اسی دوران میں مجھے اس موٹر سائیکل والے کا خیال آ گیا جس نے گرین روڈ سے میرا تعاقب کیا تھا۔ میں نے بابر سے اس کے متعلق پوچھا۔

”آپ جب کار سے اتر گئی تھیں تو میں نے رفتار بہت کم کر دی تھی۔“ بابر بتانے لگا۔ ”میں چاہتا تھا کہ موٹر سائیکل والا قریب آ جائے اور یہ دیکھ لے کہ میں کار میں تنہا ہوں، مگر کار کی رفتار کم ہوتے ہی اس نے بھی موٹر سائیکل کی رفتار کم کر لی اور درمیانی فاصلہ برقرار رکھا۔ نتیجتاً وہ جناح ایونیو تک میرے پیچھے لگا چلا آیا۔ جناح ایونیو میں گلستان سینما کے قریب ایک ہوٹل کے سامنے میں نے کار روک دی اور ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ موٹر سائیکل والا بھی وہاں پہنچ گیا۔ کار خالی دیکھ کر اس کے چہرے سے انتہائی حیرانی کا اظہار ہوا تھا۔ میری توجہ اسی کی طرف تھی۔ پھر وہ ہوٹل میں داخل ہوا اور مجھے ایک میز پر اکیلا بیٹھے دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں چائے پی کر ہوٹل سے نکلا تو وہ اپنی موٹر سائیکل سمیت غائب تھا۔ آپ نے جو تدبیر بتائی تھی وہ کارگر ثابت ہوئی۔“

”بابر! میں تم سے ایک اور بات بھی کرنا چاہتی تھی، مگر گزشتہ رات اس کا موقع نہیں ملا۔ اچھا

ہے کہ اس وقت تمہارا دوست بھی یہاں موجود ہے۔“ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات شروع کی۔ وہ دونوں ہی توجہ سے میری بات سن رہے تھے۔ میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولی۔ ”کل جو واقعہ یہاں پیش آیا اس کے بارے میں تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ اس واقعے سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ سیوڈ مگر جی سمیں نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہے۔ خود میں نے بھی ٹھنڈی زبانی

صدر گھاٹ کا راستہ چند منٹ کا تھا اس لئے میں پونے گیارہ بجے گھر سے نکلی۔ مجھے گیارہ بجے ہی آئی ڈی آفس پہنچنا تھا مگر میں کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گئی۔ سادہ لباس میں پولیس پارٹی تقریباً تیار ہی تھی۔ رواجی میں اسی لئے زیادہ دیر نہیں لگی۔ ایک پولیس انسپکٹر کو میں نے اپنے ساتھ کار میں بٹھالیا۔ پولیس جیب میں ڈرائیور سمیت نصف درجن مسلح پولیس والے تھے۔ پولیس انسپکٹر کو یوں بھی میں نے اپنے ساتھ بٹھایا تھا کہ وہ راستہ بتاتا رہے۔ وہ علاقہ بہر حال میرے لئے تقریباً نیا ہی تھا۔ جب ہم سی آئی ڈی آفس سے نکلے تو میری کار آگے تھی اور جیب اس کے پیچھے۔ ضیاء الاسلام کی حویلی کا سرج وارنٹ اور خورشید السلام کی گرفتاری کا وارنٹ دونوں ہی پولیس انسپکٹر کے پاس موجود تھے۔

نصف شب سے کچھ پہلے جب ہم نارائن کج کی آبادی میں داخل ہوئے تو ہر طرف گہرے سکوت اور اندھیرے کی حکمرانی تھی کچھ ہی دیر بعد ضیاء الاسلام کی حویلی کے سامنے میں نے اپنی کار روک دی۔ اسی کے ساتھ جیب بھی رک گئی۔

”تم اترو اور جا کر حویلی کے پھانک پر دستک دو!“ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے پولیس انسپکٹر سے کہا اور پھر خود بھی کار کا انجن بند کر کے نیچے اتر گئی۔

میں نے جیب میں سوار مسلح افراد کو بھی نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ انہیں یہ احکام ملے تھے کہ جو میں کہوں اس پر عمل کریں۔

”تم میں سے دو ہمیں حویلی کے پھانک پر رہو گے!“ میں بولی۔ پھر میں نے ان میں سے دو کی ڈیوٹی حویلی کے عقب میں لگادی۔ دو افراد کو میرے اور پولیس انسپکٹر کے ساتھ حویلی کے اندر چلنا تھا۔ پولیس انسپکٹر میرے حکم پر حویلی کے ذیلی پھانک پر زور زور سے دستکیں دینے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد پھانک کے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر پھانک کا ذیلی دروازہ کھل گیا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے ہاتھ میں لائٹن لئے باہر آ گیا۔ چلیے سے وہ چوکیدار ہی معلوم ہوتا تھا۔

چوکیدار کے یہ پوچھنے پر کہ کیا بات ہے؟ اور ہمیں کس سے ملنا ہے؟ پولیس انسپکٹر نے کہا۔

”ہمیں خورشید الاسلام سے ملنا ہے کیا وہ حویلی میں ہیں؟“

جواب میں چوکیدار نے صاف انکار کر دیا کہ وہاں خورشید الاسلام نام کا کوئی شخص نہیں رہتا اور یہ کہ وہ حویلی ضیاء الاسلام کی ہے۔ اس کے لہجے اور آواز سے جھوٹ کا صاف اندازہ ہو رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ کچھ خوف زدہ بھی ہے

”انسپکٹر!“ میں بول اٹھی۔ ”حویلی کے سارے ملازمین اسی کے ہمنوا ہیں۔ یہ لوگ کچھ نہیں بتائیں گے اندر چلو!..... اور اسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دو!“

”اے! تم ادھر جیب کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ!“ پولیس انسپکٹر نے ادھیڑ عمر چوکیدار کو حکم دیا۔

چوکیدار کوئی احتجاج کئے بغیر جیب کی طرف بڑھ گیا۔ میں پولیس انسپکٹر اور دو پولیس والوں کے ساتھ حویلی میں داخل ہو گئی۔ میرے حکم پر بھی میں نے اپنے اپنے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لئے لئے تھے۔ پولیس انسپکٹر کے دوسرے ہاتھ میں ایک بڑی سی نارنج بھی تھی اور وہی میرے ساتھ ساتھ گئے چل رہا

سنا تھا کہ وہ لوگ تمہارا کوئی بندو بست کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات بہر حال خطرے سے خالی نہیں کہ سیوڈ کمر جی کے گرگے تمہارے ٹھکانے سے واقف ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم جلد از جلد یہ جگہ بدل دو! سیوڈ کمر جی ہی کے ایما پر اس کے ایک غنڈے اکبر نے اپنے آدمیوں سے تم پر حملہ کرانے کی کوشش کی تھی۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت یہاں نہ تم تھے اور نہ فرید احمد! نتیجتاً ان غنڈوں کی مڈھ بھیڑ مجھ سے ہو گئی اور پھر انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انہی غنڈوں نے بتایا تھا کہ وہ پانچ ہزار روپے پیشگی اس کام کے لئے اکبر سے وصول کر چکے ہیں۔ مزید پانچ ہزار روپے انہیں کام ہونے کے بعد ملنے والے تھے۔ میرے خیال میں اکبر اتنا سیدھا نہیں ہوگا کہ ان غنڈوں پر پانچ ہزار روپے چھوڑ دے۔ وہ یقیناً ان غنڈوں سے استفسار کرے گا۔ ان غنڈوں نے اگر پانچ ہزار روپے خرچ نہیں کئے ہوں گے تو اکبر کو واپس کر دیں گے۔ بھر ظاہر ہے کہ اکبر کوئی دوسرا بندو بست کرے گا۔ تم لوگ میری بات سمجھ رہے ہو نا!..... اس صورتحال سے بچنے کا یہی راستہ ہے کہ اس مکان کی سکونت ترک کر دی جائے۔ بولو کیا کہتے ہو تم لوگ؟“ میں اپنی بات ختم کر کے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

چند لمحے توقف کے بعد بابر میری بات کے جواب میں بولا۔ ”آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں، ہمیں واقعی یہ مکان چھوڑ دینا چاہئے۔ ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ میرے ساتھیوں میں سے کئی ایسے ہیں جو اکیلے رہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے ان میں سے کسی کو عارضی طور پر یہاں منتقل کر دیا جائے اور ہم وہاں چلے جائیں۔“

یہ کہہ کر بابر اپنے دوست فرید احمد سے مخاطب ہوا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے فرید! ہم یہاں سے اپنے کس دوست کے گھر منتقل ہو سکتے ہیں؟“

”جعفری یا اقبال! ان دونوں ہی میں سے کسی کے گھر ہم رہ سکتے ہیں۔ ان دونوں کے گھروں میں گنجائش بھی خاصی ہے۔“ فرید احمد نے اپنے دوست کی بات کا جواب دیا۔

بابر نے فرید احمد کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ جعفری کا گھر ٹھیک رہے گا! میں آج ہی اس سے بات کئے لیتا ہوں۔“

”تمہارا یہ دوست رہتا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھ لیا۔ پوچھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے بھی بہر حال بابر ہی کے ساتھ رہنا تھا۔

”جعفری کا گھر عظیم پور میں ہے۔“ بابر نے بتایا۔

اس روز رات کا کھانا بابر فرید اور میں نے موتی جھیل کے پرانی ہوٹل میں کھایا جو پلٹن میدان کے عقب میں ہے۔ کھانا کھا کر گھر کی طرف لوٹتے ہوئے بابر نے ایک پٹرول پمپ سے کار کی نیٹگی فل کرائی کیوں کہ آج ہی رات اسی کار میں مجھے نارائن کج جانا اور آنا تھا۔

شام ہی کو بابر اپنے دوست جعفری سے مکان کی منتقلی کی بات کر آیا تھا۔ جعفری اس پر راضی ہو گیا تھا۔ طے پایا تھا کہ آئندہ روز اپنا اپنا سامان ایک دوسرے کے گھروں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ بس اب ایک ہی رات رہ گئی تھی اور میرے نزدیک یہ اتنے بڑے خطرے کی بات نہیں تھی۔

موتی جھیل سے ہم بادام تللی گھاٹ پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ بادام تللی گھاٹ سے

تھا۔ حویلی کے احاطے میں ابھی ہم کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ معا ایک جانب سے کسی درندے کے غرانے کی سی آواز سن کر میں اچھل پڑی اور اسی کے ساتھ میرے قدم رک گئے۔ درندے کی آواز کے فوراً بعد ہلکی سی ایک نسوانی چیخ بھی ابھری اور معدوم ہوگئی۔ بالکل ایسی ہی آواز میں نے اس رات بھی اس حویلی میں سنی تھی جب مجھے یہاں قید کیا گیا تھا۔

”ادھر چلو!“ میں نے اس طرف اشارہ کیا جدھر سے درندے کے غرانے کی آواز آئی تھی۔

ہم سب ذرا ہی دیر بعد بائیں جانب حویلی کے ایک حصے تک پہنچ گئے۔ میرے کہنے پر انسپٹر نے نارنج کی روشنی ادھر ادھر ڈالی۔ میں اس جگہ کو پہچان گئی۔ حویلی کا یہ وہی حصہ تھا جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ سامنے ہی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔

”آؤ میرے پیچھے!“ یہ کہہ کر میں اس دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

پولیس انسپٹر اور اس کے دونوں ساتھی میرے پیچھے پیچھے اندر آ گئے۔ اسی وقت پھر نسوانی چیخ سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ بہت واضح اور قریب محسوس ہوئی تھی۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کسی نے چیخنے والی کا گلا دبا دیا ہو۔ حویلی کا وہ حصہ میرا دیکھا بھلا تھا۔ یہاں دو کمرے تھے ایک چھوٹا کمرہ اور دوسرا بڑا کمرہ رابرداری عبور کر کے میں اس کمرے میں آ گئی جہاں ایک رات بسر کی تھی۔ چیخنے کی آواز اسی سمت سے آئی تھی مگر وہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ نارنج کی روشنی خالی کمرے میں چمکرائی پھر رہی تھی۔

”یہاں..... یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“ پولیس انسپٹر کی سرکش سی آواز ابھری۔ اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا ہو۔ اس کی آواز سے خوف کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

”یہاں دوسرا کمرہ بھی ہے چلو اسے دیکھتے ہیں۔“ میں نے انسپٹر سے کہا۔

”جی..... جی بہتر ہے۔“ پولیس انسپٹر بولا۔

عین اس وقت عقب سے ایک بلند قہقہہ سنائی دیا اور میرے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ خورشید الاسلام ہی کا قہقہہ ہو سکتا تھا۔ معا میرے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا اور میں چیخ اٹھی۔ ”نگو یہاں سے!..... جلدی!..... ورنہ ہم چوہوں کی طرح یہاں پھنس کر رہ جائیں گے۔“

”پھنس تو چکی ہو تم عذرا خان اور کیا پھنسو گی!“ عقب سے خورشید الاسلام کی بلند آواز سنائی

دی۔

میں بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل کر رابرداری میں آ گئی اور پھر دروازے کی طرف دوڑی مگر اسی دوران میں کسی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ ظاہر ہے کہ دروازہ بند کرنے والا وہی ہو سکتا تھا جس کی تلاش میں میں یہاں تک آئی تھی یعنی خورشید الاسلام اس نے مجھے میری آواز سے یقیناً پہچان لیا تھا اسی لئے میرا نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ مجھے جس بات کا خطرہ تھا وہی میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں ان پولیس والوں سے ساتھ واقعی چوہوں کی طرح پھنس کر رہ گئی تھی۔

پولیس انسپٹر اور دونوں پولیس والے بھی میرے قریب آ گئے۔

”یہ..... یہ کیا ہوا؟..... کیا کسی نے دروازہ باہر سے بند کر دیا؟“ پولیس انسپٹر بند دروازے پر نارنج کی روشنی ڈالتا ہوا احتجاجاً انداز میں بولا۔

میں پولیس انسپٹر کی بات سن کر جھنجھلا گئی اور کہا۔ ”کیا تمہیں بند دروازہ نظر نہیں آ رہا انسپٹر؟“

”جی..... جی ہاں نظر آ رہا ہے مگر کیوں بند کیا گیا ہے دروازہ؟“

معلوم نہیں کس نے اسے پولیس کے محکمے میں بھرتی کر لیا تھا صورت دیکھ کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس قدر بے وقوف ہوگا۔ میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دانستہ نسبتاً نرم لہجے میں دیا۔ ”دروازے اس لئے بند کئے جاتے ہیں انسپٹر کہ کوئی باہر نہ نکل سکے۔ اب سمجھ گئے تم کہ دروازہ کیوں بند کیا گیا ہے؟“

”جی..... جی..... جی ہاں سمجھ گیا میں۔“ وہ بے وقوفوں کی طرح یوں سر ہلانے لگا جیسے واقعی اب اصل بات اس کی سمجھ میں آئی ہو۔

مجھے افسوس یہ تھا کہ اس ریڈ کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر تھی پولیس انسپٹر اس کا ذمہ دار نہیں تھا۔ اسے تو میرے احکام پر عمل کرنے کو کہا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ مجھے ان لوگوں کا خیال بھی تھا جنہیں میں باہر چھوڑ آئی تھی۔ خورشید الاسلام کے آدمی ان پر بھی ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ موجودہ صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔

چند لمحوں بعد میں نے انسپٹر کے ہاتھ سے نارنج لے کر دروازے کا جائزہ لیا لکڑی کا وہ دروازہ خاصا مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ کن ریوالور کی گولی سے اس میں سوراخ کیا جاسکتا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا۔ ہم چار افراد تھے اور چاروں ہی کے پاس ریوالور تھے اور خاصے فالتو راؤنڈ بھی!

”انسپٹر! اس چوہے دان سے نکلنے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔“ کچھ سوچ کر میں نے انسپٹر کو مخاطب کہا۔ ”میں اپنے ریوالور کی نال سے اس دروازے پر چار لکیریں بنا رہی ہوں تم لوگوں کو باری باری تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ان لکیروں پر فائر کرنا ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے دوبارہ انسپٹر کو نارنج پکڑا دی اور کہا۔ ”تم دروازے پر نارنج کی روشنی ڈالو میں لکیریں کھینچتی ہوں۔“

انسپٹر نے میرے ہاتھ سے نارنج لے لی اور دروازے پر روشنی ڈالنے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کر ریوالور کی نال سے لکڑی کے دروازے میں ایک اتنی لمبی لکیر بنائی کہ لکیروں کا چوکور خانہ اتنا وسیع بن سکے جو اس میں سے گزر کر ایک آدمی باہر نکل جائے۔ دو متوازی لکیروں کی لمبائی میں نے زیادہ رکھی تھی بقیہ دو لکیریں اوپر نیچے پہنچ کر میں نے خانہ مکمل کر دیا۔ لکڑی مرطوب آب دھوا کی وجہ سے نسبتاً نرم تھی ورنہ اس قدر آسانی سے واضح لکیریں نہ بن پاتیں۔ دروازے سے پیچھے ہٹتے ہوئے میں نے انسپٹر اور اس کے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ ”کیا تم لوگوں کو لکیریں صاف نظر آ رہی ہیں؟“

”جی ہاں نظر آ رہی ہیں اور ان پر آپ کی ہدایت کے مطابق فائرنگ کی جاسکتی ہے۔“ انسپٹر نے میری بات کا جواب دیا اور پھر بقیہ دو افراد نے بھی اس کی تائید میں سر ہلا دیئے۔

”اچھا تو پھر پہل میں کرنی ہوں۔“ میں نے کہا۔

پھاٹک ہی پر تھی۔ میرے استفسار پر کہ اسے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ وہ بتانے لگا۔ ”آپ لوگوں کے اندر جانے کے کچھ ہی دیر بعد پھاٹک کے ذیلی دروازے سے کوئی گول سی چیز کسی نے باہر پھینکی جو ہمارے قریب ہی آ کر پھٹی اور پھر ہر طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کیا ہوا مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں گرنے سے بچنے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ میری سانس کی نالی اور سینے میں مچھلی بھر گئی تھیں اور سر بری طرح چکرانے لگا تھا۔“

بے ہوش کرنے والی گیس! میرے ذہن میں اس کا بیان سن کا یہی خیال آیا۔ میں نے اس حویلی میں سولومن کو بھی دیکھا تھا۔ یہ ”کارنامہ“ اسی کا ہوسکتا تھا۔ اسی دوران میں یقیہ بے ہوش افراد بھی ہوش میں آ گئے۔ انہوں نے بھی یہی کہانی سنائی تھی۔

مقامی باشندوں کو میں نے بتا دیا تھا کہ ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہم لوگ حویلی کی تلاشی لیں تو وہ کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ اب میں حویلی میں دوبارہ داخل ہونا چاہتی تھی۔ ایک مقامی باشندے سے میں نے حویلی کے کینوں کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ اس کی اطلاع کے مطابق ضیاء الاسلام کے علاوہ حویلی میں اب اس کا سوتلا بھائی خورشید الاسلام ہی رہتا تھا۔ ضیاء الاسلام کی بیوی کافی عرصے قبل مر چکی تھی، ایک بیٹی تھی جو چھ ماہ پہلے نارائن گنج سے چلی گئی تھی۔ اس کے بارے میں ضیاء الاسلام نے مقامی باشندوں کو یہ بتایا تھا کہ وہ اب اپنی پھوپھی کے پاس ڈھاکہ میں رہتی ہے۔ اب ان دو بھائیوں کے علاوہ حویلی میں صرف نوکر تھے۔

میرے ذہن کے ایک گوشے میں درندے کے غرانے اور نسوانی چیخوں کا معا بھی تھا۔ ابھی تک یہ معا بھی حل نہیں ہو سکا تھا۔ پہلی بار بھی مجھے قید کے دوران میں ایسی ہی آوازیں سنائی دی تھیں۔ جب میں دوبارہ حویلی میں داخل ہوئی تو اس مرتبہ صرف ایک پولیس والے کو پھاٹک پر چھوڑا کیوں کہ وہاں بہت سے مقامی باشندے بھی تھے۔ ان سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ خورشید الاسلام کو یا کسی غیر ملکی کو حویلی سے نکل کر فرار نہ ہونے دیں۔ حویلی کی تلاشی بے سودی ثابت ہوگی اس کا اندازہ مجھے پہلے ہی تھا، مگر اتمام حجت کے طور پر میں اسے مرحلے سے گزر جانا چاہتی ہوں۔

حویلی کی مرکزی عمارت میں مجھے دو ملازمین بے ہوشی کی حالت میں ملے۔ ان میں سے ایک ملازمہ تھی۔ ان دونوں کے سوا حویلی کے اس حصے میں اور کوئی نہیں تھا۔ غالباً ان دونوں کو سوتے ہی میں بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ یہیں ایک کمرے میں مجھے فرش پر غیر ملکی سگریٹ کا خالی پکٹ پڑا ہوا نظر آیا۔ اس کمرے کی تلاشی لینے پر کچھ اور ایسا سامان بھی ملا جس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ شاید یہ کمرہ امریکی ایجنٹ سولومن کے استعمال میں رہا ہوگا۔ حویلی کے اس حصے سے باہر آ کر میری توجہ ایک بار پر اسی طرف مبذول ہو گئی جدھر سے نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔ جس حصے میں مجھے قید کیا گیا تھا اسی کے برابر کچھ فاصلے پر ایک دروازہ اور بھی نظر آ رہا تھا جو مقفل تھا۔ پہلے اس طرف میری توجہ نہیں گئی تھی۔ میں نے فائر کر کے تالا توڑ دیا اور اندر تاراج کی روشنی کی۔ دروازے کے بعد چھوٹی سی پٹی ہوئی راہداری تھی۔ یہ حصہ بھی دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک کمرے کا فرش چوکور پتھروں کا بنا ہوا تھا اور پتھروں کے درمیان واضح طور پر جھریاں نظر آ رہی تھیں۔ تاراج کی روشنی میں ان پتھروں کا جائزہ لیتی ہوئی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ فرش

پھر میں نے یکے بعد دیگرے چھ فائر دروازے پر کئے۔ میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ لکڑی کے دروازے میں لکیر کے ساتھ چھ سوراخ ہو گئے تھے۔ دروازہ زیادہ مولی لکڑی کا بنا ہوا نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ فائرنگ کی آواز خورشید الاسلام کو چوکنا کر دے گی، مگر یہ خطرہ تو بہر حال مول لینا ہی تھا۔

”انسپکٹر! اب تم دروازے پر فائر کرو! تاراج مجھے دے دو!..... یہ خیال رکھنا کہ گولی لکیر ہی پر لگنا چاہئے۔“ میں نے اسے ہدایت کی اور پھر اس کے ہاتھ سے تاراج لے لی۔

پھر انسپکٹر نے یکے بعد دیگرے اس کے دونوں ہاتھوں نے بھی دروازے پر فائرنگ کی۔ فائرنگ کی آواز سے وہ پورا علاقہ گونج اٹھا تھا، مگر حویلی کے کینوں کے کانوں پر ابھی تک جوں نہیں رہی تھی۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ باہر موجود پولیس والوں نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس سے میں کچھ فکر مند بھی ہو گئی تھی۔

بالآخر کچھ ہی دیر کے بعد میری تدبیر کارگر ثابت ہوئی دروازے کا وہ حصہ چند ہی دھکوں میں دوسری جانب جا کر انیسے گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ سب سے پہلے میں اس چوہے دان سے باہر نکلی اور پھر بقیہ افراد بھی باہر آ گئے۔ حویلی پر سکوت چھایا ہوا تھا، مگر پھاٹک کی جانب سے مدھم مدھم سی آواز یہ سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ بہت سے لوگ آہستہ آوازوں میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے پہلے ادھر ہی کا رخ کیا۔ جن چار پولیس والوں کو میں باہر چھوڑ کر آئی تھی۔ ان کی فکر تھی۔ اب تک ہم سب کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

پھاٹک سے نکلتے ہی مجھے لوگوں کا ایک جھوم نظر آیا۔ ان میں سے اکثر کے ہاتھوں میں لائینیں تھیں وہ مقامی لوگ تھے اور فائرنگ کی آواز سن کر حقیقت حال جاننے کے لئے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ان سے استفسار کئے بغیر ہی میں ان کی وہاں موجودگی کا سبب سمجھ گئی۔ انہیں لوگوں کے درمیان چپ ہی کے قریب مجھے وہ دو پولیس والے بے ہوش پڑے ہوئے نظر آئے جنہیں میں وہاں چھوڑ گئی تھی۔ چوکیدار غائب تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ جب وہ وہاں پہنچے تھے تو ان دونوں کو اسی طرح زمین پر بے ہوش پڑا ہوا دیکھا تھا۔

”انسپکٹر! تم حویلی کے عقب میں جا کر ان دونوں کو دیکھو جنہیں اس طرف بھیجا گیا۔“ میں نے انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ”جہاں تک میرا خیال ہے وہ دونوں بھی بے ہوش ہی ملیں گے۔ اپنے ساتھیوں کو بھی لیتے جاؤ۔ اگر واقعی وہ بے ہوش ہوں تو انہیں یہاں اٹھالانا۔“

میرا حکم سن کر انسپکٹر اپنے ساتھیوں سمیت حویلی کی عقبی سمت چلا گیا تھا۔ دو ایک مقامی باشندوں کو بھی اس نے اپنی مدد کے لئے ساتھ لے لیا تھا۔

پھر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ دونوں بھی بے ہوشی کی حالت میں ملے۔ میرے کہنے پر قریب ہی رہنے والا ایک شخص لوٹنے میں پانی بھر لایا اور پھر بے ہوش پولیس والوں کو ہوش میں لانے کے لئے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے جانے لگے۔ ان میں سے ایک کو فوراً ہوش آ گیا۔ بقیہ تین کو ہوش میں لانے کے لئے انسپکٹر کوشش میں لگا ہوا تھا۔ جو پولیس والا ہوش میں آیا تھا اس کی ڈیوٹی

بلکی خراشیں نظر آرہی تھیں۔ یہ خراشیں گولائی کی صورت میں تھیں۔
 ”کون ہو تم؟“ میں نے قریب جا کر اسے نرم آواز میں مخاطب کیا۔
 ”کہیں..... کہیں میں کوئی خواب..... خواب تو نہیں دیکھ رہی!“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں
 بڑبڑائی۔

”نہیں! یہ کوئی خواب نہیں حقیقت ہے۔ تم ضیاء الاسلام کی بیٹی ہو اور تمہارا نام شکیلہ ہے۔ بولو
 یہی نام ہے نا تمہارا؟“ میں نے یہ دستور نرم لہجہ برقرار رکھا۔
 ”آپ..... آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟ ہاں میں..... میں شکیلہ ہی ہوں۔“ یہ کہتے ہی وہ اٹھنے
 لگی اور اٹھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے جسم پر جھوٹی دھجیوں کو سنبھالنے لگی جو یقیناً اس کی ستر پوشی کے
 لئے کافی نہیں تھیں۔

”انسپکٹر! تم اور جاؤ اور کہیں سے ایک چادر لے آؤ!“
 میرا حکم سن کر انسپکٹر جانے کے لئے پلٹ گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تہ خانے کا وہ کمرہ اس
 کمرے کے نیچے ہی تھا جہاں میں نے ایک شب گزاری تھی۔ اب ان نسون چپڑوں کا معما کچھ کچھ حل ہوتا
 جا رہا تھا۔ وہ نسوانی چٹخیں شکیلہ ہی کی ہو سکتی تھیں، مگر درندے کی غراہٹ اب تک میرے لئے معما ہی تھی۔
 میں بھی پیال پر شکیلہ کے قریب ہی بیٹھ گئی اور پھر شفقت و محبت آمیز لہجے میں اس کے سر پر
 ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”اب تمہاری قید کے دن پورے ہو چکے ہیں شکیلہ! تمہیں جلد ہی اس قید سے
 رہائی ملے والی ہے۔“

میرے محبت آمیز سلوک پر وہ رونے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس بے گناہ اور بھولی بھالی
 لڑکی کو گلے سے لگالیا۔

”ہچکیاں لیتے ہوئے اس نے بڑی رقت آمیز آواز میں کہا۔“ اب..... اب میں رہا بھی ہو
 جاؤں تو کیا..... اس وحشی اور اس درندے نے مجھے کسی قابل نہیں چھوڑا۔“
 اس میں تمہارا کوئی تصور نہیں شکیلہ! تم بے بس اور مجبور تھیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

پھر میرے استفسار پر شکیلہ مختصر ا مجھے اپنی دکھ بھری داستان سنانے لگی۔ اس پر درد کہانی کا
 خلاصہ یہ تھا کہ خورشید الاسلام نے اسے وہاں قید کر رکھا تھا اور گزشتہ کئی ماہ سے وہ ظالم شخص اس کی عزت و
 آبرو سے کھیل رہا تھا۔ شکیل کے بیان کے مطابق خورشید الاسلام اذیت پسند تھا اور جب اس پر اذیت
 پسندی کا دورہ پڑتا تھا وہ بالکل کسی درندے کی طرح غرائے لگتا تھا۔ وہ اس وقت کسی آدمی کی بجائے درندہ
 ہی معلوم ہوتا تھا۔ عموماً وہ شکیلہ کو زد و کوب کر کے اور اس پر کوڑے برسا کر ہی اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا
 تھا۔ وہ ایک جنسی جنونی تھا جس کے جذبات کی تسکین اسی طرح ہوتی تھی۔ آج بھی اس نے شکیلہ کو تختہ
 مشق بنایا تھا۔

شکیلہ اپنی داستان کے آخری مرحلے میں تھی کہ کمرے کے باہر قدموں کی چاپ سن کر خاموش
 ہو گئی۔ یوں بھی اب اس سے پوچھنے کو کیا رہا تھا! انسپکٹر چادر لے کر آ گیا تھا۔ میں نے انسپکٹر سے وہ چادر
 لے کر شکیلہ کو دے دی کہ اپنے جسم کے گرد لپیٹ لے۔ اس نے مجھے ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے چادر

ہی پر وہیں ایک طرف مجھے لوہے کا ایک آئکڑا پڑا نظر آیا اور میرے ذہن میں معا ایک خیال برقی لہر کی
 طرح دوڑ گیا۔ اس آئکڑے کی وہاں موجودگی میرے خیال میں بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔
 ”ہاں یہ ممکن تو ہے!“ میں آپ ہی آپ بڑبڑائی۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انسپکٹر نے مجھ سے پوچھا۔
 ”نہیں۔“ میں چونک کر بولی اور پھر فرش سے اس لوہے کے آئکڑے کو اٹھالیا۔
 ذرا ہی دیر بعد میں لوہے کے اس آئکڑے کو فرش کے پتھروں پر مار مار کر دیکھ رہی تھی اور غور
 سے وہ آواز سن رہی تھی جو آئکڑے کے فرش سے ٹکڑانے پر سنائی دے رہی تھی۔ آخر کار میری محنت رنگ
 لائی۔ بانیں دیوار کے قریب ایک چوکور پتھر پر جب لوہے کا آئکڑا پڑا تو واضح طور پر ایسی آواز آئی جیسے
 پتھر کے نیچے خلا ہو۔ میں نے فرش پر بیٹھ کر پتھر کی چاروں طرف موجود جھریوں کا جائزہ لیا اور پھر اسی
 آئکڑے کو پتھر کی جھریوں میں پھنسا کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے یہ دیکھ کر انتہائی خوشی اور
 سنسنی سی محسوس ہوئی کہ وہ پتھر اپنی جگہ سے اٹھنا چلا گیا۔

”ارے یہ..... یہ تو کوئی تہ خانہ لگتا ہے!“ انسپکٹر بول اٹھا۔“ نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بھی
 نظر آرہی ہیں۔“ انسپکٹر کے لہجے میں ایسی حیرت تھی جیسے اس نے دنیا کا آئکڑا اٹھواں عجوبہ دیکھ لیا ہو۔
 میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور پھر اس تہ خانے میں داخل ہونے کے لئے پہلی سیڑھی پر
 قدم رکھ دیا۔

”انسپکٹر! صرف تم میرے ساتھ آؤ!..... بقیہ افراد اوپر ہی رکھیں!“ میں نے یہ کہتے ہوئے
 دوسری سیڑھی پر پاؤں رکھا۔

تہ خانے میں اترنے کے لئے اس زینے میں صرف اتنی ہی گنجائش تھی کہ ایک وقت میں صرف
 ایک آدمی نیچے اتر سکتا تھا۔ میں چند سیڑھیاں اتر گئی تو انسپکٹر بھی میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ ان سیڑھیوں
 سے اترتے ہی مجھے بائیں جانب ہلکی سی روشنی نظر آئی اور اس کے ساتھ ایک دروازہ بھی دکھائی دیا جو کھلا
 ہوا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کے نیچے رک کر انسپکٹر کے نیچے اترنے کا انتظار کیا۔ وہ نیچے آ گیا تو اسے ساتھ
 لئے میں آگے بڑھی۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر وہ کھلا ہوا دروازہ تھا جس سے ہلکی سی روشنی باہر آرہی تھی۔
 اچانک ایک تیز نسوانی آواز سنائی دی۔ ”تم پھر آگے وحشی ظالم درندے!..... پھر آگے مجھے
 نوچے مہنجوڑنے کے لئے!“

اس کمرے میں موجود عورت ہمارے قدموں کی چاپ سن کر لازماً کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی
 تھی۔

میں نے جب اس کمرے میں قدم رکھا تو وہاں ایک نوجوان و حسین لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ
 گئی۔ اس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑے جھول رہے تھے۔ وہ کمرے کے فرش پر پچھی ہوئی پیال پر کسی
 ڈھیر کے مانند بکھری پڑی تھی۔ وہیں ایک جانب چڑے کا ہنر پڑا ہوا تھا۔ وہ لکڑی چھٹی چھٹی آنکھوں سے
 اس طرح مجھے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اس کی عمر اٹھارہ بیس سال سے زیادہ معلوم نہیں
 ہوتی تھی۔ اس کے سر کے بڑے بڑے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کے خوبصورت رخساروں پر کئی جگہ ہلکی

”شکیلہ! سنو فی الحال میں تمہیں اس حویلی میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ میں یہاں سے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”مگر کہاں؟“ اس نے سوال کیا۔ ”کیا میرے ابو یہاں حویلی میں نہیں ہیں؟“

”میں تمہیں وہیں لے جاؤں گی شکیلہ جہاں تمہارے ابو ہیں۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔

”ٹھیک ہے مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتے پراضی ہوں مگر میرے ابو حویلی میں کیوں نہیں ہیں؟..... اور وہ..... وہ ظالم..... وہ درندہ کہاں ہے؟“ اس کا اشارہ خورشید الاسلام کی طرف تھا۔ ”کیا وہ..... وہ فرار ہو گیا؟“

”ہاں شکیلہ وہ ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکا، لیکن تم مطمئن رہو جلد ہی وہ پکڑا جائے گا۔ اسی درندے کی وجہ سے یہاں تمہارے ابو کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی اس لئے ہم نے پہلے ہی انہیں یہاں سے نکال کر ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے اس خبیث نے تم پر جو ظلم کیا ہے اس کا بدلہ اسے ضرور ملے گا۔ چلو آؤ میوے ساتھ!..... اور سنو شکیلہ میں تم سے ایک درخواست اور کروں گی۔ تم ابھی اپنے ابو کو اس ظالم کی داستان نہ سنا، بس اتنا ہی بتا دینا کہ اس نے تمہیں قید کر رکھا تھا۔“ میں نے شکیلہ کو سمجھایا۔

”مجھ میں اتنی..... اتنی ہمت ہی کب ہے کہ ابو سے اس سلسلے میں کچھ کہہ سکوں۔“ شکیلہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”میں کس زبان سے انہیں اپنے لئے کی داستان سنا سکتی ہوں۔“

اس وقت مجھے یاد آیا ضیاء الاسلام نے بتایا کہ خورشید الاسلام نے اسے فون پر شکیلہ کی آواز سنوائی تھی۔ میں نے اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے شکیلہ سے پوچھا۔ ”کیا اس نے شروع ہی سے تمہیں یہیں رکھا تھا؟ یا تم ڈھاکہ میں بھی کہیں رہی تھیں؟“

”وہ مجھے اپنے ساتھ ڈھاکہ گھمانے کے بہانے حویلی سے باہر لے گیا تھا اور پھر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوش آنے پر میں نے خود کو اسی تہ خانے میں پایا تھا۔ وہ مجھے ڈھاکہ نہیں لے گیا۔ ابتدا ہی سے میں یہیں تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

کچھ سوچ کر کمرے کے دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے ایک اور سوال کیا۔ ”شکیلہ! یاد کرو؟ اس نے کبھی تمہارے ابو کے لئے تمہارا کوئی پیغام ریکارڈ کیا تھا کہ تم یہ خیریت ہو؟“

”جی ہاں۔“ وہاں جوابا بولی۔ ”میں اس پر آمادہ نہیں ہوئی تھی تو اس نے مجھے بہت مارا تھا اور پھر مجبوراً مجھے وہی سب کچھ کہنا پڑا تھا جو وہ چاہتا تھا، مگر آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔“

”مجھے تمہارے ابو نے یہ بات بتائی تھی کہ فون پر تم نے انہیں اپنی خیریت دی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے میں آگے ہو گئی اور انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ”تم شکیلہ کے پیچھے چلو گے۔“

پھر آگے آگے میں میرے بعد شکیلہ اور انسپکٹر ہم تینوں تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ وہاں موجود پولیس والوں نے شکیلہ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا مگر مجھ سے کوئی سوال کرنے یا کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکے۔

”میرا خیال ہے شکیلہ کو یہاں اس حویلی کے مرکزی حصے میں تمہارا بھی کوئی کمرہ ہوگا۔ میں

چاہتی ہوں کہ وہاں جا کر تم اپنا حلیہ درست کر لو اور لباس بھی بدل لو اس کے علاوہ کسی اچھی وغیرہ میں اپنا ایک آدھ جوڑا بھی رکھ لو۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”میں اس حالت میں تمہیں اپنے ساتھ ڈھاکہ لے جانا نہیں چاہتی۔“

”تو کیا میرے ابو ڈھاکہ میں ہیں؟“ اس نے فوراً سوال کیا۔

”ہاں وہیں ہیں۔“ میں نے بتا دیا۔

پھر وہ میرے ساتھ حویلی کے مرکزی حصے میں آگئی کسی اور شخص کو میں نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ ان سب سے میں نے باہر ہی انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ شکیلہ میری رہنمائی کرتی ہوئی مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ کمرے کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ شکیلہ کی غیر موجودگی میں بھی پابندی کے ساتھ اس کمرے کی صفائی کی جاتی رہی ہے۔ شکیلہ نے ہاتھ منہ دھوئے بال سنوارنے اور پھر لباس تبدیل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ لکڑی کی بنی ہوئی ایک الماری سے اس نے ایک ایئر بیگ نکالتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”آپ کہیں تو اس میں اپنے دو ایک جوڑے اور کچھ ضروری سامان رکھ لوں اچھی مل نہیں رہی اس وقت!“

”رکھ لو اسی میں۔“ میں نے اسے اجازت دے دی۔

وہ میرا جواب پا کر اسی ایئر بیگ میں اپنے کپڑے اور دیگر ضروری سامان رکھنے لگی۔ شکیلہ نے تیار ہونے میں خاصی عجلت کا ثبوت دیا تھا، پھر بھی تقریباً نصف گھنٹہ وہاں لگ ہی گیا۔

جب میں شکیلہ کے ساتھ حویلی کی مرکزی عمارت سے باہر آئی تو وہاں بہ دستور سناٹا تھا۔ خورشید الاسلام حویلی سے فرار ہوتے وقت ان ملازمین کو بھی اپنے ساتھ لے گیا جن کی حیثیت اب اس کے گروگوں کی تھی۔

مارائن سٹج سے واپسی میں شکیلہ کو میں نے اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھایا اور انسپکٹر سے پیچھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ بقیہ پولیس والے جب میں سوار ہو گئے تھے۔ روانگی سے قبل میں نے وہاں کے مقامی باشندوں سے کہہ دیا تھا کہ جلد ہی حویلی کا مالک واپس آ جائے گا اس وقت تک وہ لوگ حویلی کی دیکھ بھال اور نگرانی کریں۔ شکیلہ کو دیکھ کر بھی ان لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ جب ہم ڈھاکہ کی حدود میں داخل ہوئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہمارا قافلہ صدر گھاٹ میں سی آئی ڈی آفس پہنچ گیا۔ کار سے اترتے ہوئے میں نے انسپکٹر کو شکیلہ کے بارے میں ہدایت دی۔ ”اس لڑکی کی حیثیت یہاں مہمانوں ایسی ہے اس کے آرام اور حفاظت کا پورا خیال رکھا جائے۔ اس کے متعلق مزید احکام تمہیں کل مل جائیں گے۔“

جواباً انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر بولا۔ ”آپ اطمینان رکھیں ایسا ہی ہوگا۔“

”تو..... تو کیا آپ چلی جائیں گی اور میں یہاں.....“

”گھبراؤ مت شکیلہ!“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تم بہ حفاظت رہو گی۔ میں کل دوپہر تک تم سے آکر ملوں گی۔“ پھر میں اسے ساتھ لے آگے بڑھی۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟ اور..... اور میرے ابو کہاں ہیں؟ آپ نے تو مجھ سے کہا تھا کہ یہاں ابو

دیکھو! ”سیودمکرجی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ہلکی سی آواز ہوئی اور پھر میرے دائیں کان کے قریب سے سنسناتی ہوئی گولی گزر کر سامنے والی دیوار پر لگی۔ اس کے فوراً بعد وہ پھر بولا۔ ”اب آیا تمہیں یقین کہ ایک اور فائر کروں!“

اس نے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کر دیا تھا۔ میں واقعی اس کے نشانے پر تھی اور یہ بھی سچ تھا کہ اس کے ریوالور کی ٹال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ بے جاذب میرے لئے اب خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے یہی سوچ کر میں نے ریوالور پھینک دیا۔

”تم نے اب کی نہ سمجھ داری کی بات! سیودمکرجی کی آواز سنائی دی۔ اسی لمحے میں نے اچانک مڑ کر دیکھا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پستہ قد سیاہ پوش کھڑا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو مسلح افراد بھی موجود تھے۔ سیودمکرجی نے غلط نہیں کہا تھا ان بھی کے ہاتھوں میں مجھے ریوالور نظر آ رہے تھے جن کی ٹالوں پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔

”عذرا خان! تمہیں حیرت تو ہوئی ہوگی مجھے یہاں دیکھ کر!“ وہ بولا۔

”ہاں یقیناً میں نے خود پر قابو پا رہے ہوئے جواب دیا پھر کہا۔ ”حیرت کا ایک سبب تو یہ ہے کہ تمہیں میرے ٹھکانے کا علم کیسے ہوا؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے خود یہاں آنے کی زحمت کیسے کر لی؟ ایسے کام تو تم عموماً اپنے کارندوں یا کرائے کے غنڈوں سے لیا کرتے ہو!“

”تمہارے پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ جب مجھے تمہارے ہاتھوں اکبر کے بھیجے ہوئے دو کرائے کے غنڈوں کی زبردستی پٹائی کا علم ہوا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ تمہی ہو سکتی ہو! تمہارے سوا کوئی اور عورت اتنی نڈر اور بہادر نہیں ہو سکتی جو ان غنڈوں کی پٹائی کر کے انہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دے۔

اس بات کا علم مجھے آج ہی شام ہوا تھا۔ اس طرح مجھے معلوم ہو گیا کہ ہم کہاں چھپی ہوئی ہو! تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں یقینی طور پر تمہیں قابو میں کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس لئے خود چلا آیا۔ پھر بار سے بھی مجھے اپنا حساب چکانا تھا۔ اس نے مجھے بہت تنگ کر رکھا تھا۔“ سیودمکرجی نے تفصیل کے ساتھ میرے دونوں سوالوں کا جواب دے دیا۔

بابر کا ذکر سن کر میں بے چین ہو گئی۔ مجھے علم تھا کہ سیودمکرجی اس کے لئے کیا حکم دے چکا تھا!

میں نے اسی لئے مضطرب آواز میں اس سے پوچھا۔ ”بابر کہاں ہے؟“

”اسے میں تم سے پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں۔ اس کے ساتھی نے ذرا غیر ضروری بہادری کا ثبوت دینا چاہا تھا“ نتیجتاً اس کی لاش اندر کمرے میں پڑی ہوئی ہے وہ اس طرح اطمینان سے بولا جیسے کسی کو قتل کر دینا کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔

فرید احمد کے قتل کی اطلاع پا کر میرے ذہن کو دھچکا سا لگا اور اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ آج ہی رات تو وہ میرے ساتھ تھا۔ اس نے اور بابر نے میرے ساتھ موتی جمیل کے پرانی ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہے! اگلے دن کا سورج وہ نہیں دیکھ سکے گا۔ موت بھی کتنی بے رحم ہوتی ہے۔

سیودمکرجی نے شاید میرے چہرے سے میری دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا اور بولا۔ ”تمہیں شاید

بھی ہوں گے!..... میں اپنے ابو..... ابو سے ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کے لہجے سے کسی انجانے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”آپ..... آپ بھی رک جائیے نا یہاں۔“

”نہیں شکلیہ! مجھے جانے دو!“ یہ کہہ کر میں نے اسے مختصراً بتا دیا کہ وہ کہاں ہے اور یہ بھی کہ اس کے ابو بھی قانون کی حفاظت میں ہیں۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ”اس وقت تمہارے ابو سو رہے ہوں گے۔ کل جب میں آؤں گی تو ان سے تمہیں ملوا دوں گی۔“

میں نے محسوس کیا مجھ سے یہ سن کر کہ وہ پولیس کی حفاظت میں ہے اس کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا تھا۔ وہ میری طرف متوقع نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کل آپ ضرور آئیں گی نا؟“

”ہاں ضرور!“ میں نے اسے یقین دلایا اور پھر اسے انپکٹر کے حوالے کرنے کے بعد اپنی کار کی طرف پلٹ آئی۔

کار میں بیٹھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ اس بے گناہ لڑکی کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ مجھے خورشید الاسلام پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس وقت اگر وہ میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی چوڑی ادھیڑ دیتی۔ مجھے ایسے ظالم مردوں سے شدید نفرت ہے جو عورتوں کو صنف نازک سمجھ کر ان پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

صدر گھاٹ سے بادام پٹی گھاٹ پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ گلی میں ایک طرف کار پارک کر کے میں نیچے اتری اور کار کا دروازہ مقفل کر دیا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر میرا ماتھا ٹھنک۔ دروازہ چوٹ کھلا ہوا تھا۔ رات کے تقریباً تین بجے اس طرح گھر کا دروازہ کھلا ہونا کسی خطرے ہی کی علامت تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے دروازے سے اندر نظر ڈالی۔ صحن کی لائٹ بجھی ہوئی تھی مگر اندر ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ کمرہ بابر کے دوست فرید احمد کا تھا۔ میں نے کسی خطرے کی بوسو گھنٹے ہی پرس سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر میں نے محتاط انداز میں دروازے کے اندر قدم رکھا۔

صحن میں پہنچ کر میں فرید احمد کے کمرے کا رخ کر رہی تھی کہ اچانک عقب سے مجھے کافی عرصے کے بعد ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی اور میں تقریباً اچھل پڑی۔

”تم نے وہاں ہی میں بہت دیر کر دی عذرا خان!..... بہت دیر انتظار کرایا مجھے!..... خیر اب اپنے ہاتھ سے ریوالور پھینک دو! تمہاری جانب یہ یک وقت کئی ریوالوروں کی ٹالیں اٹھی ہوئی ہیں!“ یہ آواز یقیناً میرے اسی دشمن جاں سیودمکرجی کی تھی جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ وہ میرا سراغ لگاتا ہوا کس طرح وہاں تک آ گیا تھا! پھر یہ کہ اس بار مجھے زیر دام لانے کے لئے اسے خود کیوں حرکت میں آنا پڑا تھا! میرے دل میں یہ اشتیاق بھی پیدا ہو گیا کہ اب تک میں جس شخص کی صرف آواز سنتی آئی ہوں اسے دیکھ بھی لوں گی۔ مجھے اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لبادے میں چھپا ہوگا اور اس کے چہرے پر بھی سیاہ نقاب ہوگی۔

”عذرا خان! تم نے اب تک اپنا ریوالور نہیں پھینکا“ ریوالور پھینک دو!..... تم گھر چکی ہو۔ تمہاری اطلاع کے لئے میں یہ بتا دوں کہ میرے اور میرے آدمیوں کے ریوالوروں کی ٹالوں پر سائلنسر چڑھے ہوئے ہیں اس لئے ہمیں فائر کرنے میں کوئی قحاحت یا جھجک محسوس نہیں ہوگی۔ بہ طور ثبوت یہ

اس نوجوان کے قتل پر دکھ ہوا ہے عذرا خان۔“

”ہاں مجھے بہت دکھ ہوا ہے اس لئے کہ میرے سینے میں تمہاری طرح دل کی جگہ پتھر نہیں ہے۔ تم بہت سفاک اور ظالم شخص ہو سیدو مگر جی!“ میں نے نفرت، غصے اور حقارت سے کہا۔

”غلط خیال ہے تمہارا میرے بارے میں!“ میں اس وقت کسی کے خلاف کوئی انتہائی قدم اٹھاتا ہوں جب کوئی مجھے اس پر مجبور کرتا ہے۔“

”جکتے ہو تم!“ میں غصے کی وجہ سے تقریباً چیخ اٹھی۔ ”مگر تمہارا کہنا درست ہے تو میرے سلسلے میں تمہیں کس نے مجبور کیا ہے؟ بولو!“

”تمہارے خلاف کب میں نے کوئی انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ عذرا خان!..... رہا مجبور کرنے کا معاملہ..... وہ آہستہ سے ہنسنا۔ تو میرے دل نے مجھے مجبور کر رکھا ہے۔“

اس کی ڈھٹائی پر میرا دل چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ لوں مگر وہ دسترس سے دور بھی تھا اور محفوظ بھی! میں بس غصے میں بیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

”میرا خیال ہے عذرا خان کہ تم نے خاصی باتیں کر لی ہیں اب چلنا چاہئے!..... تم تو چل ہی رہی ہو میرے ساتھ! بقیہ باتیں پھر ہونی رہیں گی۔“ سیدو مگر جی بولا۔ پھر اس نے اپنے دو گرگوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

ان دونوں نے اپنے اپنے ریوالور جیبوں میں رکھ لئے اور میری طرف بڑھنے لگے۔

اسی وقت سیدو مگر جی نے مجھے تاکید کی۔ ”عذرا خان! کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرنا ورنہ یقین کرو میں گولی چلانے سے دریغ نہیں کروں گا، اور تمہیں یہ بتا دوں کہ مجھے لنگڑی لولی عورتیں بالکل پسند نہیں آتیں۔“

جواب میں نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ دونوں کس ارادے سے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میری طرف بڑھتے ہوئے ان دونوں ہی نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ سیدو مگر جی اور میرے درمیان نہ آجائیں۔ وہ دائیں اور بائیں جانب سے میری جانب بہت محتاط انداز میں بڑھ رہے تھے۔ میرے لئے یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ سیدو مگر جی کی دھمکی ایک طرف مگر یہ حقیقت تھی کہ میرا کوئی بھی غیر ذمہ دارانہ اقدام خود میرے حق میں انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

پھر وہ دونوں چند ہی لمحے بعد دائیں اور بائیں سے آگے بڑھتے ہوئے میرے پیچھے آ کر رک گئے۔ اب بھی میں ان کا مقصد نہیں سمجھ سکی تھی۔ معاً انہی میں سے کسی نے میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے انہیں اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ اس کے نتیجے میں میرا پرس زمین پر گر گیا۔ اگر میری طرف بہ یک وقت کئی ریوالوروں کی نالیں نہ اٹھی ہوتیں تو یہ جرات اس شخص کو بہت مہنگی پڑتی جس نے میرے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیا تھا۔ اچانک مجھے ایک ناگوار سی بو محسوس ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک مضبوط ہاتھ میرے منہ اور ناک پر آ کے جم سا گیا۔

کلوروفارم! میں نے سوچا، مگر اب کچھ سوچنا فضول ہی تھا۔ میں زیادہ دیر کلوروفارم سے بچنے کے لئے سانس نہ روک سکی اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش آنے پر میرا ذہن کچھ دیر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم رہا، پھر رفتہ رفتہ مجھے یاد آتا گیا کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں! آنکھیں کھولنے کے بعد میری پہلی نظر جس چہرے پر پڑی اسے دیکھ کر میرے ذہن کو شدید جھک کا محسوس ہوا۔ میں جس بستر پر دراز تھی اس کے قریب ہی ایک کرسی پر بھارتی ایجنٹ ساوتری بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر میک اپ نہیں تھا۔

”تمہیں ہوش آ گیا عذرا خان!“ وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے گھور کر دیکھنے لگی۔

”میں تمہارے ہوش میں آنے ہی کا انتظار کر رہی تھی عذرا خان! تم سے ایک طویل عرصے کے بعد مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یاد ہے تمہیں ہماری آخری ملاقات ترکی میں ہوئی تھی!“ وہ بہ دستور مسکراتے ہوئے بولتی رہی۔ ”غالباً ترکی کے شہر استنبول میں!“

”ہاں اچھی طرح یاد ہے ساوتری! میں اس ملاقات کو بھولی نہیں ہوں!“ میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ”میری یادداشت میں یہ بھی محفوظ ہے ساوتری کہ میری ہی وجہ سے تمہیں راہ فرار اختیار کرنا پڑی تھی۔“

”ہاں عذرا خان! میں بھی اس بات کو نہیں بھولی۔“ اس نے کہا۔ ”بھگوان نے مجھے اگلے پچھلے سارے حساب چکانے کا یہ اچھا موقع دیا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے یہاں مشرقی پاکستان میں بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں تو یہی سمجھی تھی کہ کبھی مغربی پاکستان جانا ہوا تو تم سے مڈبھیر کا امکان ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں تمہیں نہیں پہچان سکی ورنہ مار نہ کھا جاتی تم سے!“

”بس مجھ سے ذرا سی غلطی ہو گئی ورنہ اس وقت تم میرے سامنے بیٹھی باتیں نہ بنا رہی ہوتیں!..... ہاں یہ بتاؤ سیدو مگر جی نے تمہیں دوسرے نقشے وغیرہ فراہم کر دیئے یا نہیں؟“ میں نے طنز پر لہجے میں سوال کیا۔ پھر مزید بولی۔ ”ویسے اس ہوا میں نہ رہنا ساوتری کہ تم یہ نقشے لے کر میرے ملک کی سرحد عبور کر سکو گی۔“

میری بات سن کر وہ زور سے ہنس دی، پھر بولی۔ کون روک سکے گا مجھے!..... جہاں سیدو مگر جی ایسے ہمارے دوست موجود ہیں وہاں ہمارے لئے کوئی رکاوٹ، کوئی خطرہ نہیں!“

”تو کیا تم مجھے بھی سب کچھ بتانے کے لئے میرے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھیں؟“ میں چیختے ہوئے لہجے میں بولی۔

”نہیں عذرا خان! میرے اس انتظار کی وجہ کچھ اور تھی۔ دراصل میں تم سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتی ہوں۔ وہاں ہوٹل میں مجھے علم نہیں تھا کہ میرے مقابلے پر کون ہے اسی لئے دھوکے میں مار کھائی لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں یقیناً تمہیں زمین چاٹنے پر مجبور کر دوں گی۔ تم پہلی عورت ہو جس کے ہاتھوں مجھے شکست ہوئی ہے اور میں اپنے ماتھے سے شکست کا یہ داغ دھونا چاہتی ہوں۔“

”ساوتری! تم اپنے دل میں یہ حسرت ہی لئے اس دنیا سے جہنم کی طرف سفر کر جاؤ گی۔ بہتر ہے کہ تم ابھی اپنی موت کو دعوت نہ دو! ابھی تم نے اس دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے! ابھی تو میرے خیال میں تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی!“ میرا انداز مذاق اڑانے اور غصہ دلانے والا تھا۔

”شادی تو میری اطلاع کے مطابق تم نے بھی ابھی نہیں کی۔ عذرا خان! تم اگر میرے ہاتھوں ماری گئیں تو تمہیں بھی کوئی رونے والا نہیں ہوگا۔“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں نے بڑی مشکل سے سیوڈمکرجی کو اس پر راضی کیا ہے کہ تم سے دو دو ہاتھ کر سکوں۔ مجھے افسوس ہے اس نے محض اتنی اجازت دی ہے۔ مجھے کہ میں تمہارے ہاتھ پیر توڑ سکوں۔ وہ شاید تمہیں کسی کے ہاتھوں فروخت کر کے لمبی رقم کماتا چاہتا ہے اور میں اس کا نقصان نہیں چاہتی۔“

”مگر یہ سوچ لو ساوتری کہ تمہارے معاملے میں مجھے کسی کے نقصان کا خوف نہیں۔ میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گی اس لئے بھارت میں اپنے کسی چاہنے والے کو آخری خط لکھنا ہو تو لکھ لو پہلے ورنہ پھر تمہیں اس کی مہلت نہیں ملے گی۔“ میں نے اس کی طرف تحارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی کچھ دیر بعد تم یہ سب ڈینگیں مارتا بھول جاؤ گی۔ عذرا خان!..... چلو اٹھو برابر والے کمرے میں سیوڈمکرجی اس کی محبوبہ شکنتلا اور اس کے دوسرے ساتھی تمہاری ذلت کا منظر دیکھنے کے لئے منتظر بیٹھے ہیں۔“ ساوتری نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے ساوتری کے اشارے پر اس طرف دیکھا۔ وہاں مجھے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں فوراً ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ کلوروفارم کے سبب ہر چند کہ اب بھی میرا ذہن کچھ بو جھل سا تھا لیکن اس کے باوجود میں اس بڑبول بھارتی ایجنٹ کا چیلنج قبول کرنے پر آمادہ تھی۔ مجھے خود پر بھروسہ تھا کہ اس سے شکست نہیں کھاؤں گی۔

ساوتری کے ساتھ ساتھ جب میں برابر والے کمرے میں پہنچی تو مجھے اس کی بات کا یقین آ گیا۔ وہاں سیوڈمکرجی شکنتلا اور دوسرے بہت سے افراد موجود تھے۔ کمرہ خاصا بڑا تھا۔ وہ سب لوگ دیواروں کے قریب کرسیاں بچھا کر بیٹھے تھے اور کمرے کا درمیانی حصہ انہوں نے خالی چھوڑ دیا تھا۔ سیوڈمکرجی حسب معمول سیاہ لباس تھا اور اس کا چہرہ بھی نقاب ہی کے پیچھے تھا۔ میرا اور ساوتری کا سنسنی خیز مقابلہ دیکھنے کے لئے وہاں موجود افراد کے چہروں سے اشتیاق کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں اور ساوتری ہم دونوں کمرے کے درمیان میں کھڑے تھے۔

”حضرات!“ اچانک سیوڈمکرجی نے بلند آواز میں وہاں موجود افراد کو مخاطب کیا۔ ”ہر مقابلے کے کچھ اصول و ضوابط ہوتے ہیں مگر ابھی جو مقابلہ آپ دیکھنے والے ہیں اس کا کوئی اصول، کوئی ضابطہ نہیں اس میں کچھ بھی فاول نہیں صرف ایک بات فاول ہے وہ یہ کہ دونوں حریفوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو قتل نہیں کرے گا باقی ہر طرح کی آزادی ہے۔“

”اگر کسی نے ان دونوں میں سے یہ فاول کر دیا تو اس پر کیا جرمانہ ہوگا؟“ شکنتلا نے سیوڈمکرجی سے سوال کیا۔

”تو اسے بھی یہ طور جرمانہ قتل کر دیا جائے گا۔“ سیوڈمکرجی کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔

”مجھے یہ شرط منظور نہیں ہے۔“ میں بول اٹھی۔ ”مقابلہ فیصلہ کن ہونا چاہئے! ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہے گا۔“

”میں عذرا خان کو اپنا خون معاف کرتی ہوں۔“ ساوتری نے بلند آواز میں کہا۔ ”عذرا خان کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ چاہے تو مجھے قتل کر دے ہاں میں سیوڈمکرجی کی شرط قبول کرتے ہوئے اسے قتل نہیں کروں گی اس کے علاوہ یہ کہ اگر اپنی جان بچاتے ہوئے نادانستگی میں میرے ہاتھوں عذرا خان ماری جائے تو میں اس کی ذمہ دار نہیں ہوں گی۔ ایسی صورت میں بطور جرمانہ میں وہ رقم سیوڈمکرجی کو ادا کر دوں گی جو اسے عذرا خان کے بدلے ایک پارٹی سے ملنے والی ہے۔“

ساوتری کی بات سن کر چند لمحے سیوڈمکرجی خاموش رہا پھر شکنتلا سے کھسر پھسر کرنے لگا۔ میں نے اس دوران میں اپنا دوپٹا گلے سے اتار کر کمرے کے گرد کس کر باندھ لیا۔

”ٹھیک ہے حضرات! مجھے منظور ہے۔“ معا سیوڈمکرجی کی بلند آواز سنائی دی۔ ”مقابلہ فیصلہ کن ہوگا۔ میری طرف سے عذرا خان اور ساوتری دونوں کو اجازت ہے کہ وہ اگر چاہیں اپنے مقابل کو قتل کر سکتی ہیں۔“

سیوڈمکرجی کے اس اعلان کے ساتھ ہی کمرے میں موت کا سناٹا چھا گیا اور میں ایک دم پینترا بدل کر ساوتری کے سامنے آ گئی۔ زندگی اور موت کا یہ مقابلہ خود میرے لئے بھی انتہائی سنسنی خیز تھا۔

☆.....☆.....☆

ہی بیٹھے ایک طرف گھٹنے لگی۔ اسے سستانے کا موقع دیئے بغیر میں نے اس کے زخمی گھٹنے کو نشانہ بنایا۔ میرے دائیں پاؤں کی بھرپور ٹھوکر نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ وہ زمین پر گر کر ترپنے لگی۔ اسی وقت میں اچھلی اور پھر پوری قوت سے اور اپنے جسم کے پورے بوجھ کے ساتھ اس کی زخمی ٹانگ پر کودی۔ ”جٹ“ کی آواز ہوئی اور میری توقع کے مطابق گھٹنے کے نیچے سے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پھر میں دوبارہ اچھلی۔ اس مرتبہ اس کی دوسری ٹانگ کو میں نے نشانہ بنایا اور دوسری ٹانگ بھی گھٹنے کے قریب ہی سے توڑ دی۔ غالباً انتہائی تکلیف کے سبب ساوتری چیخ بھی نہ سکی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہال میں موجود تمام لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔

”سیودکمر جی!“ میری آواز نے ہال پر چھائی ہوئی خاموشی کو توڑ دیا۔ ”شرائط کے مطابق مجھے یہ حق حاصل ہے کہ ساوتری کو جہنم رسید کر دوں۔ تم دیکھ ہی رہے ہو وہ بے ہوش ہو چکی ہے اور مجھے موقع ہے کہ میں اسی حالت میں اسے سفر آخرت پر روانہ کر دوں، مگر میرے خیال میں اس کے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی ہیں۔ اب یہ ایک طویل عرصے تک اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکے گی۔ بہر حال میں اپنے حق سے خود ہی دستبردار ہو کر اس کی جان بخشی کرتی ہوں۔“

”تمہاری مرضی!“ سیودکمر جی جواباً بولا۔ ”شرائط کے مطابق ہماری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم اسے چاہو تو قتل کر دو۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”دشمن کے لیے اس سے بڑی کوئی سزا نہیں کہ باختیار ہونے کے باوجود اسے ختم کرنے کی بجائے معاف کر دیا جائے۔“

”میں تسلیم کرتا ہوں عذرا خان کہ تم واقعی ایک بہادر عورت ہو۔“ سیودکمر جی نے میری تعریف کی۔

”اگر تم یہ تسلیم نہ بھی کرتے تو اس سے میرے لیے کوئی فرق نہ پڑتا۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

پھر بولی۔ ”تم اگر واقعی میری بہادری کے قائل ہو چکے ہو تو پھر مجھے یہاں سے جانے دو۔“

”تمہاری یہ خواہش میں ضرور پوری کر دیتا۔ مگر یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ وہ عیاری سے بولا۔

”اور اگر میں ساوتری کے ہاتھوں ماری جاتی پھر؟“

..... پھر کیا تم باختیار ہو جاتے؟ میرے لیے میں چیبن تھی۔

”وہ دوسری بات تھی۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ بتا دوں، مجھے یقین تھا کہ ساوتری تمہیں زیر نہیں کر پائے گی، میں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ تم سے مقابلہ کر کے اپنی موت کو دعوت نہ دے، لیکن اس نے میری بات نہیں سنی۔“ سیودکمر جی کہنے لگا۔

”تم اگر باختیار نہیں ہو میرے باب میں تو کیا امریکی ایجنٹ سولومن باختیار ہے؟“ میں نے اسے ٹولنے کی خاطر کہا کیونکہ مجھے شبہ تھا، سیودکمر جی اسی کے ایما پر میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔

میں نے اپنی بات کے رد عمل میں اسے چونکتے ہوئے محسوس کیا۔ پھر میں نے مزید کہا۔

”تمہیں یقیناً اس سے ہماری معاوضہ ملنے کی امید ہے۔“

چند لمبے ساوتری میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھورتی رہی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اس طرح میری طاقت کا اندازہ لگا رہی ہو۔ پھر اچانک اس نے اپنے منہ سے تیز اور خوفناک آواز نکالی۔ میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جوڈو کرانے کی تربیت کے دوران میں یہ سبق بھی دیا جاتا ہے کہ اپنے مخالف پر حملہ کرنے سے پہلے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے منہ سے اس طرح کی آوازیں نکالی جائیں۔ میں نے دانستہ اسے پہل کرانے کا موقع دیا تھا۔ اپنے منہ سے تیز آواز نکالتے ہی وہ مجھ پر جھپٹ پڑی تھی۔ اس نے مجھ پر کرانے کا وار کیا تھا جسے میں نے اپنی بائیں کلائی پر روک لیا تھا۔ میں اس وار سے بچ گئی تو اس نے تیزی سے زمین پر پھسل کر اپنی دائیں ٹانگ میری دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسا کر مجھے گرا دیا۔ اس نے اتنی تیزی اور مہارت کا ثبوت دیا تھا کہ کوشش کے باوجود میں سنبھل نہیں سکی تھی میرے زمین پر گرتے ہی اس نے مجھ پر چھا جانے کی کوشش شروع کر دی تھی، مگر مصلحتاً ابھی میں اس کے حملوں سے صرف بچاؤ کر رہی تھی۔ میں اسے تھکا دینا چاہتی تھی۔ مجھے زمین سے اٹھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ پھر میری طرف لپکی اور اس بار میری گردن کے قریب پھوں کو اپنے آہنی پنجے میں لینا چاہا، لیکن میں جھکائی دے کر اس کی گرفت سے بچ نکلی۔ اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنا دایاں پاؤں دائرے کی صورت میں گھمایا اور میں ایک مرتبہ پھر اس کے داؤ سے نہ بچ سکی۔ میں گر پڑی۔ وہ بلاشبہ بہترین لڑاکا ثابت ہو رہی تھی۔ میں کچھ اس طرح زمین پر گر گئی تھی کہ فوری طور پر اٹھنے میں کامیاب نہ ہوئی اور ساوتری کو موقع مل گیا۔ وہ میری پشت پر سوار ہو گئی۔ اس نے میرے جسم پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے اپنے جسم کو اچھالا اور پھر اس کے گھٹنے کی بھرپور ضرب میری کمر پر پڑی۔ اگر میں سختی سے اپنے ہونٹ نہ سمجھتی لیکن تو یقیناً میزے منہ سے چیخ نکل جاتی۔ جو لوگ اچھے لڑاکا ہوتے ہیں وہ اپنے حریف کو بے قابو کرنے کے لیے بے درپے اسی جگہ ضربیں لگاتے رہتے ہیں جہاں پہلی بھرپور ضرب پڑ چکی ہوتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ساوتری دوبارہ وہی عمل دہرائے گی۔ پھر یہی ہوا، مگر دوسری ضرب لگانے کی خواہش اسے بہت مہنگی پڑی۔ میں تیزی کے ساتھ کروٹ لے کر ایک طرف ہو گئی تھی۔ ساوتری کا گھٹنا پوری قوت سے زمین پر پڑا اور وہ چیخ اٹھی۔ درد کی شدت سے وہ زمین پر گر کر دہری ہو گئی تھی اور میں اچھلی کر کھڑی ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ساوتری اب کسی حد تک تھک چکی ہے اور زخمی بھی ہو گئی ہے۔

”ساوتری! معاً میں نے اسے مخاطب کیا۔ اب میری باری ہے۔“

وہ ابھی تک اٹھ نہیں سکی تھی۔ اس نے بڑی مظلوم سی نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر بیٹھے

”مجھے اعتراف ہے عذرا خان کہ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔“ سیودکرجی نے تسلیم کیا۔“
سولومن سے بطور پیشگی مجھے اس سلسلے میں اب تک خاصی رقم مل چکی ہے اور ابھی مزید رقم ملنے کی توقع ہے۔“

”تو کیا جیسا کہ سادری کہہ رہی تھی تم مجھے سولومن کے حوالے کر دو گے؟ میں نے پوچھا۔
”نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔ ”میرا اور اس کا معاہدہ محض یہ ہے کہ جب تک وہ یہاں
بنگال میں سرگرم عمل ہے میں تمہیں آزاد نہ رہنے دوں۔“
”یعنی مجھے اپنی قید میں رکھو تا کہ اس کے منصوبوں میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ اپنی من مانی
کر سکے۔“

”ہاں یہی سمجھ لو عذرا خان! مجھے وہ اسی کا معاوضہ ادا کریگا۔“ سیودکرجی نے جواباً میری بات
کی تصدیق میں کہا۔
”اور اگر تم مجھے یہاں قید رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو؟“

اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا عذرا خان۔“ وہ پر یقین لہجے میں بولا۔ ”ناکامی کا لفظ میری لغت
میں نہیں ہے۔“

ابھی میرا کچھ مزید کہنے کا ارادہ تھا کہ سیودکرجی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔ پھر اس نے
اپنے ساتھیوں میں سے دو افراد کو حکم دیا کہ وہ بے ہوش سادری کو وہاں سے اٹھالے جائیں۔ سیودکرجی کو
میں اب تک اس لیے باتوں میں الجھائے ہوئے تھی کہ وہاں سے فرار ہونے کے امکانات کا جائزہ لے
لوں۔ دانیس جانب مجھے ہال کا دروازہ نظر آ رہا تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دروازہ صرف بھڑا ہوا ہے یا
مقفول ہے۔ اب خود ہی سیودکرجی نے میری یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ دو افراد سادری کے بے ہوش جسم
کو اٹھائے اسی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی دوران میں مجھے باہر کا خیال بھی آیا تھا جو یقیناً اسی
عمارت میں کہیں قید تھا۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اسے رہا کرائے بغیر فرار ہو جاؤں یا اس کی رہائی
کے لیے بھی کوشش کروں۔ میں اگر تنہا سیودکرجی کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتی تو اس کے
امکانات کم ہی تھے کہ بعد میں باہر کو رہا کرایا جاسکتا۔

معلوم نہیں کیسے سیودکرجی کو یہ خیال آ گیا کہ میں فرار کے امکانات کا جائزہ لے رہی ہوں۔
میری نگاہ دروازے کی طرف تھی کہ اچانک اس نے مجھے اپنی طوف متوجہ کر لیا۔ ”سنو عذرا خان!“ اسی کے
ساتھ اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف تان لیا۔ ”تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گی۔“
”کیوں کیا تمہیں میری طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے؟“ میں نے خود کو پرسکون ظاہر
کرنے کے لیے مسکرا کر کہا۔

اسی وقت ہال کا دروازہ کھلا اور سیودکرجی کے آدی بے ہوش سادری کو اٹھائے باہر نکل گئے۔
مجھے معلوم ہو گیا کہ دروازہ مقفل نہیں ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے اور دروازے کے درمیان زیادہ
فاصلہ نہیں ہے۔ اگر میں طویل جست بھرتی تو ایک ہی دفعہ میں دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔ میرے ذہن
میں یہ بات بھی تھی کہ اس عمارت میں موجود غالباً تمام ہی افراد ان دو افراد کے علاوہ جو سادری کو لے

گئے تھے اس وقت ہال ہی میں جمع تھے۔ اگر میں اس ہال سے نکل جاتی تو مجھے مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا
پڑتا مگر سیودکرجی نے ریوالور نکال کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔
اگر میں فرار ہونے کی کوشش کروں تو کیا سیودکرجی مجھے گولی مار سکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ میرا

ذہن اس سوال کا کوئی حتمی جواب نہ دے گا۔
”عذرا خان۔“ اچانک سیودکرجی کی آواز نے میرے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ ”تم اس
کمرے میں چلی جاؤ!“ اس نے ریوالور کی نال سے بائیں جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں
ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو موجود پایا تھا۔

”اور میں انکار کر دوں تو؟“ میں نے بدستور نرم آواز میں کہا۔
”تو پھر مجبوراً بالآخر مجھے ایسا کرنا پڑے گا۔ اچھا یہی ہے کہ تم مجھے اس پر مجبور نہ کرو۔“ وہ بولا۔
”میں یقیناً اس کمرے میں چلی جاؤں گی مگر میری ایک شرط ہے۔“
”جو لوگ مجبور ہوتے ہیں عذرا خان! انہیں شرائط پیش کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ پھر بھی کہہ دو کیا

کہنا چاہتی ہو تم؟“
”بابر کہاں ہے؟“ میں نے سوال کیا، پھر جواب نے بغیر مزید بولی۔ ”میرا اندازہ ہے وہ بھی
اسی عمارت کے کسی کمرے میں ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم مجھے اور اسے ایک ہی جگہ قید کر دو؟“
”جواباً وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔“ ٹھیک ہے تمہیں بھی اسی کمرے میں پہنچا دیا جائے گا“
مگر یہ خیال رکھنا کہ کوئی بھی غیر ذمے دارانہ حرکت خود تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگی۔ تمہیں گولی مارتے
ہوئے یقیناً مجھے افسوس ہوگا اس لیے کہ تمہارے اور میرے درمیان براہ راست کوئی رخس یا دشمنی نہیں
ہے۔“

”محض تمہارا خیال ہے سیودکرجی!“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں بہر حال تمہیں
اپنا دوست نہیں سمجھتی۔“

”اگر میں تمہارا دوست نہیں تو دشمن بھی نہیں عذرا خان..... میں صرف چند روز تمہیں اپنا مہمان
بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ میں نے تم سے چھپائی نہیں بیان کر دی۔ نہ میرا ارادہ تمہیں کوئی نقصان
پہنچانے کا ہے نہ تمہیں ہمیشہ یہاں قید رکھنے کا..... میں تمہاری خواہش پوری کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے
اپنے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ”عذرا خان کو بھی بحفاظت اس کمرے میں پہنچا دو جہاں باہر کو رکھا گیا
ہے۔“

وقتی طور پر اب میں نے کسی بھی قسم کی ہنگامہ آرائی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ بابر سے ملے بغیر
اب میں کوئی بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔

سیودکرجی کے گروگوں نے اپنے مالک کا اشارہ پاتے ہی اپنی اپنی جیبوں میں سے ریوالور نکال
لیے تھے اور اب وہ دونوں محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میرے پاس
کوئی ہتھیار نہیں تھا اس کے باوجود وہ دونوں بہت چوکنا تھے۔ ان میں سے ایک میری رہنمائی کی خاطر
آگے آگے چلے لگا دوسرا میرے پیچھے تھا۔ وہ مجھے ساتھ لیے ہال کمرے سے نکل کر ایک چوڑی سی راہداری

میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ اسے رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دیا اور پھر ہوش میں لانے کے لیے کوشش کرنے لگی۔ مجھے ایک صراحی بھی کمرے میں نظر آئی اس میں پانی نہ جانے کب کارکھا ہوا تھا اور صاف بھی نہیں تھا مگر میرا مقصد اس سے پورا ہو سکتا تھا۔ ششے کے گندے گلاس میں میں نے پانی اٹیل لیا۔ اسی گلاس سے وہ صراحی ڈھکی ہوئی تھی۔ باہر کوئی نے قریب ہی زمین پر لٹا دیا تھا وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کا نچلا ہونٹ پھٹا ہوا تھا جس پر خون کی گاڑی تہ سی جم گئی تھی۔ میں اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

ظاہر ہے کہ اسے فوری طور پر ہوش نہیں آ سکتا تھا۔ میں اسی لیے پوری طرح چوکنا تھی کسی بھی لمحے وہاں کوئی آ سکتا تھا۔ میں بچتی بھی جلد باہر کو لے کر وہاں سے نکل سکتی میرے حق میں بہتر ہی تھا۔ ابھی تو مجھے فرار کا راستہ بھی تلاش کرنا تھا اور کوئی ضروری نہیں تھا کہ میں اس میں کامیاب ہو جاتی۔ سیدو کمری کے دونوں گرگے بے ہوش ہونے سے قبل چیخ نہیں سکے تھے اس لیے مجھے کسی فوری خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا ورنہ اس وقت صورتحال لازماً مختلف ہوتی۔ پھر بھی مجھے یہ خیال تھا کہ اگر وہ دونوں کچھ دیر بعد واپس نہ ہوئے یا کوئی شخص زینے کی طرف آ گیا تو میں خطرے میں گھر جاؤں گی۔

”باہر..... باہر!“ میں باہر کے منہ پر چھینٹے مارتے ہوئے اسے پکارنے لگی۔ ”ہوش میں آؤ“

اس بار میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ باہر آہستہ سے کراہا اور پھر چند ہی لمحے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بچتی بچتی آنکھوں سے اس طرح مجھے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو کہ میں ہی اس کے سامنے ہوں۔

”اٹھو باہر جلدی کرو!“ میں نے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے اٹھنے میں مدد دی اور کہا۔ ”ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔“

”آہ..... آپ یہاں..... کس طرح پہنچ گئیں؟ اس نے اٹھتے ہوئے رک رک کر بمشکل مجھ سے پوچھا۔

”باہر یہ وقت کسی قسم کی پوچھ گچھ کا نہیں۔ ہم خطرے میں ہیں کیا تم اٹھ کر کھڑے ہو سکتے ہو؟“

”کوشش..... میں کوشش کرتا ہوں۔ ظالموں نے مار مار کر سجا دیا ہے مجھے۔ وہ میرے سہارے اٹھ کر کھڑا ہونے لگا۔

”ہمت کرو باہر!..... ہاں شاباش!“ میں اس کا حوصلہ بڑھانے لگی۔ عین اسی لمحے کہیں قریب ہی سے زبردست دھماکہ سنائی دیا اور میں اچھل پڑی۔ باہر کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ ”یہ کسی فائر کی آواز معلوم نہیں ہوتی۔“ میں نے باہر کو سیدھا کھڑا کر دیا۔ تبصرہ کیا۔ ”یوں لگتا ہے جیسے ہینڈ گرنیڈ پھینکا گیا ہو۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ!“ باہر نے میرے خیال کی تائید میں کہا۔ ”یہ ہینڈ گرنیڈ ہی کا دھماکا ہے۔“

میں آگئے۔ بظاہر میں بے پروائی سے آگے بڑھ رہی تھی مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔ میں ارد گرد کا جائزہ لیتی ہوئی چل رہی تھی۔ راہداری کے تقریباً وسط میں دائیں جانب اوپری منزل تک جانے کے لیے ایک زینہ تھا۔ میرے آگے آگے چلنے والا اس زینے کی طرف مڑ گیا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے معا میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ مجھے یہ سنہری موقع ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ باہر کے متعلق مجھے اتنا تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ وہ اوپری منزل کے کسی کمرے میں قید ہے۔ اگر وہ کمرہ مفصل تھا تو اس کی چابی انہی دونوں میں سے کسی ایک کے پاس ہونی چاہئے تھی۔ پھر میں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہیں کی۔ اوپر چڑھتے چڑھتے میں دانستہ لڑکھڑائی۔ میرے پیچھے اوپر چڑھنے والا شخص یہی سمجھا ہو گا کہ غالباً سیڑھیوں سے گرتے گرتے میں نے کچھ پکڑنے کے لیے اس کی طرف رخ کیا ہے۔ وہ بے خبری میں مارا گیا۔ میرا ایک ہاتھ بچا تھا اس کی کپٹی پر پڑا اور اسی کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا ریوالتور چھین لیا۔ وہ شخص کسی قسم کی آواز نکالے بغیر لہرایا اور پھر سیڑھیوں سے نیچے کی طرف لڑھکتے لگا، مگر میں اسی دوران میں بیک وقت دو سیڑھیاں تیزی سے چڑھ کر آگے جانے والے شخص کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

ریوالتور کی نال اس شخص کی گدی سے لگاتے ہی میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اپنا ریوالتور پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دو ورنہ.....“ دھمکی آمیز انداز میں اپنا جملہ میں نے ادھورا چھوڑ دیا۔

اس شخص نے فوراً میرے حکم پر عمل کیا اور پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اس کے ساتھی کا ہو چکا تھا، مگر میں نے اسے سیڑھیوں سے نیچے نہ لڑھکتے دیا۔ اس کے جسم کو سنبھال کر میں نے سیڑھی پر لٹا دیا۔ پھر میں جلدی جلدی اس کی جھینٹیں ٹپٹپٹ لگنے لگی۔ میرا اندازہ تھا کہ اگر چابی ہوگی تو آگے چلنے والے ہی کے پاس ہوگی تاکہ وہ دروازہ کھول سکے۔ جلد ہی مجھے اس کی جیب میں کی رنگ مل گئی۔ اس میں کئی چابیاں تھیں۔ احتیاطاً اس شخص کا ریوالتور بھی میں نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ ریوالتور باہر کے کام آ سکتا تھا۔

ان دونوں کو بے ہوشی کی حالت میں وہیں چھوڑ کر میں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ زینہ دائیں جانب مڑ کر ایک آہنی گرل پر ختم ہو گیا جس میں دور ہی سے مجھے بڑا سا قفل لٹکتا نظر آ گیا۔ میں نے ایک ایک کر کے چابیاں قفل میں ڈالیں۔ ایک چابی تالے میں لگ گئی، تالا کھول کر اوپر گرل کو ذرا سا ایک طرف سرکا کر میں ایک راہداری میں آ گئی۔ بائیں جانب مجھے یکے بعد دیگرے کئی کمروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ ان تین تین کمروں کے دروازوں میں سے درمیانی کمرے کا دروازہ مجھے بند ملا۔ صرف اسی کمرے کے دروازے میں قفل پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک چابی کے ذریعے تالا کھول لیا اور اندر داخل ہو گئی۔ کمرہ روشن تھا اور وہاں باہر مجھے ایک کرسی سے بندھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی گردن ایک جانب ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ لمحہ بھر کو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں باہر کو قفل تو نہیں کر دیا گیا؟ لپک کر اس کے قریب پہنچی تو میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں ہوئی کہ اس پر سخت تشدد کیا گیا ہے۔

وہاں چھوڑ گئی تھی وہ بھی غائب تھے۔

بیڑھیوں سے نیچے اتر آنے کے بعد مجھے قدرے گرمی اور تپش کا سا احساس ہوا اور پھر ذرا ہی دیر بعد اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ کسی نے اس عمارت میں آگ لگا دی تھی۔ دائیں جانب راہداری کے آخری سرے پر مجھے شعلے نظر آ رہے تھے۔

”اس عمارت میں آگ لگا کر فرار ہونے والا سیودکرجی اور اس کے ساتھی ہی ہو سکتے ہیں باہر!“ میں نے تیزی سے کہا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا تھا جب میں پہلی مرتبہ سیودکرجی کی قید میں تھی اور شکنتلا میرے ساتھ عمارت میں آگ لگا کر ایک خفیہ راستے سے کسی دوسری عمارت میں پہنچ گئی تھی۔ یقیناً اس عمارت میں بھی کوئی خفیہ راستہ تھا اور اسی کے ذریعے سیودکرجی اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا تھا۔

باہر کو ساتھ لیے میں حتی الامکان تیزی کے ساتھ اسی سمت بڑھ رہی تھی جہر شعلے نظر آ رہے تھے۔ مجھے علم تھا کہ راہداری کی مخالف سمت میں عمارت کا اندرونی حصہ ہے۔ سیودکرجی کے آدمی مجھے اسی طرف سے لے کر آئے تھے۔ ادھر ہال کمر اور وہ کمر تھا جہاں مجھے ہوش آیا تھا۔ میں اسی لیے اس سمت نہیں گئی تھی۔

”مگر ادھر..... ادھر تو آگ ہے۔“ باہر میرے سہارے چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آپ اس طرف کیوں.....“

”مجبوری ہے باہر“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ہم اسی سمت سے نکل سکتے ہیں۔ ذرا جلدی قدم بڑھاؤ باہر! ممکن ہے کہ ہم شعلوں کے درمیان سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں“ ابھی آگ زیادہ نہ پھیلی ہو۔“

میرے کہنے پر باہر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ ابھی ہم راہداری کے اختتام تک نہیں پہنچے تھے کہ دو افراد کو میں نے شعلوں سے بچتے ہوئے اس طرف بھاگتے دیکھا۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے شعلوں کے درمیان سے گزر کر ہماری سمت آ رہے تھے۔ اس کوشش میں ان دونوں کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی۔ ”بھاگو مت! میں نے بلند آواز میں ان سے کہا۔“ زمین پر لیٹ کر پلٹے کھانے لگو! اس طرح تمہارے کپڑوں میں لگی ہوئی آگ بجھ جائے گی۔“

مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں باہر کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے اور پھر باہر نے بھی میرے اس یقین کی تصدیق کر دی۔ میں نے اسی لیے کپڑوں میں لگی ہوئی آگ بجھانے کا انہیں مشورہ دیا تھا۔ اس طرف سے عمارت کے اندر داخل ہونے والے بہر حال سیودکرجی کے ساتھی نہیں ہو سکتے تھے۔

”وہ..... وہ دونوں اقبال اور..... اور جعفری ہیں۔“ باہر نے پر جوش آواز میں مجھے بتایا تھا۔ میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ دونوں ہی زمین پر لیٹ کر پلٹے کھاتے ہوئے اپنے کپڑوں میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جلد ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ میں بھی باہر کو سہارا دیئے اس وقت تک ان دونوں کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ان میں سے ایک نوجوان کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا معلوم ہوا۔ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن یہ موقع تعارف کا یا کچھ پوچھنے کا نہیں تھا۔ ہمیں اس عمارت سے جلد از جلد نکل جانا تھا ورنہ آگ ہمارا راستہ مسدود کر دیتی۔ ہماری زندگی

ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ہلکا سا جوش محسوس ہونے لگا۔ ”ممکن ہے..... میرا اندازہ درست ہو اور..... اور.....“

باہر کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ پہلا ہی جیسا ایک اور زبردست دھماکا سنائی دیا تھا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے اس کمرے کے دروازے پر وار کرنے لگے ہوں۔

”لو باہر! یہ ریوالور۔“ میں نے اسے دونوں ریوالوروں میں سے ایک تھما دیا، پھر بولی ”کیا تم چل سکتے ہو؟“

”ہاں شاید!“ اس نے مجھ سے ریوالور لیتے ہوئے آگے قدم بڑھایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

”میرا خیال یہ کہ تم سہارا لے کر چل سکتے ہو۔ ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں۔“ وہ جواباً بولا۔ ”سہارے کے بغیر شاید میں نہ چل سکوں۔“

میں نے فوراً ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اس سے آگے بڑھنے کو کہا۔ اسی وقت فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

”ایسا لگتا ہے باہر کہ جیسے دو گروہوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔“ میں نے باہر کے قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتے ہوئے خیال آرائی کی، پھر اس سے پوچھنے لگی۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے تم کچھ کہنے والے تھے کیا بات تھی وہ؟ تم اپنے کسی انداز سے.....“

”جی ہاں!“ وہ بول اٹھا۔ ”میرے ساتھیوں کے پاس جو اسلحہ ہے اس میں دستی بم وغیرہ بھی ہیں۔ قیاس غالب یہی ہے کہ اس عمارت پر حملہ کرنے والے وہی لوگ ہوں گے۔“

”مگر انہیں کیسے خبر ہو سکتی ہے کہ تم دشمن کی قید میں ہو؟..... پھر یہ کہ دشمنوں نے تمہیں کہاں قید کیا ہے اس سلسلے میں انہیں کیسے علم ہو سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ اب باہر میرے ساتھ ساتھ اس کمرے سے نکل کر راہداری میں آ چکا تھا۔

”آج رات تین بجے کے بعد میرے ایک ساتھی اقبال کو مجھ سے ملنے آنا تھا۔ دراصل صبح کی ایک فلائٹ سے وہ کراچی جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ایئر پورٹ جانے سے پہلے ملتا ہوا جائے گا۔ یقیناً وہ وقت مقررہ پر پہنچا ہو گا اور گھر کی حالت دیکھ کر اسے صبح اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی ہوگی۔ پھر اس نے دوسرے ساتھیوں کو بھی فوری طور پر اس واقعہ سے آگاہ کر دیا ہو گا۔“ باہر میرے سہارے بیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ ”سیودکرجی کے کچھ ٹھکانوں کا ہمیں علم ہے۔ یہ ٹھکانے بھی انہی میں سے ایک ہے جہاں سیودکرجی کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ میرے ساتھیوں نے اسی لیے اس ٹھکانے پر بھرپور حملہ کیا ہو گا۔“

اچانک فائرنگ رک گئی اور میں اس کا سبب نہ سمجھ سکی۔ باہر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا میرے ساتھ نیچے اتر رہا تھا۔ مجھے پہلے یہ اندازہ نہیں تھا کہ باہر کا چھوٹا سا گروہ جدید ہتھیاروں سے بھی مسلح ہو سکتا ہے۔ فائرنگ رک جانے سے میرا ذہن الجھ گیا تھا۔

زینے سے اترتے ہوئے مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ میں جن دو افراد کو بے ہوشی کی حالت میں

”ہماری اطلاعات کے مطابق یہ کوٹھی ایس رحمان کے ایک قریبی سرکاری عزیز کی ملکیت ہے۔“
 ”تو کیا وہ لوگ یہاں نہیں رہتے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”جی نہیں۔ ایک عرصے سے یہ کوٹھی بھی خالی پڑی ہے۔ وہ لوگ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی سکونت اب چانگام میں ہے۔“ مجھے بتایا گیا۔
 ”دونوں کوٹھیوں کے درمیان والی کوٹھی میں کون رہتا ہے؟“ میں نے یوں ہی دریافت کر لیا۔
 ”ہمیں اس سلسلے میں کبھی کچھ معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔“
 پھر میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور سفر خاموشی سے کئے لگا۔ اچانک باہر کی آواز نے اس خاموشی کو توڑ دیا۔ وہ کہنے لگا۔ ”مجھے فرید احمد کی طرف سے فکر ہے۔ معلوم نہیں اس پر کیا گزری ہوگی۔ جب وہ لوگ مجھے میرے کمرے سے نکال کر باہر لے جا رہے تھے تو میں نے ان میں سے دو افراد کو فرید احمد کے کمرے میں بھی داخل ہوتے دیکھا تھا۔“

باہر کی بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یقیناً وہ بے خبر تھا کہ اس کا دوست فرید احمد قتل کیا جا چکا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں باہر کا کوئی ساتھی اسے فوری طور پر اس روح فرسداقت کی اطلاع نہ دے دے بات کا رخ بدل دیا اور فوراً باہر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”باہر یہ بتاؤ کہ وہ لوگ گھر میں کس طرح داخل ہو گئے تھے؟“

”مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔“ باہر نے جواب میں کہا۔ ”میری آنکھ تو کسی کھٹکے سے کھل گئی تھی، لیکن کچھ سمجھنے سے پہلے ہی وہ میرے کمرے میں گھس آئے تھے۔ ان میں سے ایک نقاب پوش تھا جو سوداگری ہی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے بے بس کر کے میرے منہ میں کپڑا اٹھوٹس دیا اور پھر گھر سے نکال کر ایک کار میں مجھے یہاں لے آئے تھے۔ میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی تھی، مگر اس وقت جب انہوں نے مجھے کار میں بٹھا دیا تھا۔“ یہ کہہ کر باہر اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”اقبال میرا اندازہ ہے کہ تم ایئر پورٹ جانے سے پہلے مجھ سے ملے آئے ہو گے۔ پھر تمہیں.....“

”ہاں۔“ اقبال طویل سانس لے کر بولا۔ یہ وہی تھا جس کا چہرہ مجھے آشنا لگا تھا۔ اب مجھے یاد آ گیا تھا کہ فائو اشار ہوٹل میں ساوتری سے نبرد آزمانی کے وقت وہ بھی میرے اور باہر کے ساتھ تھا۔ وہ اب کہہ رہا تھا۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے باہر میں ہی تم سے ملنے وہاں پہنچا تھا۔ مجھے گھر کا دروازہ کھلا ملا تھا۔ پھر جب میں محتاط انداز میں اندر داخل ہوا تو وہاں مجھے تم نہیں ملے۔ فرید احمد کے کمرے میں روشنی تھی۔ میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو..... اقبال کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔“

میں سمجھ گئی کہ وہ کیا بات کہتے کہتے چپ ہو گیا ہے!

”تو..... تو کیا ہوا؟“ باہر نے بے چینی سے سوال کیا۔

”فرید احمد فرش پر لہو لہان پڑا تھا۔“ اقبال بتانے لگا۔ ”پہلی نظر میں یہی سمجھا میں کہ وہ مر چکا ہے، مگر جب جھک کر اسے دیکھا تو اس کی نبض چل رہی تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اپنی گاڑی میں ڈال کر فوراً ہسپتال لے گیا۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ اسے

وہاں بہر حال خطرے میں تھی۔
 تھوڑی ہی دیر میں آگ مزید بھیل گئی تھی۔ اس کے درمیان سے تیزی کے ساتھ بھاگ کر ہی گزرا جاسکتا تھا، لیکن باہر کی حالت اس قابل نہیں تھی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی یقیناً یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ اسی لیے ان میں سے ایک نے باہر کے منہ کرنے کے باوجود اسے اپنی پشت پر اٹھا لیا۔ پھر ہم سب تیر کی طرح شعلوں کے درمیان سے گزر گئے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم میں سے کسی کے کپڑوں میں آگ نہیں لگی تھی۔ بائیں جانب زبردست آگ بھڑک رہی تھی، مگر ہمیں اس طرف نہیں جانا تھا۔ ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے ٹوٹی ہوئی ایک دیوار کا ملبہ نظر آیا۔ مکان کی یہ دیوار میرے اندازے کے مطابق ہینڈ گریڈ سے اڑانی گئی تھی۔ آگ ابھی یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ وہاں مجھے باہر کے کچھ اور ساتھی بھی دکھائی دیے جو مسلح تھے۔ وہ لوگ یقیناً دیوار ٹوٹنے کے بعد ہی اندر داخل ہوئے تھے۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اس قدر زبردست دھماکے ہونے کے باوجود اڑوس بڑوس کی کوٹھیوں میں رہنے والوں نے باہر نکل کر حقیقت حال جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ ہی پولیس اچھی تک اس طرف متوجہ ہوئی تھی۔ مجھے علم تھا کہ کوٹھیوں میں رہنے والے عموماً اپنے پڑوسیوں سے واقف نہیں ہوتے۔ یہی حال یہاں کا تھا۔

جب ہم اس کوٹھی سے باہر آئے تو صبح کا ہلکا ہلکا اجالا ہر طرف پھیلنے لگا تھا۔ ایک سیاہ وین باہر کھڑی تھی۔ باہر کے تمام ساتھی اس میں سوار ہو گئے۔ مجھے بھی جگہ کی تنگی ہونے کے باوجود باہر کے ساتھ اسی وین میں بیٹھنا پڑا۔ پھر چند ہی لمحے بعد وین وہاں سے روانہ ہو گئی۔
 ہماری وین نے کچھ ہی فاصلے طے کیا تھا کہ بائیں جانب کی ایک سڑک سے پولیس جیپ آتی دکھائی دی۔ سائرن بھی بج رہا تھا۔

”غالباً فون پر کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی ہوگی۔“ باہر کے ایک ساتھی نے تبصرہ کیا۔

”ہاں یہی ہو سکتا ہے۔“ باہر نے اپنے ساتھی کی بات سے اتفاق کیا۔
 وین سیدھی نکلتی چلی گئی۔ پولیس والوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
 ”یہ کون سا علاقہ ہے؟“ میں نے باہر کے اسی ساتھی سے دریافت کیا جس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا نظر آیا تھا۔

”دھان منڈی کا علاقہ ہے یہ۔“ اس نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھی۔ اسی علاقے کی ایک کوٹھی میں پہلے بھی مجھے قید کیا گیا تھا۔

”کیا وہ کوٹھی حزب اختلاف کے لیڈر ایس رحمان کی تھی؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”جی نہیں! ایس رحمان کی کوٹھی اس کوٹھی سے تیسری ہے۔“

”یہ جواب سن کر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ وہی کوٹھی ہو سکتی ہے جس میں ایک سرنگ کے ذریعے میں شکستلہ کے ساتھ پہنچی تھی اور پھر فرار ہو گئی تھی۔ ایس رحمان کی کوٹھی ہی کے قریب وہ کوٹھی بھی تھی۔ سرنگ یقیناً درمیانی کوٹھی کے نیچے ہوگی۔

”یہ کوٹھی کس کی ملکیت ہے؟..... تم لوگوں کو اس کے متعلق بھی کچھ علم ہے؟ میں نے معلوم کیا۔“

چھانک کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

”بابرا“ میں نے اسے آواز دی تو وہ رک گیا اور مرکز میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے مزید کہا۔ ”تم جاؤ آرام کرو میں دروازہ کھولے دیتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں تیر قدموں سے آگے بڑھ کر باہر کے قریب پہنچ گئی۔

آنے والا اقبال ہی تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ فرید احمد کی حالت اب ٹھیک ہے اور اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اس کے ہاتھ میں اپنی اپنی بھی دیکھ لی تھی۔ اچھی منتقل نہیں تھی اقبال نے میرے ساتھ عمارت کی طرف چلتے ہوئے بتایا۔ ”گھر کے صحن میں مجھے ایک لیڈ بڑ برس بھی پڑا ہوا ملا تھا غالباً وہ آپ ہی کا ہے“ میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ اسے بھی میں نے آگے اپنی یس میں رکھ دیا ہے۔

”شکریہ!“ میں بولی۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ گزشتہ شب بے ہوشی سے قبل میرا پرس صحن میں گر پڑا تھا۔

”بابر اب کیسا ہے؟“ اقبال نے مجھ سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے مگر اسے چند روز آرام کی ضرورت پڑے گی۔ گیٹ کھولنے وہی آ رہا تھا“ میں نے اسے واپس کمرے میں آرام کرنے کے لیے بھیج دیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

پھر اقبال اور میں اس کمرے میں آگئے جہاں باہر تھا“ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھنے لگا۔

”نہیں بابر تم لیٹے رہو۔“ میں ہاتھ اٹھا کر بولی۔

بابر دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا تو اقبال نے کہا۔ ”میرا خیال ہے خاتون کہ بابر اور آپ یہیں میری کوشی میں منتقل ہو جائیں۔ فرید احمد کو بھی میں یہیں رکھ لوں گا جب وہ ہسپتال سے صحت یاب ہو کر آ جائے گا۔ اب بادام تلی گھاٹ والے مکان میں آپ لوگوں کا رہنا میرے نزدیک مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ سیوڈمکرجی کی نظر میں آ گیا ہے۔“

”تمہارا کہنا درست ہے۔“ میں بول اٹھی ”گزشتہ رات یہی بات ہو رہی تھی۔ تمہارا اور جعفری کا نام زیر غور تھا۔ غالباً بابر نے جعفری کو اس لیے ترجیح دی ہوگی کہ تمہارا ارادہ کراچی جانے کا تھا۔ اب قسمت نے ہمیں یہاں پہنچ ہی دیا ہے تو ٹھیک ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اب کب تک کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”میرے کراچی جانے یا نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا خاتون!“ اقبال نے جواباً کہا ”آپ کے یہاں قیام کے لیے غالباً میری موجودگی ضروری نہیں۔ میں بابر کو اپنے ہی گھر کا ایک فرد تصور کرتا ہوں اور آپ بھی بابر کی دوست ہونے کے ناطے اب غیر نہیں رہی ہیں۔ یوں بھی فی الحال میں نے کراچی جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔“

”وہاں تم کس لیے جا رہے تھے؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”میری ساری فیکٹی وہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے والد ایک سرکاری ادارے میں افسر ہیں۔ دو ماہ قبل ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا تھا۔ میں اس لیے ان کے ساتھ نہ جا سکا کہ میرا ایک سال

انٹیمو کیئر میں داخل کر لیا گیا۔ میں نے پولیس میں رپورٹ بھی کر دی اور رپورٹ میں وہی لکھایا جو مجھے پیش آیا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اس خونیں ہنگامے کا ذمے دار ایک ہی شخص ہو سکتا ہے اور وہ صرف سیوڈمکرجی ہے۔ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ اس کے پیچھے ہوئے غنڈے ایک بار وہاں پہنچ چکے ہیں۔ پھر میں نے تمام ساتھیوں کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ بابر کو سیوڈمکرجی اغوا کر کے لے گیا ہے تاکہ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر سکے۔ ہم نے اپنے ایک ساتھی کو ہسپتال میں چھوڑا اور پھر سیوڈمکرجی کے ممکنہ ٹھکانوں میں سے پہلے یہیں حملہ کیا جو کامیاب رہا۔“ یہ کہہ کر اقبال خاموش ہو گیا۔

”معلوم نہیں اب فرید کا کیا حال ہوگا!“ بابر فکر مند لہجے میں بولا۔

”جب میں ہسپتال سے چلا تھا تو ڈاکٹر اس کے سینے سے گولی نکالنے کے لیے اسے آپریشن روم کی طرف لے جا رہے تھے۔“ اقبال بتانے لگا۔ ”ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اگر آپریشن کامیابی سے ہو گیا اور اس دوران میں فرید احمد بچ گیا تو پھر اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“

”اگر..... اگر میرا دوست مر گیا تو..... تو میں سیوڈمکرجی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا! بابر ہتھیاں بھیج کر غمگین مگر پر جوش لہجے میں بولا۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ بابر کا دوست فرید احمد ابھی زندہ تھا۔ سیوڈمکرجی کو یقیناً غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ اس نے فرید احمد کی بے ہوشی کو موت پر محمول کیا تھا۔ اگر اقبال بروقت وہاں نہ پہنچ جاتا تو پھر فرید احمد کا بچنا محال تھا۔ اسے طبی امداد ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

اس دین میں ہم سب لوگ اقبال کے گھر تیج گاؤں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے بابر کے ایک ساتھی نے اس کی مرہم پٹی کی اور اس دوران میں اقبال نے مڈ فورڈ ہسپتال فون کر کے یہ معلوم کر لیا کہ فرید احمد کا آپریشن کامیاب رہا ہے اور اب وہ خطرے کی حدود سے نکل چکا ہے۔ یہ خبر سن کر بابر اور اس کے سارے ساتھیوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

یہ رات بڑی ہنگامہ خیز گزری تھی۔ تھکن اور نیند سے میرا برا حال تھا۔ اقبال نے کراچی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اس کی کوشی خاصی بڑی تھی۔ مجھے اور بابر کو وہاں وقتی طور پر ایک ایک کمرال گیا۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر اقبال مڈ فورڈ ہسپتال روانہ ہو گیا۔ اس سے چلتے وقت میں نے کہا تھا کہ اگر واپسی میں ممکن ہو تو میری اچھی فرید احمد کے گھر سے لیتا آئے۔ گھر کی چابی اسی کے پاس تھی۔ فرید احمد کو ہسپتال لے جانے سے پہلے اس نے گھر میں تالا ڈال دیا تھا۔ اقبال نے وعدہ کیا تھا کہ لوٹتے ہوئے وہ بادام تلی گھاٹ ہو کر آئے گا۔ ان لوگوں کے درمیان مجھے کسی قسم کی غیریت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بابر کے دوسرے ساتھی اپنے اپنے گھر روانہ ہو چکے تھے۔ اقبال کی کوشی کے دو کمروں میں بابر اور میں تنہا ہی تھے۔ بابر کو سو جانے کی تلقین کر کے میں دوسرے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔

دوپہر سوا بارہ بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ بابر کے زخمی ہونے کے سبب اقبال گیا تھا تو دروازہ بھی میں نے ہی بند کیا تھا۔ میں تھکن کی وجہ سے خاصی گہری نیند سو رہی تھی اس لیے میری آنکھ جلد نہ کھل سکی۔ میں کمرے سے باہر آئی تو بابر کو آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر

نے خیال آرائی کی۔ اس نے مالک مکان سے کہہ دیا ہو گا کہ کسی پر یہ بات ظاہر نہ کرے اور برائے فروخت کا بورڈ دیکھ کر جو اسے تلاش کرتا ہوا مکان خریدنے آئے اسے اتنی قیمت بتا دی جائے کہ وہ اپنا سامع لے کر واپس چلا جائے۔

”مگر اس گورکھ دھندے کی وجہ؟“ اقبال نے بھی گفتگو میں مداخلت کی۔
 ”سیدھی سی بات ہے۔“ میں نے کہا سیوڈمکرجی یہ نہیں چاہتا ہو گا کہ کہیں سے بھی اس کا کوئی سراغ مل سکے۔ بہر حال اس سنگی آدمی سے ضرور ملوں گی تاکہ اپنے اس شے کی تصدیق کر سکوں۔“ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں.....؟ آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ باہر نے پوچھا۔
 ”فی الحال تو ہاتھ روم جا رہی ہوں اس کے بعد میرا ارادہ صدر گھاٹ تک جانے کا ہے۔“
 ”وہاں تک کہیں تو میں اپنی کار میں چھوڑ دوں آپ کو۔“ اقبال بولا۔
 ”نہیں، تم زحمت نہ کرو! کیلی چلی جاؤں گی میں۔“
 ”واپسی کب تک ہوگی آپ کی؟“ باہر نے دریافت کیا۔ ”دوپہر کا کھانا.....“
 ”میرا انتظار نہ کرنا“ کیا خبر وہاں کتنی دیر لگ جائے مجھے۔ میں کسی ہول میں کھانا کھا لوں گی۔“
 یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں جس کمرے میں سوئی تھی وہاں منچ ہاتھ روم بھی تھا۔ غسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگا اور پھر میں اقبال کی کوشی سے باہر نکل آئی۔ باہر آنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس میک اپ میں سیوڈمکرجی سے میرا سامنا ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں نیا میک اپ ضروری ہو گیا تھا۔ بے احتیاطی میرے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے یہ سوچ کر میں دوبارہ کوشی میں واپس چلی گئی۔
 ”کیا کچھ بھول گئی تھیں آپ؟“ اقبال نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا تھا۔
 ”ہاں، اپنا چہرہ بدلنا بھول گئی تھی“ میں مسکرا کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

”تو..... تو کیا یہ..... یہ آپ کا اصل چہرہ نہیں؟“
 ”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دراصل میرا اصل چہرہ بہت بھیا تک ہے اسی لیے اسے عموماً چھپائے رہتی ہوں۔“ میرے لہجے میں شوق تھی۔

”آپ مذاق کر رہی ہیں شاید۔“ وہ ہنس پڑا۔
 ”میرا اصل چہرہ دیکھ کر تمہیں یقین آ جائے گا۔“ میں بدستور شوق لہجے میں بات کرتی رہی۔
 ”اچھا ایسا کرو کہ اب میں تم لوگوں کے ساتھ ہی کھانا کھا کر جاؤں گی“ کھانے کا بندوبست کر لؤ نیا میک اپ کرنے میں اتنی دیر تو لگ ہی جائے گی۔“
 ”آپ مجھے میک اپ کرنا سکھا دیں گی؟..... مجھے بہت شوق ہے اس کا!“ وہ بڑے اشتیاق سے بولا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں! اگر یہاں زیادہ رہنا پڑا تو ضرور سکھا دوں گی۔ اس میں بہر حال وقت لگتا ہے۔“

ہے۔

ضائع ہو جاتا۔ میں یہاں ایم اے پر پولیس میں زیر تعلیم ہوں۔“
 ”تو ایم اے فاضل تم کراچی یونیورسٹی سے کرو گے!“ میرا لہجہ تصدیق طلب تھا۔
 ”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”غالبا اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ ابو نے کہا تھا کہ وہ جلد از جلد دوبارہ اپنا تبادلہ یہاں کرائیں گے۔ آج کل کیونکہ یونیورسٹی بندھی اس لیے میں نے سوچا تھا کہ کچھ دن امی ابو کے پاس رہ آؤں گا مگر اب ارادہ بدل دیا ہے۔“

”تم نے انہیں مطلع بھی کر دیا یا نہیں کہ تم نہیں آرہے؟“ باہر نے سوال کیا۔
 ”ہاں میں انہیں ابھی تار دے کر آیا ہوں تاکہ وہ فکرمند نہ ہوں آج ہی خط بھی لکھ دوں گا۔“
 کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے ہی ان دونوں کو مخاطب کیا، ”سیوڈمکرجی کے کتنے ٹھکانے تم لوگوں کے علم میں ہیں۔ اور باہر تم نے اس سلسلے میں مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“
 دراصل ہم یقینی طور پر کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اور نہ پہلے تھے۔“ باہر بول اٹھا۔
 ”سیوڈمکرجی کی بابت یا اس کے حوالے سے اب تک تین ایسی جگہوں کا ہمیں سراغ ملا ہے جہاں اس کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹھکانے پر پہلے چھاپہ مار چکے ہیں۔ یہ دھان مندی کی وہی کوشی ہے جہاں آپ کو پہلی بار قید رکھا گیا تھا۔ ہم نے محض شک کی بنیاد پر ایسا کیا تھا جو بعد میں درست ثابت ہوا۔ یہ کوشی جیسا کہ آپ کے علم میں بھی ہے حزب اختلاف کے ایک لیڈر امیں رحمان کی ہے۔ سیوڈمکرجی کا دوسرا ٹھکانہ وہی کوشی تھی جہاں گزشتہ رات ہمیں لے جایا گیا تھا ہم نے اس پر ابھی چھاپا نہیں مارا تھا۔ اس پر بھی ہمیں شک ہی تھا۔“

”شک کی وجہ تو ہوگی کوئی؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”جی ہاں جیتھی۔“ باہر نے جواب دیا۔ ”ہماری اطلاعات کے مطابق وہ کوشی خالی تھی مگر اس میں کبھی کبھار نقل و حرکت دیکھی گئی تھی۔“

”ہوں!“ میں نے طویل سانس لی، پھر بولی۔ ”اور تیسرا ٹھکانا؟“
 ”اسلام آباد روڈ پر لائن سینما کے عقب میں بھی ایک ایسی ہی عمارت ہے جو خالی پڑی رہتی ہے۔ ہمارے کچھ ساتھیوں نے اس عمارت میں بھی لوگوں کو آتے جاتے دیکھا ہے۔ اس عمارت پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہوا ہے، لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق مالک مکان فی الحال اسے بیچنا نہیں چاہتا۔ وہ مکان کی اتنی قیمت مانگتا ہے کہ کوئی خرید ہی نہ سکے۔“

باہر کی بات سن کر میں نے کہا اگر ایسا ہے تو پھر اس نے برائے فروخت کا بورڈ وہاں کیوں لگا رکھا ہے؟ تم نے یہ معلوم نہیں کیا؟“

”وہ ایک سنگی سا آدمی ہے یا اگر حقیقتاً سنگی نہیں تو ایسا ظاہر ضرور کرتا ہے۔ میں خود اس سے مل چکا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ مکان بیچے گا تو اسی قیمت پر ورنہ نہیں۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ اتنی قیمت پر تو روز قیامت تک کوئی اس مکان کو نہیں خرید سکے گا۔ جواب میں اس نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کی سکونت بھی اسی علاقے میں ہے۔“

”وہ مکان فروخت ہو چکا ہے باہر..... اور اسے خریدنے والا سیوڈمکرجی ہی ہو سکتا ہے۔ میں

”شکریہ پیشگی شکریہ!“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔

پھر میں اس کمرے میں آگئی جہاں میری اپنی رکھی تھی۔ کمرے کا دروازہ میں نے بند کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اگر اقبال میرا اصل چہرہ بھی دیکھ لیتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ بابر اور اس کے ساتھیوں کو میں اپنے لوگ ہی سمجھ رہی تھی اور ان کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی تھا۔

اپنے نئے میک اپ پر میں نے خصوصی توجہ دی۔ اس بار میں نے اپنے چہرے پر ایک ادھیڑ عمر بد صورت عورت کا میک اپ کیا تھا اور دگ بھی لگا لی تھی جس کے آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ اب کوئی بھی مرد ایک نظر مجھے دیکھنے کے بعد دوبارہ میری طرف نظر اٹھانا پسند نہ کرتا اور یہی میرا مقصد بھی تھا۔ میک اپ کرنے میں مجھے تقریباً پون گھنٹا لگ گیا۔

جب میں اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں پہنچی جہاں بابر اور اقبال تھے تو دونوں ہی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”یہ نہ سمجھ لینا اقبال کہ کوئی اجنبی عورت گھر میں گھس آئی ہے۔“ میں ہنستے ہوئے بولی۔ یہ ہے میرا اصل چہرہ! اب تمہیں میری بات کا یقین آ گیا۔“

”نہیں!..... یہ..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ بے یقینی سے بولا۔ پھر بابر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیوں بابر! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا!“

”ہاں بھئی۔“ بابر ہنس پڑا۔ ”ٹھیک کہہ رہے ہو تم، مگر اس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے!“

بابر کی بات سن کر اقبال کچھ غل سا ہو گیا۔ پھر وہ بات بدلنے کی غرض سے بولا ”میں آپ کے لیے بھی لٹچ باکس لے آیا ہوں چلیے ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔“

”ویسے آپ نے کمال کر دیا ہے میک اپ میں۔“ بابر اپنے دوست اقبال کا سہارا لیتے ہوئے اٹھنے لگا۔ ”قرب سے دیکھ کر بھی کسی کو آپ پر شک نہیں ہو سکتا کہ یہ آپ کا اصل چہرہ نہیں۔“

پھر ہم سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ کھانے سے فراغت پا کر حسب عادت مجھے چائے کی خواہش ہوتی۔ چائے کے بغیر میرا کھانا ادھورا ہی رہتا تھا، مگر اس کے لیے اقبال سے کہتے ہوئے مجھے جبک سی محسوس ہو رہی تھی۔ بابر نے میری مشکل آسان کر دی اور اقبال خود چائے بنانے چلا گیا۔

اقبال کو واجب سی چائے بنانا آتی تھی، لیکن کام چل گیا اور میں چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے اب شکلیہ کا خیال آ رہا تھا جس سے میں وعدہ کر آئی تھی کہ آج ضرور آؤں گی۔ اسے اپنے باپ ضیاء الاسلام سے ملنے کی شدید خواہش تھی۔

کونٹھ سے نکل کر کسی ٹیکسی کے انتظار میں میری نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی اور میں صدر گھاٹ روانہ ہو گئی۔

سی آئی ڈی آفس پہنچ کر پہلے میں ضیاء الاسلام سے ملی اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ وہ خاتون جو کل مجھ سے ملی تھیں کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔“

”تم ان سے جو کچھ کہنا چاہتی ہو مجھے بھی بتا سکتے ہو۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ وہ مجھے میری

آواز سے نہیں پہچان سکا تھا۔

سی آئی ڈی انسپکٹر کو بھی میں نے بڑی مشکل سے یقین دلایا تھا کہ میں ہی عذرا خان ہوں۔ اس کے لیے میں نے گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ وہ میرے میک اپ پر بہت حیران تھا۔ اس کے خیال میں چہرے کو اس طرح یکسر بدل لینا ناممکن ہی تھا۔ میری آواز بھی اسے یہ یقین دلانے میں معاون ثابت ہوئی تھی کہ میں کوئی اور نہیں ہوں۔

میری بات سن کر اس وقت ضیاء الاسلام کچھ دیر خاموش رہا، پھر کہنے لگا ”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں کب تک رہنا پڑے گا؟“

”کیوں، تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے کیا؟“ میں بولی۔

”جی نہیں، لیکن حالات تو پھر حالات ہی ہوتی ہے!“

وہ جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اگر آپ مجھے بتا دیتیں کہ یہاں کتنے دن رہنا ہے تو میں ڈنٹی طور پر مطمئن ہو جاتا۔“

”یہ بتاؤ کہ یہاں ڈھاکہ میں تمہارا کوئی قریبی عزیز ایسا ہے جس کے یہاں تم کچھ دن قیام کر سکو؟ میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ میری بہن یہاں رہتی ہے، میں اس کے یہاں رہ سکتا ہوں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، تمہیں آج ہی رہا کر دیا جائے گا مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ تمہیں پوری طرح چوکنا اور محتاط رہنا ہے۔ تمہارا زندگی کو خطرہ بھی پیش آ سکتا ہے۔“

”میں..... میں خیال رکھوں گا اور..... اور اگر آپ کہیں گی تو گھر سے باہر بھی نہیں نکلوں گا، وہ مجھے یقین دلانے لگا۔

”نہیں تمہیں گھر میں بند نہیں ہونا..... تم گھر سے ضرور نکلو گے، ہاں شکلیہ کے سلسلے میں یہ تاکید ضرور کر دوں گی کہ اسے گھر سے تنہا کہیں نہ جانے دینا!“

میری بات کا رد عمل توقع کے مطابق ہوا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ پھر وہ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ”شکلیہ..... وہ..... وہ تو..... میں کل بتا چکا ہوں.....“

”شکلیہ کو برآمد کر لیا گیا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”نن..... نہیں!“ وہ بے اختیار ہو کر جیسے رونے کے قریب ہو گیا۔ ”کیا واقعی وہ..... وہ مل گئی؟..... میری بچی مل..... مل گئی؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی میں اس سے تمہاری ملاقات کرادوں گی۔ تمہیں اور اسے تمہاری بہن کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ میں نے تمہیں جو ہدایات دی ہیں ان کا خیال رکھنا۔“

سی آئی ڈی آفس کے ایک کمرے میں ضیاء الاسلام سے میں بات کر رہی تھی کمرے میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ انسپکٹر کو میں نے باہر بھیج دیا تھا۔ اسے بلانے کے لیے میں کرسی سے اٹھ کر دروازے تک پہنچی وہ باہر موجود تھا۔ میرے کسی حکم کے انتظار میں وہ برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔

گی۔ ان دونوں کو تم پولیس کی کسی بند دین میں اس پتے تک پہنچاؤ گے جو پتا ضیاء الاسلام بتائے گا۔ کام یہیں ختم نہیں ہوگا بلکہ ضیاء الاسلام کی نگرانی کی جائے گی۔ دن کے وقت اور رات کے وقت بھی تمہارے آدمیوں کو یہ خیال رکھنا ہے کہ کوئی بھی شخص ضیاء الاسلام کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ کوئی شخص اگر تمہارے آدمیوں کے علاوہ ضیاء الاسلام کا تعاقب کرتا نظر آئے تو اسے بھی چیک کیا جائے۔ تمہارے آدمیوں کو ایسے کسی شخص کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنا ہیں۔ یوں سمجھو کہ ضیاء الاسلام کو بطور چار استعمال کیا جا رہا ہے اصل مجرم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے! تم سمجھ رہے ہو میری بات؟“

”جی ہاں بالکل سمجھ رہا ہوں۔ آپ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی تعمیل ہوگی۔“ انسپکٹر نے جواباً کہا۔

”ٹھیک ہے پھر! میں خود تم سے رپورٹ لے لوں گی فون کر کے یا پھر خود ہی یہاں آ کر! تم اپنے ان آدمیوں سے مسلسل رابطہ رکھو گے جنہیں ضیاء الاسلام کی نگرانی پر مامور کرو گے۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی!“

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں سختی آ گئی۔ پھر میں واپس کمرے کی طرف مڑ گئی۔ اندر پہنچ کر میں نے ضیاء الاسلام کو مخاطب کیا۔ ”تمہاری بہن کہاں رہتی ہے؟“

”جناب ایو نیو میں۔“ اس نے بتایا۔

میں نے اپنے پرس میں سے قلم اور ایک چھوٹی سی ڈائری نکال کر اس کی طرف بڑھادی اور کہا ”اس پر اپنی بہن کا پورا پتا لکھ دو اس طرح کہ اگر کوئی اس پتے پر پہنچنا چاہے تو اسے آسانی سے تمہاری بہن کا گھر مل جائے۔“

”جی..... لکھ دیتا ہوں۔“ اس نے میرے ہاتھ سے ڈائری اور قلم لے لیا اور پھر قلم کھول کر اس پر اپنی بہن کا پتا لکھنے لگا۔

”ابھی کچھ دیر کے بعد تمہیں پولیس کی ایک بند دین میں اس پتے پر پہنچا دیا جائے گا۔“ میں نے اسے بتایا۔

ضیاء الاسلام نے ڈائری پر پتا لکھ کر دے دیا۔ اس پتے پر ایک نظر ڈال کر میں نے ڈائری دوبارہ اپنے پرس میں رکھ لی۔ پتا اس نے میری ہدایت پر ذرا تفصیل سے لکھا تھا۔

”سنو! تمہیں اس وقت تک نارائن گنج کا رخ نہیں کرنا جب تک اس کی اجازت نہ مل جائے! اس دوران میں اگر تم سے خورشید الاسلام ملے تو تمہیں اس کی اطلاع فوری طور پر انسپکٹر کو دینا ہے۔ اس کے لیے تم فون بھی استعمال کر سکتے ہو۔“ میں نے مزید ہدایات دیں۔ انسپکٹر بھی کمرے ہی میں تھا۔ میں نے ضیاء الاسلام کو فون نمبر دینے کے لیے کہہ دیا۔

پھر میں وہاں مزید نہیں رکی۔ سی آئی ڈی آفس سے باہر آنے کے بعد میں نے سوچا کہ ہوم سیکرٹری عبید الرحمن چوہدری سے بھی مل ہی لینا چاہئے۔ ابھی اس کے دفتر کا وقت ختم نہیں ہوا تھا یہ سوچ کر میں نے گرین روڈ کے لیے ایک ٹیکسی کر لی۔ راستے میں ایک بڑے جلوس کے سبب میری ٹیکسی کو روک جانا پڑا۔ جلوس کے پیچھے پولیس کے دو ٹرک بھی تھے۔ جلوس کے شرکاء حکومت کے خلاف نعرے لگا

”سنو انسپکٹر!“ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”جی فرمائیے!“ وہ کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

”اس لڑکی کو یہاں لے آؤ!“ میں نے اسے حکم دیا ”اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بہتر ہے۔“ وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر ایک طرف چلا گیا۔

”شکیلہ ابھی آ رہی ہے۔“ میں نے کمرے میں واپس آ کر ضیاء الاسلام کو بتایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ یہ آنسو خوشی ہی کے ہو سکتے تھے۔

”وہ..... وہ شکیلہ آپ لوگوں کو کہاں ملی؟“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اسے تمہاری ہی حویلی کے ایک تہ خانے سے برآمد کیا گیا ہے میں نے اسے بتایا۔“

”تہ خانے سے! اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ اچھا تو خورشید الاسلام نے اسی لیے مجھ سے حویلی میں موجود تہ خانوں کے بارے میں پوچھا تھا..... افسوس کہ خود مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ میری..... میری بچی حویلی ہی میں ہے۔“

”اس کی وجہ یہ بھی کہ اس نے فون کر کے تمہاری شکیلہ سے بات کرائی تھی اور تمہیں یہ یاد کر دیا تھا کہ شکیلہ ڈھاکہ میں ہے۔“ میں بول اٹھی۔ پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ ”تمہاری حویلی میں کتنے تہ خانے ہیں؟“

”دو“ اس نے جواب دیا ”ایک تہ خانہ حویلی کی مرکزی عمارت کے نیچے ہے۔ اس میں غلہ وغیرہ بھی ذخیرہ کیا جاتا ہے اور دوسرا.....“

”دوسرے کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔“ میں بول اٹھی۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے حویلی میں کسی اور تہ خانے کے امکان پر غور کیوں نہیں کیا۔ یہ یقین ممکن تھا کہ خورشید الاسلام گزشتہ رات اپنے گروگوں کے ساتھ اسی تہ خانے میں چھپ گیا ہو۔ رات کے وقت وہ بھلا جا بھی کہاں سکتا تھا۔ مگر اب کچھ سوچنا فضول ہی تھا۔ وقت گزر چکا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد شکیلہ انسپکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی پھر باپ اور بیٹی کا ملن میرے لیے انتہائی متاثر کن تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے ہوئے رو رہے تھے۔ شکیلہ کی تو ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

”بس کرو شکیلہ!“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”اب تم کیوں رو رہی ہو۔ اب تو تمہارے ابو مل گئے ہیں تم سے!“

شکیلہ نے آنسو بھری آنکھوں سے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر اپنے باپ کے سینے سے الگ ہو گئی۔ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر میں انسپکٹر کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔

انسپکٹر میرے پیچھے پیچھے آ کر کمرہ دوبارہ سامنے کھڑا ہو گیا۔

”سنو انسپکٹر!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”میری ہدایات غور سے سنو!“

”جی..... فرمائیے“ میں توجہ سے سن رہا ہوں۔“

”ضیاء الاسلام کو میں رہا کر رہی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی بیٹی بھی اسی کے ساتھ جائے

رہے تھے اسی کے ساتھ وہ بنگلہ کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔ جوم کے آگے ایک جیپ میں چند افراد سوار تھے جو اس جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ نارائن گنج میں خورشید الاسلام نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا اس کا عملی مظاہرہ شروع ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں وہ لوگ اندر ہی اندر نہ جانے کب سے یہ ساری تیاریاں کر رہے تھے! اس جلوس کی وجہ سے خاصی دیر کے بعد میری ٹیکسی کو آگے بڑھنے کا موقع مل سکا۔

جب میں ہوم سیکرٹری کے دفتر پہنچی تو وہ بس اٹھنے ہی والا تھا۔ وہ مجھے غیر متوقع طور پر دیکھ کر کسی قدر حیران سا ہوا۔ میرے نئے میک اپ پر بھی اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔
”میں تو سمجھا تھا کہ گزشتہ رات کے ریڈیو کے وجہ سے آج آپ آرام کریں گی۔“ وہ بولا پھر کہا ”آج پھر آپ کو میک اپ تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آگئی!“
”ہاں بغیر ضرورت کے میں ایسا نہیں کرتی۔“

”کل کے ریڈیو کی رپورٹ میں نے لے لی تھی“ وہ کہنے لگا۔ ”بہر حال اس حد تک ریڈیو کا میاب کہا جاسکتا ہے کہ وہ لڑکی برآمد کر لی گئی۔ اب آپ کا ضیاء الاسلام اور اس لڑکی کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟ کیا ان دونوں کو فی الحال پولیس کی تحویل ہی میں رکھیں گی؟“
”نہیں وہ دونوں اب پولیس کی تحویل میں نہیں رہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے اپنی فی حکمت عملی سے آگاہ کر دیا۔

”آپ نے میری دانست میں مناسب قدم اٹھایا ہے۔ اس طرح یہ امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ خورشید الاسلام سامنے آ جائے گا۔“ اس نے میری حکمت عملی سے اتفاق کیا پھر کہنے لگا۔ ”ان دنوں پولیس کے لیے ایک اور درد سر پیدا ہو گیا ہے۔ احتجاجی جلے اور جلوس شروع ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سب کس پارٹی کی شہ پر ہو رہا ہے۔“

”غالباً میں آپ کو اس گفتگو سے آگاہ کر چکی ہوں جو میرے اور خورشید الاسلام کے درمیان ہوئی تھی۔ حکومت کے خلاف نعرے لگانے والے اور بنگلہ کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کرنے والے ملک دشمن عناصر ہیں۔ ان افراد کے پیچھے امریکی ایجنٹ ہیں اور وہ مقامی لوگ بھی جو ان ایجنٹوں کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد خورشید الاسلام وغیرہ سے ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایسی صورت میں تو خورشید الاسلام کی گرفتاری اور بھی ضروری ہوگئی ہے اسے گرفتار کر کے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے اور تحریک کار عناصر پر ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے۔“
”ہاں لیکن وہ اتنی آسانی سے گرفتار نہیں ہوگا۔“ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بس ایک امید ہے کہ وہ ضیاء الاسلام کے چکر میں آ کر ہمارے ہتھے چڑھ جائے۔“

”آپ نے اس کا بندوبست کر تو دیا ہے اب دیکھیے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے! ویسے ایک بات میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ آخر ضیاء الاسلام کا پیچھا کیوں کرے گا؟ میرا تو خیال ہے کہ اب وہ موجودہ صورتحال میں ضیاء الاسلام کے قریب نہیں آئے گا۔ عبید الرحمن چودھری بولا۔
”میں آپ کے خیال سے متفق نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اسے بہر حال ضیاء الاسلام کی

طرف سے یہ خطرہ لاحق ہوگا کہ وہ کہیں اس کا راز فاش نہ کر دے۔ ایسی صورت میں اس کی کوشش یہی ہو گی کہ وہ ضیاء الاسلام کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے۔“

”مگر ضیاء الاسلام تو ہمیں سب کچھ بتا چکا ہے۔“

”لیکن خورشید الاسلام کو تو اس کا علم نہیں! وہ یہ جاننے کے لیے بھی ضیاء الاسلام کی تلاش میں ہو سکتا ہے اور اس سے ملنے کی کوشش کر سکتا ہے کہ راز بھی راز ہے یا نہیں!۔ بہر حال ہمیں آگے بڑھنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تو چاہئے۔“

”چائے منگواتا ہوں میں آپ کے لیے!“ یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے کو بلانے کے لیے گھٹنی بجائی۔

”نہیں! میں چائے نہیں پیوں گی اور اب چلوں گی۔“ میں نے چائے پینے سے انکار کر دیا۔
”تو پھر چلیے! میں بھی اٹھ ہی رہا تھا! آپ جہاں کہیں گی چھوڑ دوں گا۔ ویسے ابھی آپ دین اپنی کزن کے یہاں ٹھہری ہوئی ہیں نا!..... وہیں مونی جھیل میں؟“

”جی ہاں وہیں ہوں ابھی تک! مگر اس وقت میں ایک اور جگہ جا رہی ہوں۔“
”معاف کیجئے گا مس خان! کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مجھ پر بھی اعتماد نہیں کرتیں۔“

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ محض آپ کا خیال ہے۔“ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔
”بہر حال اگر مناسب سمجھیں تو ساتھ چلیں ورنہ.....“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا دیا۔

”ناحق آپ کو زحمت ہوگی! لیکن آپ بعد ہیں تو مجھے کاروان بازار چھوڑ دیجئے۔“ میں نے دانستہ ایک ایسی آبادی کا نام لیا تھا جو بیچ گاؤں سے ملی ہوئی تھی۔ مجھے دراصل بیچ گاؤں جانا تھا، مگر میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں سے میں بڑی آسانی کے ساتھ چہل قدمی کرتی ہوئی اقبال کی کوشی تک پہنچ سکتی تھی۔

میری بات سن کر عبید الرحمن چودھری کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کہا۔ ”چلیں آپ نے مجھ پر اتنا اعتماد تو کیا!“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ پھر میں اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ اسے آتے دیکھ کر اس کا ڈرائیور مستعد نظر آنے لگا۔ ہم کار کے قریب پہنچے تو اس نے کار کا پچھلا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا۔

”اندر تشریف رکھیے!“ عبید الرحمن چودھری نے پہلے مجھے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
”شکریہ!“ یہ کہہ کر میں اندر بیٹھ گئی۔ پھر عبید الرحمن چودھری بھی میرے قریب آ بیٹھا۔

”سنو ڈرائیور! پہلے کاروان بازار چلنا ہے اس کے بعد گھر۔“ جب ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ کے بیٹھ گیا تو عبید الرحمن چودھری نے اس سے کہا۔

”بہتر ہے سہرا“ ڈرائیور نے یہ کہتے ہوئے کار اشارت کر دی۔

کار ابھی کچھ ہی دور چلی تھی کہ عبید الرحمن چودھری بول اٹھا۔ ”آپ کا میں نے بہت نام سنا ہے“ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ میں آپ کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ نے شادی

آئی ڈی آفس۔“

”سنو انپکٹر! مجھے اس انپکٹر سے بات کرنا ہے جو کل رات میرے ساتھ نارائن گنج گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ کل۔“

”جی ہاں جی!۔۔۔۔۔ کل رات نارائن گنج میں ضیاء الاسلام کی حویلی پر ریڈ کیا گیا تھا۔ میں بھی آپ کے نام سے واقف ہوں۔ انپکٹر عبدالرشید سے میری بات ہوئی تھی، مگر وہ جی اس وقت نہیں ہے۔ اس کی ڈیوٹی آف ہو چکی ہے۔“

”اچھا تو اس کا نام عبدالرشید ہے!۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے میں کل صبح اس سے بات کر لوں گی۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اقبال کی کوٹھی میں یہ سہولت بھی تھی کہ وہاں فون تھا۔ میں اس لیے بھی وہاں رہنے پر راضی ہو گئی تھی۔

پھر دوسرے دن صبح میں نے سی آئی ڈی انپکٹر عبدالرشید سے بات کی۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ روز سے اب تک کسی مشتبه شخص کو ضیاء الاسلام کے قریب نہیں دیکھا گیا۔ ”یہ بتاؤ کہ وہ کل سے اب تک باہر بھی نکلا ہے یا نہیں؟“ میں نے سوال کیا۔ ”جی نہیں۔“

انپکٹر نے جواب دیا۔ ”وہ کل سے گھر ہی میں ہے۔“

”رات کے وقت بھی نگرانی کی جا رہی ہے نا!“ میں نے تصدیق کی۔

”جی ہاں بالکل۔“ اس نے بتایا۔

”یہ معلوم کر کے بتاؤ مجھے کہ وہاں کوئی فون ہے یا نہیں؟“ پھر میں نے اقبال کا نمبر اسے لکھا دیا۔ ”تم اس نمبر پر مجھے اطلاع دے سکتے ہو۔ اس کے علاوہ اگر کوئی نئی بات سامنے آئے تو بھی اس نمبر پر مجھے تمہاری بات ممکن ہے۔ اگر میں نہ ملوں تو تم میرے لیے پیغام چھوڑ سکتے ہو۔“

”بہت بہتر ہے جی۔۔۔۔۔ میں معلوم کرانا ہوں کہ وہاں۔“

انپکٹر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے ریسپورڈ رکھ دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد انپکٹر کی طرف سے اطلاع ملی کہ ضیاء الاسلام کی بہن کے گھر فون نہیں ہے۔ پھر دو روز گزر گئے اور کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس دوران میں بس ایک مرتبہ ضیاء الاسلام گھر سے نکلا تھا اور بازار سے کچھ خریداری کر کے واپس آ گیا تھا۔ تیسرے دن انپکٹر عبدالرشید سے ایک کام کی اطلاع موصول ہوئی۔

”آج دوپہر کے بعد ضیاء الاسلام گھر سے نکلا تو ایک شخص اس کے پیچھے لگ گیا۔ ضیاء الاسلام نے بھی اس شخص کو دیکھ لیا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی تیز قدم اٹھاتا شروع کر دیئے تھے۔“ انپکٹر عبدالرشید فون پر مجھے بتا رہا تھا۔ ”ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ضیاء الاسلام اس شخص سے خوفزدہ ہے۔ اس شخص نے ایک گلی سے گزرتے ہوئے اپنی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ہمارے آدمی اس پر نظر رکھے ہوئے تھے پھر اس نے جیسے ہی ریوالور سیدھا کر کے ضیاء الاسلام پر فائر کرنا چاہا ہمارے آدمیوں نے اسے پکڑ لیا۔ ضیاء الاسلام اس وقت تک گلی سے نکل کر ایک طرف مڑ چکا تھا۔ اس شخص نے ابھی تک زبان نہیں کھولی

بھی نہیں کی۔ کیا آپ شادی کے خلاف ہیں؟“

”چودھری صاحب! معاف کیجئے گا! میں ہمیشہ اپنے آپ کو موضوع گفتگو بنانے سے گریز کرتی ہوں۔ بہر حال میں اتنا ضرور عرض کروں گی کہ شادی سے مجھے کوئی اختلاف نہیں! لیکن اپنی حد تک میں شادی افورڈ نہیں کر سکتی۔ رہیں میری ذاتی زندگی کے متعلق دیگر باتیں تو آپ ہی کیا! اور بہت سے لوگ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ میں کسی کو کچھ بتانا پسند کرتی ہوں۔“

”تو پھر یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ آپ نے دانستہ خود کو ایک پراسرار شخصیت بنا رکھا ہے۔“

”جو بھی آپ سمجھیں! میں خود اس سلسلے میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔“ میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

عبید الرحمن چودھری نے پھر کوئی ذاتی سوال نہیں کیا۔ وہ مجھ سے موجودہ سیاسی حالات پر گفتگو کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ مشرقی پاکستان کے بایسوں میں دانستہ ایک مخصوص طبقے نے احساس محرومی پیدا کر دیا ہے اور اس سے وہ طبقہ اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی باتوں پر میں بس ”ہاں ہاں“ کرتی رہی۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

کاروان بازار میں کار داخل ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”آپ ڈرائیور کی رہنمائی کر دیجئے گا کہ گھر چلنا ہے۔“

”بس یہیں ایک طرف سڑک کے کنارے کار روک دو۔“ عبید الرحمن چودھری کو کوئی جواب دینے کی بجائے میں براہ راست ڈرائیور سے مخاطب ہوئی۔

ڈرائیور نے میری ہدایت کے مطابق کار روک دی تو میں عبید الرحمن چودھری کو ”خدا حافظ“ کہہ کر کار سے اتر گئی۔ کار سے اترتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے تھے اور میں اس حیرت کی وجہ جانتی تھی۔ آس پاس کوئی عمارت نظر نہیں آ رہی تھی! ہاں چند قدم کے فاصلے پر بازار ضرور تھا۔ اسے شاید یہ توقع رہی ہوگی کہ میں کسی مکان کے سامنے اتروں گی۔ پھر اس کی کار آگے بڑھ گئی اور میں پیدل اس آبادی کے بازار کی طرف چلنے لگی۔

عبید الرحمن چودھری کی کار میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے تیج گاؤں کا رخ کیا۔ اس وقت دوپہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

اقبال کی کوٹھی پر مجھے باہر اکیلا ملا۔ اقبال کہیں گیا ہوا تھا۔

اسی رات میں نے سی آئی ڈی آفس فون کیا۔ میں نے اب تک اس انپکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا جس کے سپرد ضیاء الاسلام کی نگرانی کی تھی۔ مجھے اپنی اس حماقت پر افسوس ہونے لگا ظاہر ہے کہ سی آئی ڈی آفس میں صرف وہی انپکٹر تو نہیں تھا! پھر بھی فون ملنے کے بعد میں نے کہا۔ ”مجھے کسی انپکٹر سے ملو! جو بھی ڈیوٹی پر ہو۔“

”بہتر ہے خاتون! مگر آپ کا نام؟ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”میرا نام عذرا خان ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ہولڈ کیجئے!“

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ دوسری جانب سے کسی شخص نے کہا۔ ”انپکٹر سمیع اللہ فرام سی

کمرے میں داخل ہو کر میں نے ضیاء الاسلام کے چہرے کا جائزہ لیا وہ مجھے کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

’ضیاء الاسلام!‘ میں نے اسے مخاطب کیا۔ یہ بتاؤ کہ آج دوپہر کے بعد جب تم اپنی بہن کے گھر سے نکلے تھے تو تمہیں کوئی ایسا شخص تو دکھائی نہیں دیا تھا جسے تم پہلے سے جانتے ہو؟“

میری بات سن کر وہ چونک اٹھا اور پھر بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ”جی..... جی ہاں مگر آپ..... آپ کو کس طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ.....“

”مجھے کیسے اس بات کا علم ہوا تم اس جھگڑے میں نہ پڑو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے تم سے جو سوال کیا ہے اس کا تفصیل کے ساتھ جواب دو!“ میرا لہجہ حکمی تھا۔

”آپ..... آپ نے کیا..... مجھ سے پوچھا تھا؟“ وہ میرے سخت لہجے سے ہڑبوا گیا۔ مجھے اس پر غصہ تو بہت آیا مگر نظر انداز کر گئی۔ وہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہا تھا۔ ”میں نے پوچھا تھا کہ آج گھر سے نکلنے کے بعد تم جس شخص کو دیکھ کر چونک اٹھے تھے اور تیز تیز قدم بڑھانے لگے تھے وہ کون تھا؟ یقیناً تم اسے اچھی طرح پہچانتے ہو ورنہ اسے دیکھ کر چونک نہ اٹھتے۔“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔

”جی ہاں جانتا ہوں میں اسے!“ ضیاء الاسلام بولا۔ ”میں نے خورشید الاسلام کی سفارش پر اسے ملازم رکھا تھا۔ اس کا نام پرفلو ہے۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے خطرناک آدمی لگا تھا مگر بہ مجبوری میں نے خورشید الاسلام کے کہنے پر اسے اپنی کوٹھی میں رکھ لیا تھا۔“

ضیاء الاسلام نے یہ سن کر میں چونک اٹھی۔ میں نے انسپکٹر کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اسے بھی حوالات سے نکال کر یہاں لے آؤ!“

انسپکٹر میرا حکم سن کر کمرے سے نکل گیا۔ میں اس دوران میں کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ میرے سامنے والی کرسی پر ضیاء الاسلام بیٹھا ہوا تھا۔ اس شخص کو میں نے ضیاء الاسلام کے سامنے اس لیے بلوایا تھا کہ وہ اپنے سامنے ضیاء الاسلام کو دیکھ کر جلد زبان کھول دے۔

کچھ ہی دیر کے بعد انسپکٹر عبدالرشید اس شخص پر فلو کو لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میری توقع کے مطابق وہ ضیاء الاسلام کو وہاں بیٹھے دیکھ کر تقریباً اچھل پڑا تھا۔

”پر فلو!“ میں نے اسے اس کا نام لے کر مخاطب کیا۔ ”اب بتاؤ کیا تم انہیں نہیں جانتے؟“

میں نے ضیاء الاسلام کی طرف اشارہ کیا۔

وہ نظریں چرانے لگا اور میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں ایک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور پھر مزید کچھ کہے بغیر اس کے قریب پہنچ گئی۔ اچانک میں نے اس کے پیٹ پر گھونسا مارا ضرب

تی شدیدی تھی کہ وہ ”اوو“ کر کے بیٹھتا چلا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے۔

ابھی وہ سنبھلے نہیں پایا تھا کہ اس کی پیشانی پر میرے پیر کی ٹھوکر پڑی اور وہ چیخ کر الٹ گیا۔

”بولو پر فلو مزید خاطر مدارت کروں تمہاری!“ میں سخت لہجے میں بولی۔ ”تم میرے سوالوں کا جواب دینے پر آمادہ ہو یا..... میں نے دھمکی آمیز آواز میں اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ ضیاء الاسلام کو نہیں جانتا۔“

”کیا تم لوگوں کو زبان کھلوانا نہیں آتا؟“ میرے لہجے میں کچھ تلخی آ گئی۔

”اس شخص کو خاصا ذرا یاد دھمکایا گیا ہے مگر ابھی اس پر تھرڈ ڈگری استعمال نہیں کی گئی۔ ممکن ہے تھرڈ ڈگری کے استعمال کے بعد وہ زبان کھول دے مگر اس سے پہلے میں آپ کو اطلاع کر دینا چاہتا تھا۔“

”ٹھیک ہے انسپکٹر میں خود آ رہی ہوں۔“ میں بدستور تلخ لہجے میں بولی۔ ”کم از کم اس دوران میں تمہیں اس کی شناخت تو کرنا ہی لینا تھی!“

”شناخت!“ اس کی آواز میں حیرت تھی۔ ”مگر کس سے؟“

”مجھے علم نہیں تھا کہ تم اتنی سامنے کی بات نہیں سمجھ سکو گے! تمہیں نے تو مجھے ابھی بتایا ہے کہ ضیاء الاسلام اس شخص پر نظر پڑتے ہی تیز تیز قدم اٹھانے لگا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ضیاء الاسلام اس شخص کو پہچانتا ہو گا۔“

”جی..... جی ہاں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔“ اس کے لہجے میں خجالت تھی۔

”دراصل بات یہ ہے انسپکٹر کہ کسی بات پر غور کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔“ میری آواز میں جھنجھٹ تھی۔ ”سنو اپنے کسی آدمی کو بھیج کر ضیاء الاسلام کو سی آئی ڈی آفس بلوا لو۔ یہ خیال رہے کہ اسے بحفاظت سی آئی ڈی آفس تک پہنچانا چاہئے۔ اس دوران میں خود میں بھی آ رہی ہوں۔ گرفتار کیے جانے والے شخص سے میرے پہنچنے تک مزید کچھ پوچھ گچھ کر کے اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہی الفاظ کے ساتھ میں نے ریسپورڈر کیڈل پر رکھ دیا۔

اس وقت شام کے پونے چار بج رہے تھے۔ میں کیونکہ دوپہر کا کھانا کھا کر سو گئی تھی اور سوتے سے اٹھ کر ہی انسپکٹر عبدالرشید کا فون ریسپو کیا تھا اس لیے غسل کرنے اور لباس تبدیل کرنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ ہی گیا۔

نیکسی کے ذریعے میں سی آئی ڈی آفس پہنچی تو عبدالرشید کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں ٹھہل رہا تھا۔

”ضیاء الاسلام کو بلوایا تم نے؟ میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی سوال کیا۔

”جی ہاں وہ اندر کمرے میں بیٹھا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم نے اس سے تو پوچھ گچھ نہیں کی کچھ؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں آپ نے منع جو کر دیا تھا!“ وہ فرمانبرداری سے بولا۔

”ضیاء الاسلام کے بارے میں تو میں نے تمہیں کوئی ایسی ہدایت نہیں دی تھی۔ تم بھی عجب شخص آدمی ہو!“ میں نے ناگواری سے کہا۔ پھر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ انسپکٹر عبدالرشید میرے پیچھے پیچھے کسی سعادت مند بچے کی طرح آ رہا تھا۔ بعض لوگ انگلی پکڑ کر چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور خود کوئی قدم اٹھانے کے اہل نہیں ہوتے۔ انسپکٹر عبدالرشید بھی میرے خیال میں ایسے ہی افراد میں سے تھا۔

وہ فرش پر پڑا ہے بسی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پیشانی پر پڑنے والی ضرب کے نتیجے میں اس کی پیشانی پر دائیں جانب ابھار نظر آ رہا تھا۔

”اٹھو!“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے پہلو پر ٹھوکر ماری۔

وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دو چار مزید ہاتھوں میں اس کا دماغ درست ہو گیا۔ اس نے اقرار کر لیا تھا کہ وہ ضیاء الاسلام کو جانتا ہے اور یہ کہ وہ اس کی کوشی کے ملازمین میں شامل تھا۔ اس کے مزید کچھ بتانے سے پہلے میں نے ضیاء الاسلام کو وہاں سے ہٹا دیا۔ میں اسے خوفزدہ کرتا نہیں چاہتی تھی۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ پروفلو اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والا تھا تو پھر وہ گھر سے نکلنا بند کر دیتا۔ فطرتاً وہ مجھے ایک بزدل شخص محسوس ہوا تھا۔

”پروفلو! تم نے یہ تسلیم کر لیا ہے ضیاء الاسلام کو جاننے ہوا اب یہ بھی بتا دو کہ کس کے اشارے پر اسے قتل کرنا چاہتے تھے؟ سنو! میں خود بھی یہ بات جانتی ہوں، لیکن تم سے تصدیق اور اعتراف کرانا چاہتی ہوں۔“

اس کے کس بل میں نے پہلے ہی نکال دیئے تھے اس لیے وہ میرے سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہو گیا۔ توقع کے مطابق اس نے خورشید الاسلام ہی کا نام لیا تھا۔

”تم اس سے کب اور کہاں ملے تھے؟“ میں نے اپنی دانست میں اصل سوال کیا۔ میری اب تک کی پوچھ گچھ کا حامل یہی سوال تھا۔

پروفلو نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ وہ خورشید الاسلام کے ساتھ ہی بوٹوگرام روڈ کے ایک مکان میں قیام پذیر ہے۔ مجھے علم تھا کہ بوٹوگرام روڈ، نواب پور روڈ ہی کے قریب ہے۔ نواب پور روڈ ہی سے ایک سڑک نکلتی ہے جسے بوٹوگرام روڈ کہا جاتا ہے۔ یہاں زیادہ تر متوسط درجے کے لوگ رہتے ہیں۔

”تم تو نارائن گنج میں تھے پھر یہاں کب آئے؟ میں نے سوال کیا۔

جواب میں اس نے بتایا کہ جس رات پولیس ریڈ ہوا تھا اس کی بج خورشید الاسلام اسے لے کر ڈھاکہ آ گیا تھا۔

”وہ رات تم لوگوں نے حویلی کے تہ خانے میں گزاری تھی نا؟“ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق ضروری سمجھی۔

اس نے جواب اثبات میں دیا۔

اسی وقت مجھے سولومن کا خیال آ گیا اور میں نے پوچھا۔ ”کیا اس رات تہ خانے میں تمہارے ساتھ کوئی غیر ملکی بھی تھا؟“

میرے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں ملا۔ مجھے ایک بار پھر یہ انفس ہونے لگا کہ اس رات میں نے حویلی کی تلاشی لیتے ہوئے اس امکان پر غور کیوں نہیں کیا کہ وہاں کوئی اور تہ خانہ بھی ہو سکتا ہے اس رات سولومن بھی میرے ہاتھ آ سکتا تھا۔

”کیا بوٹوگرام روڈ کے اس مکان میں وہ غیر ملکی بھی ٹھہرا ہوا ہے؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

پروفلو نے انکار میں جواب دیا اور پھر کہنے لگا کہ وہ غیر ملکی اس دوران میں بس ایک بار وہاں

آیا تھا۔ پھر میں نے اس سے مکان کا محل وقوع اچھی طرح سمجھ لیا۔ آج ہی میں خورشید الاسلام پر ہاتھ ڈال دینا چاہتی تھی۔ میں نے پروفلو سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ ضیاء الاسلام کو قتل کرنے کے بعد اسے فوری طور پر خورشید الاسلام سے نہیں ملنا تھا۔ خورشید الاسلام رات کے وقت ہی وہاں آتا تھا۔ دن وہ کہاں گزرتا تھا؟ اس سوال کا جواب پروفلو نہ دے سکا۔ جس ریوالور سے وہ ضیاء الاسلام کو قتل کرنے والا تھا اسے خورشید الاسلام ہی نے دیا تھا۔ میں نے اس ریوالور کو بھی دیکھا۔ وہ امریکی ساخت کا تھا۔

”ٹھیک ہے انپکٹر!“ میں نے اسے ریوالور واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے ضیاء الاسلام پر قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں عدالت کے روبرو پیش کر دو!“

پروفلو مجھ سے رحم کی درخواست کرنے لگا، مگر میرے اشارے پر انپکٹر نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ پھر میں نے ضیاء الاسلام کو بلوایا اور انپکٹر سے کہا کہ انہیں بحفاظت ان کی بہن کے گھر بھجوا دو! انپکٹر نے اس کا بندوبست کر دیا۔

ضیاء الاسلام چلا گیا تو انپکٹر مجھ سے کہنے لگا۔ ”آپ نے ضیاء الاسلام کو تو کچھ بتایا نہیں، کیس عدالت میں پیش ہوگا تو اس کا بیان بھی.....“

”معلوم ہے مجھے!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ضروری نہیں کہ اسی وقت اسے سب کچھ بتا دیا جاتا۔ تم بعد میں اسے یہ سب کچھ بتا سکتے ہو۔ فی الحال وہ خوفزدہ ہو جاتا اور پھر گھر سے بھی نہ نکلتا۔ جب تک خورشید الاسلام گرفتار نہیں ہو جاتا ضیاء الاسلام کو کچھ نہیں بتانا اور نہ پروفلو کو عدالت میں پیش کرنا ہے۔“

”اس کا سراغ مل ہی گیا ہے۔ آج رات وہ یقیناً گرفتار ہو جائے گا۔“ انپکٹر بولا۔

”ضروری نہیں انپکٹر کہ وہ آج ہی رات پکڑا جائے۔“ یہ کہہ کر میں کھڑی ہو گئی۔

”کیا آج رات کے ریڈ میں آپ کو میری ضروری پڑے گی؟“ انپکٹر نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں دو سپاہیوں کے ساتھ رات گیارہ بجے تیار ملنا ہے۔“

پھر میں سی آئی ڈی آفس سے ٹیکسی کر کے چنگ گاؤں پہنچ گئی۔ آج شام ہی فرید احمد کو ہسپتال سے چھٹی ملنے والی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے کم از کم مزید دو ہفتے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ اقبال اسی کو لینے گیا تھا۔ میں سی آئی ڈی آفس سے واپس پہنچی تو فرید احمد آچکا تھا۔ میں نے اس کی مزاج پرسی کی باہر کی نظم کے اور بھی لوگ فرید احمد کی عیادت کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ سبھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے درمیان خلوص و محبت دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی، کچھ دیر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

سیوڈو کرجی کی جانب سے مسلسل خاموشی مجھے کھل رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیوں خاموش تھا اور ان دنوں کس چکر میں تھا! ظاہر ہے کہ بھارتی ایجنٹ سادری بھی اسی کے پاس تھی۔ امریکی ایجنٹ سولومن کی بھی کچھ خیر خبر نہیں تھی۔ نارائن گنج سے فرار ہونے کے بعد نہ جانے وہ کہاں روپوش ہو گیا تھا! وہ خورشید الاسلام کے ساتھ نہیں تھا یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا، مگر اس کا نیا ٹھکانا کہاں تھا! اس سے میں بے خبر تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کسی ہوٹل میں بھی قیام کر سکتا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ آج رات خورشید

الاسلام کی گرفتاری کے بعد سولومن کا سراغ بھی مل جائے گا۔ خورشید الاسلام کو یقیناً سولومن کے ٹھکانے کا علم ہوگا۔

اسی روز رات کا کھانا ہم لوگوں نے کچھ دیر سے کھایا۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے بابر اور اقبال نے بھی وقت پر کھانا نہیں کھایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ میرے ہی ساتھ کھانا کھائیں گے۔ فرید احمد کے لیے پرہیزی کھانا پہنچانے کی ذمہ داری بابر کی تنظیم کے ایک رکن نے قبول کر لی تھی۔ اسے وقت پر کھانا دے دیا گیا تھا۔ اب بابر بھی تقریباً صحت یاب ہو چکا تھا۔

رات کو وقت منظرہ پر میں سی آئی ڈی آفس پہنچ گئی اور پھر انسپکٹر اور اس کے دو ماتحتوں کو لے کر بونوگرام روڈ کی طرف ایک پولیس جیب میں روانہ ہو گئی۔

مطلوبہ مکان سے کچھ پہلے ہی میں نے پولیس جیب سڑک کے کنارے رکوا لی۔ پھر انسپکٹر اور اس کے ماتحتوں کو جیب سے اترنے کے لیے کہا۔

”تم لوگوں کو اس وقت تک گھر کے باہر ہی رہنا ہے جب تک میں تمہیں اندر نہ بلاؤں۔“ میں نے انسپکٹر کو ہدایت دی اور آگے بڑھنے لگی۔

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میرے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

مطلوبہ مکان سے ذرا پہلے میں نے پولیس والوں کو روک دیا اور پھر بچوں کے بل مکان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اندر روشنی نظر آ رہی تھی۔ بروفلو سے اس چھوٹے سے گھر کی بابت میں نے تمام تفصیل معلوم کر لی تھی۔ وہ مکان صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ بیرونی کمرے سے باہر نکلنے کا راستہ تھا اور اسی کو بطور نشست گاہ استعمال کیا جاتا تھا۔ میں نے دستک دینے سے پہلے دروازے سے کان لگا دیئے اور اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اندر سے امریکی ایجنٹ سولومن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ غالباً خورشید الاسلام سے ملنے آیا تھا اور اسی سے مخاطب تھا۔ میں تو چھوٹی مچھلی کا شکار کرنے آئی تھی، مگر بڑی مچھلی خود بخود میرے جال میں آ پھنسی تھی۔



عذرا خان کی پراسرار آپ بیتی ابھی جاری ہے۔ بقیہ واقعات کیلئے حصہ چہارم کا مطالعہ کریں۔